رسول اللہ کی اچھوتی اور جامع سے مکمل سیرت جس میں آپ کے سیاسی کارناموں کا ارتقا، ہجرت، غیر مسلم ملکوں سے معاہدات، دوسرے بین الاقوامی مسائل میں نبی اکرمؐ کے فیصلے بھی دیے گئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

رسول اللہ کی سیاسی زندگی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ





نگارشات پبلشرز

www.nigarshatpublishers.com

رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی

سرورِ عالمؐ کی اچھوتی اور سب سے پہلی سیرت جس میں آپ کے سیاسی کارناموں کا ارتقا سمجھایا گیا ہے۔ نیز غیر مسلم مملکتوں سے معاہدات و دیگر بین الاقوامی مسائل میں نبی اکرمؐ کے فیصلے بھی دیئے گئے ہیں اصل مکتوبات نبوی کے چار عکسی فوٹو اور سب سے پہلی اسلامی مملکت کا نقشہ بھی کتاب کی زینت ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ

نگارشات پبلشرز

حبیب ایجوکیشنل سنٹر 38-مین اردو بازار لاہور | 24- مزنگ روڈ، لاہور
فون 5014066 فیکس042-7354205 | فون 7322892 فیکس042-7354205

e-mail:nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com

نام کتاب: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی
مصنف: ڈاکٹر محمد حمید اللہ
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24-مزنگ روڈ لاہور
PH:0092-42-7322892 FAX:7354205
فرسٹ فلور حبیب ایجوکیشنل سنٹر 38۔مین اردو بازار لاہور
PH:0092-42-5014066 FAX:7354205
مطبع: المطبعۃ العربیہ لاہور
کمپوزنگ: سمیر احمد
سال اشاعت: 2008ء
قیمت: =/250 روپے

فہرست



رسولِ اکرمؐ کی سیرت کا مُطالعہ کس لیے کیا جائے؟

اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ.

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا.

نبی اور رسول کا تصور مختلف قوموں، زبانوں میں مختلف ہوگا۔ بہر حال اشرف المخلوقات میں سے بھی اس اشرف ترین مخلوق کا تصور مسلمانوں میں یہ رہا ہے کہ وہ انسان کامل ہے۔ یہ کاملیت ظاہر ہے کہ صرف اچھے انسانی پہلوؤں کے متعلق ہے۔ انسانی زندگی کے دو ہی بڑے شعبے ہیں۔ ایک معاش اور دوسرے معاد۔ دوسرے الفاظ میں ایک تو انسان کے تعلقات انسان اور دیگر مخلوقات کے ساتھ اور دوسرے انسان کے تعلقات اپنے خالق و مالک جل شانہٗ کے ساتھ۔ پہلی قسم میں اعلیٰ ترین مرتبہ حکمرانی ہے تو آخر الذکر میں عقائد وعبادات کے متعلق رہنمائی یعنی پیغمبری۔

رسول عربی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بیک وقت یہ دونوں کمالات حاصل تھے۔ آپ کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کا استقصاء طویل عمل ہے۔ اس جلد میں آپ کی صرف اوّل الذکر یعنی سیاسی زندگی کا مطالعہ پیش نظر ہے۔

لیکن ہر سنجیدہ طالب علم اور ذاتی غور وفکر کر کے ذمہ دارانہ اور مستقل رائے قائم کرنے کے خواہش مند کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسولِ اسلام کی سیرت یعنی سوانح حیات و تعلیمات کا مطالعہ بھی کیوں کیا جائے جب کہ آپ کی وفات پر ساڑھے تیرہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ علوم وفنون میں بے انتہا ترقی ہو چکی ہے۔ متمدن قوموں کے ماحول اور تصورِ حیات میں زمین وآسمان کا فرق ہو چکا ہے۔ اور آپ بھی ہمارے جیسے ہی ایک انسان تھے؟

اصولی حد تک تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ انسانی تمدن وثقافت کی ترقی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" لیکن اس طرح نہیں کہ ادھیڑبُن کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ (كالتى نقضت غزلهامن بعد قوة انكاثا) جاری رکھا جائے، بلکہ اس طرح کہ تعمیر سابق پر جدید کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدیم وجدید دونوں عمارتوں کا مالک متموّل تر ہوگا بہ نسبت اس شخص کے جس کے قبضے میں صرف کوئی ایک قدیم یا جدید عمارت ہو۔ البتہ یہ سوال ایک تفصیلی جواب چاہتا ہے کہ خاص محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب (روحنا فداہ) کی سیرت کا کیوں مطالعہ کیا جائے اور اس غرض کے لیے کسی اور کا کیوں نہیں؟

مسلمانوں کا دعویٰ اپنے رسول وہادی کے متعلق تو یہ ہوگا ہی کہ آپؐ ہی کی ذات والا صفات ہے جس نے ایسے زمانے میں مبعوث ہو کر جب کہ دُنیا جہالت وگمراہی کے انتہائی حدود پر پہنچ چکی تھی۔ اس کو ایک مرتبہ انسانیت صحیحہ کے سیدھے راستے پر کھڑا کر دیا۔ آج بھی جب کہ ہم مختلف وجوہ کی بنا پر ان ایّامِ جاہلیت سے قریب تر ہو رہے ہیں تو صرف اس شمع ہدایت سے اکتساب ہی ہماری نجات کا حقیقی باعث ہو سکتا ہے۔

لیکن ذاتی عقیدے سے قطع نظر، ایک جویائے حق طالب علم اور ایک ناظر فدار لیکن بامقصد مورخ کو اس سوال کے جواب میں جو کہنا ہے اس میں سے بعض باتیں صرف مسلمانوں سے متعلق ہیں، بعض باتیں دوسروں سے متعلق ہیں اور بعض باتیں دونوں سے مشترکہ طور پر متعلق ہیں۔

مسلمانوں کے لیے

آپ کی سیرت جو اہمیت رکھتی ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں اصول فقہ کی کتابوں میں یہ امر مسلّمہ ہے کہ آنحضرت کے ہر قول کی طرح آپ کا ہر فعل بھی قانونی حیثیت رکھتا ہے اور سنتِ نبوی سے بھی واجبات، مستحبات، مباحات مکروہات وغیرہ قائم ہوتے ہیں۔ یوں تو کسی مسلمان کی زندگی اسی وقت اسلامی کہلاتی ہے جب وہ قرآن مجید کے احکام کے مطابق ہو۔ لیکن خود قرآن کریم نے متعدد موقعوں پر سنتِ نبوی کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اُسے واجب التعمیل قرار دیا ہے۔ اس سے سنتِ نبوی یا صحیح ومسلّمہ سیرت کی حیثیت بھی جزوِ قرآن نہیں تو کم از کم ضمیمۂ قرآن اور تتمۂ قرآن کی سی ہو جاتی ہے۔ ایسی چند آیتوں کی طرف یہاں توجہ منعطف کرائی جاتی ہے۔

"جو آنحضرت تم کو دیں وہ لے لو اور جس سے روکیں اس سے رُک جاؤ۔"

"آں حضرت تمہارے لیے بہترین نمونۂ عمل ہیں۔"

"آں حضرت اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ خدا ہی کے ارشاد پر مبنی ہوتا ہے۔"

اِن اور دیگر آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ پیشوائے اعظم سردار دو عالم کا قول، آپ کا فعل اور جن چیزوں کو آپؐ نے اپنے صحابہ میں روا و برقرار رکھا اُن سب پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود احکام قرآنی۔

غیر مسلموں کے لیے

رسول عربی کی سیرت کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ جب ایک شخص ہم سے یہ بیان کرے کہ میں تمہارے فائدے کی کچھ بات کہنا چاہتا ہوں، تو کون عقل سلیم رکھنے والا ایسا ہے جو اس بات کو سُننے سے انکار کر دے۔ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں جب پہلی مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ میں تمام عالموں کے لیے رحمت بن کر آیا ہوں، اور میرے لائے ہوئے دین اسلام کے بغیر دنیا اور آخرت کی بھلائی حقیقت میں حاصل نہیں ہو سکتی تو اس پر اوچھی طبیعت رکھنے والوں نے تو ٹھٹھول شروع کیا اور مخالفت پر اُتر آئے۔ سنجیدہ لوگوں نے اس کے

برخلاف یہ پوچھا کہ دین اسلام کس کو کہتے ہیں، اور آپ کی رائے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے پھر جواب اور توضیح پر ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ اور جس کی رائے میں بات معقول تھی اُس نے اس دین کو قبول کر لیا۔ ہادیٔ عالم کے اقوال و افعال اور آپ کا پیش کیا ہوا دین اب تک محفوظ و موجود ہیں، اور محض آثار قدیمہ کی رتی سے ہاتھی بنانے اور قیاس آرائی و خوش عقیدگی کی ضرورت نہیں۔

اس کی کچھ تشریح بے محل نہ ہوگی۔ اور دیگر ادیان و مذاہب کی مقدس والہامی کتابوں میں سے گوتم بدھ کے صرف اقوال ملتے ہیں کوئی کتاب نہیں اور یہ اقوال بھی بروقت قلمبند نہیں ہوئے تھے۔ ہندو مذہب میں پُران، سمرتی، ویدکی چیزیں ہیں۔ لیکن یہ سب ہزاروں برس صرف سینہ بسینہ چلتی رہیں۔ آخر تدوین ہوئی بھی تو ایک ہی شخص کے حافظہ کی بنا پر۔ توریت کی اصل بھی ناپید ہے۔ اس سے زیادہ مرتبہ وہ دنیا سے ناپید ہوگئی۔ اور محض حافظوں سے اس کو دوبارہ لکھا گیا ہے۔ اور اب جو نسخے ملتے ہیں ان میں باہم ہزاروں الفاظ و آیات کے متعلق اختلاف روایات پایا جاتا ہے۔ اس میں کی بہت سی چیزیں لاپتہ ہیں۔ بہت سے اجزاء کے متعلق صاف نظر آتا ہے کہ وہ بعد کے اضافے ہیں۔ (مثلاً حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب کتاب میں خود اُن کے وفات پانے کا ذکر وغیرہ) انجیل کا حال یہ ہے کہ اس کو حضرت عیسیٰؑ نے کبھی نہیں لکھوایا۔ (اگر لکھوایا ہے تو وہ اصل انجیل اب لاپتہ ہے) جو چیز اب ملتی ہے وہ اُن کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا چشم دید و گوش شنید بیان ہے کہ اُن کے پیغمبر اس طرح پیدا ہوئے، زندگی بھر فلاں طرح رہے، فلاں وقت فلاں بات کی وغیرہ۔ گویا یہ سوانح عمری ہے کہ کوئی الہامی کتاب اور ربانی ہدایت نامہ نہیں۔ ایک مزید بات یہ قابل ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ایسی سوانح عمریاں انجیلیں بھی بکثرت تھیں۔ اور لازماً ان میں بڑا اختلاف بھی تھا۔ ایک مرتبہ ان سب کو ایک کے اوپر ایک رکھ کر ہلایا گیا اور جو گر پڑیں وہ الگ اور جو نہ گریں وہ الگ کر لی گئیں، اور اس طرح آج کل کی مروجہ چاروں انجیلیں صحیح قرار پا کر اختیار کر لی گئیں، اور باقی تلف کر دی گئیں۔

اب قرآن مجید کو دیکھئے، جیسے ہی کوئی آیت نازل ہوتی، ابتدائے نبوت ہی سے رسول اکرمؐ اس کو فوراً لکھوا دیتے رہے، اور کاتبوں کو یہ بھی ہدایت کرتے تھے کہ فلاں آیت کا

مقام تا حال نازل شدہ قرآن میں فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد ہے۔ اس کو ساتھ ساتھ بہت سے صحابہ زبانی بھی نماز کی ضرورتوں سے یاد کرتے جاتے تھے۔ اور یاد کی ہوئی چیزوں کو رسول اکرمؐ کو سنایا بھی کرتے تھے۔ لوگ تحریری نقلیں بھی لے لیا کرتے تھے۔ جب آنحضرتؐ کی وفات ہوئی تو چند ماہ بعد ہی خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عہد نبوی کے سرکاری کاتبین وحی کی ایک کمیٹی مقرر کی کہ پورا قرآن مجید ایک کتاب کی صورت میں لکھا جائے، اور ہدایت دی کہ ہر ہر لفظ و آیت کو علاوہ حفظ کے دو دو تحریری ثبوتوں کے بعد درج کیا جائے۔ عہد نبوی کے آخر میں کامل قرآن کے کم سے کم چار پانچ سو حافظ تھے، جن میں ارکان مجلس تدوین بھی شامل تھے، اور متفرق سورے جن کو یاد تھے ان کی تعداد ہزاروں تھی۔ اس احتیاط سے تدوین ہونے اور پھر آئندہ بھی حفاظ کا سلسلہ ابتک جاری رہنے سے قرآن مجید اس قدر صحت کے ساتھ ابتک محفوظ ہے کہ کسی اور بانی مذہب کی الہامی کتاب اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔

غرض ہم ایک ایسی شخصیت کا مطالعہ کر سکتے ہیں جس کے عام حالات بھی تفصیل سے محفوظ ہیں اور جس کی تعلیم کی اساس یعنی اس پر نازل شدہ الہامی کتاب بھی ہو بہو بجنسہٖ محفوظ و موجود ہے، اس کے مندرجات کے متعلق کوئی چھوت چھات بھی نہیں کہ اجنبیوں کو پڑھنے بلکہ سننے سے بھی روکا جائے۔ بلکہ صلائے عام ہے کہ ہر شخص اس کو پڑھے۔ اور بطور خود اپنے لیے فیصلہ کرلے کہ وہ اس کو قبول کر سکتا ہے یا نہیں۔ اور جو قبول نہ کرے اس کے لیے بھی صاف حکم ہے کہ "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" (دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں) اور پھر یہ قرآن وہ ہے جو فصاحت میں ہومر اور ڈیما سیتھنس کے، قانون سازی جسٹی نین کے، فی الدنیا حسنۃ میں کاوٹلیا کے، فی الآخرۃ حسنۃ میں گوتم بدھ کے، ادب احترام سلف میں کنفوشس، کے چیلنج کا جواب تھا۔ اور اس کا اپنا یہ چیلنج ہے کہ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری، اس نے مرکز گریز اولاد آدم وحوا کو دوبارہ مرکز کشی کی تعلیم دی۔ اور ان میں فطری مساوات اور اختیاری فضیلت (اعمال صالح کی بنا پر) قائم کی اور جملہ سابقہ مذاہب کا احترام واعتراف کرتے ہوئے ان کے مقابل اپنی حیثیت صرف یہ بیان کی کہ یہ ایک تجدید مصدقت اور بنیادی ولابد واقل قلیل مذہب ہے۔

ہر کسی کے لیے چند بنیادی اصول وحقائق سے خود فیصلہ کر لینا ممکن ہے۔

اسلام کا اصل اصول یہ ہے کہ فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (یعنی دُنیا میں بھی اچھے رہیں اور آخرت میں بھی) دیکھنا یہ ہے کہ دنیوی معاملات میں آنحضرتؐ کی سیرت اور طرزِ زندگی میں ہمارے لیے کیا سبق ہیں۔

دنیا میں یک حیثیتی بڑے لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی ہے۔ لیکن اگر ہم مثلاً سکندر اعظم اور نپولین و ہٹلر کو لیں تو ان کی زندگی صرف ایک سپہ سالارِ جنگ اور فاتح کے لیے مفید مواد مطالعے کے لیے پیش کر سکتی ہے۔ گوتم بدھ کی زندگی ریاضت وعبادت میں خصوصی دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہی سبق آموز ہو سکتی ہے۔ ہومر صرف ایک شاعر تھا۔ افلاطون وارسطو صرف حکیم وفلسفی تھے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی کوئی بڑی وقعت نہیں۔ اس کے برخلاف رسولِ عربیؐ کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ اُس کی ہمہ جہاتی حیثیت، قول وفعل کی یکسانی تعلیم میں ناقابلِ عمل مطمحیت کی جگہ معتدل عملیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی ہی میں کامیابی کے لحاظ سے ایک بے نظیر چیز ہے۔ سیاسی حیثیت کو لیجیے تو آپ نے دس سال کے قلیل عرصے میں جزیرہ نمائے عرب کے نراج (لاحکومتی) میں جہاں زیادہ خود سرخانہ بدوش قبائل میں خانہ جنگیاں ہی رہا کرتی تھیں، ایک بڑی مستحکم اور بڑی مملکت قائم کر دی۔ بہ حیثیت سپہ سالار کے آپ کی لڑائیوں میں فریقین کے بمشکل چند سو آدمی مارے گئے۔ لیکن دس سال کے عرصے میں تقریباً بارہ لاکھ مربع میل کا رقبہ مطیع اور ماتحت ہو گیا۔ اور عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسی حکومت قائم ہوئی جو پورے جزیرہ نما کو حلقہ بگوش بنا سکی۔ اور یہ آنحضرتؐ ہی کی تعلیم اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ عرب جیسی گم نام اور جاہل قوم نے بین الممالک تعلقات میں پہلا قدم رکھا تو کیمرج کے ایک عیسائی مورخ کے الفاظ میں اُن سے زیادہ "مہذب وحشی" کبھی فتوحات کے لیے نہیں نکلے تھے۔ اور فتوحات کی وسعت اور گہرائی کا جو ریکارڈ انہوں نے قائم کیا ہے وہ ابتک کسی قوم سے توڑا نہیں جا سکا ہے، چنانچہ دس ہی سال میں انہوں نے عراق، ایران، فلسطین، شام، مصر، طرابلس تونس، ترکستان اور آرمینیا کو زیر کر لیا۔ یہ سب علاقے قریب قریب آج بھی ٹھوس اسلامی علاقے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کی زبان تک عربی ہی ہو گئی ہے۔

انتظامی حیثیت لیجیے جس ملک میں کبھی کوئی حکومت قائم ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس میں پیدا ہونے اور پرورش پانے کے باوجود آنحضرتؐ نے جو دستورِ مملکت مرتب اور جو نظامِ حکمرانی قائم فرمایا اس پر عمل دنیا کی ایک عظیم الشان مملکت کے لیے نہ صرف ہر طرح کار آمد و کافی ثابت ہوا۔ بلکہ جب تک اس پر عمل رہا وہ دنیا کی مہذب ترین حکومت بنی رہی۔ گاندھی جیسے کٹر ہندو بھی اُسے انسانیت کا دورِ زریں سمجھتے اور کانگریسی ہندو حکومتوں کو مشورہ دیتے رہے کہ اسی کو اپنے لئے نمونہ بنائیں۔

عمرانی حیثیت سے تقسیم وگردشِ دولت کا اصول رسولِ اکرمؐ کے ہر مالی حکم میں نظر آتا ہے۔ تقسیم ترکہ، تحدید وصیت، ممانعتِ سُود، پس انداز دولت اور جائیداد پر محصُول (زکوٰۃ) وغیرہ کی طرف اشارہ کافی ہے، جن کا اصول یہ تھا کہ دولت صرف مالداروں میں نہ گھومتی رہے۔ اور مال والوں سے لئے ہوئے محصُول سے حکومت اپنے ملک کے جُملہ محتاجوں کو روٹی مہیا کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھے اور اشتراکیت وسرمایہ داری کے تصادم کو (جو آج بے دین دُنیا میں رُونما ہے) پیش بینی کر کے شروع ہی میں حل کر دیا اور روک دیا۔

عورت، مزدور، اور غلام کی حیثیت کے متعلق بھی پیغمبر اسلام کی تعلیم معتدل اور اسی لئے مفید وقابلِ عمل ہونے میں بے مثل ہے۔

سماجی اور اخلاقی حیثیت سے آپؐ نہ صرف اچھے معلمِ اخلاق تھے، بلکہ ایک نادر بات یہ تھی کہ آپ اپنی تعلیم کی سب سے پہلے خود تعمیل کر کے اور دوسروں کو جتنا حکم دیتے اس سے زیادہ خود عمل کر کے اوروں کے سامنے زندہ نمونہ پیش فرماتے تھے۔ ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست اور حاکم ایک تاجر ایک انسان کی حیثیت سے آپ کا کردار اتنا بے داغ ہے کہ دشمن بھی اس کو سراہنے کے بغیر چارہ نہیں دیکھتے۔ علاوہ اور اسلامی اصلاحات کے بُت پرستی، شراب اور جوئے، سٹے کی ممانعت مسلمانوں کی ایسی خصوصیت ہے کہ باقی دنیا بھی اب خواہی نہ خواہی اس کو ماننے پر مجبور سی ہو چلی ہے۔

دنیا میں بہت سے معلم، ہادی اور پیغمبر آئے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کسی کو اپنی زندگی میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جو نبی عربیؐ کو ہوئی۔ ۱۰ھ میں جب آپ حج کو تشریف لے گئے تو آپ کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ مسلمان تھے، جو ملک کے ہر حصے سے آئے تھے۔ آنحضرتؐ نے دنیا میں جو دین پیش فرمایا اس نے اپنے لئے خود بخود جگہ پیدا کر لی۔ چین میں کبھی اسلامی اس

حکومت قائم نہیں ہوئی۔ مگر چین کے کروڑوں مسلمان اور ہندوستان کے روز افزوں نومسلم اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ اسلام کی اندرونی کشش گتنی ہے۔ وہ آپؐ ہی تھے کہ تعصبات سے بھری دنیا میں برملا فرما گئے کہ نسل، رنگ یا زبان سے انسان کو دوسرے پر کوئی فوقیت بالکل نہیں۔ حقیقی فضیلت نکوکاری اور خداترسی ہے۔ (خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ جو سب سے زیادہ متقی ہو) آپؐ نے اسلام کے اصول پر جس زور سے عمل کرایا اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام پست قومیں اسی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتی رہی ہیں۔ اسلام سے زیادہ مساوات کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتی اور مثلاً رنگ و زبان کے متعلق فطرت کی تنوع پسندی کو بے اثر بنانے میں اسلام سے زیادہ کسی مذہب و مسلک کو کامیابی نہیں ہوئی۔

انسانی آبادی کے ہر گروہ کی اپنی الگ تاریخ، الگ تعصبات، الگ روایات ہیں۔ اور انسان کو اپنے محسنوں یا بزرگوں کے احترام سے روکنا نہ تو آسان ہے اور نہ ہی اس میں کوئی فائدہ۔ آسان اور مفید طریقہ یہی ہے کہ پرانی روایات اور تعصبات و تخیلات کو چھیڑے بغیر (اگرچہ اس کو ایک نیا پس منظر، ایک نئے رخ میں رواں دواں کر کے) کچھ نئی چیزوں کے احترام اور، اوروں سے زیادہ احترام کی تعلیم دی جائے، اس کے بغیر مرکز گریز اولاد آدم و حوا کو دوبارہ ایک مرکز پر آنے کے لیے آمادہ کرنا ممکن نہیں۔

یہودیوں کو اپنے ہمعصروں میں واحد موحد قوم ہونے وغیرہ کی بنا پر ناز تھا۔ اگرچہ باقی دنیا میں وہ ملعون تھے۔ اسلام نے برملا اعتراف کیا کہ (خدا نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی) عیسائیوں کو اپنے آبائی مذہب کی بعض خصوصیتوں پر ناز تھا۔ جس سے باقی ساری دنیا کو انکار تھا۔ قرآن نے اس کو بھی قبول کیا کہ عیسے بن مریم (وہ اللہ کے رسول، کلمتہ اللہ اور روح اللہ تھے) لیکن ان دونوں قوموں کو بتایا کہ محض پدرم سلطان بود کافی نہیں عمل کے متعلق خدا کا حساب و کتاب فرداً فرداً ہر ایک انسان سے ہوگا۔ جس خدا نے موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو کچھ خصوصیتوں سے نوازا، اسی خدا نے ان سابقہ انبیاء کی تعلیمات کے صحیفوں کے حوادث زمانہ کا شکار ہو کر تلف ہو جانے کی وجہ، اپنی وفور نوازش سے انسانوں پر اُن تعلیموں کی پھر سے تلقین و تجدید کرنے کے لیے ایک نبی بھیجا۔ اور جب تک اس نبی کی تعلیم محفوظ و موجود ہے۔ کسی مزید نبی کی ظاہر ہے کہ کوئی ضرورت نہیں۔

انبیاء بنی اسرائیل ہی نہیں، اُن سے قبل اور ان کے بعد کے بھی وان من امة الا خلا فیھا نذیر، کہہ کر دنیا کی ہر قوم کا دل موہ لیا۔ آدمؑ سے لے کر عیسیٰؑ تک آنے والے رسولوں میں سے ایک دو درجن کا نام بھی لیا اور یہ بھی فرمایا دیا کہ ورسلاً قد قصصنا ھم علیک من قبل ورسلا لم نقصصھم علیک (۴/۹۳) اور کسی کے لیے رنجش کی وجہ نہ رہی اس حیثیت سے بھی آپ رحمتہ للعالمین ثابت ہوئے۔

مذہب سابق میں ایک گورکھ دھندہ بن کر عبادت گاہوں کے افسروں پجاریوں کی اجارہ داری بن گیا تھا۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ نہیں الدین یسر وہ ہر ایک فرد انسانی کا معاملہ ہے اور ایک بنیادی مذہب، ایک خلاصہ اور نچوڑ پیش کیا کہ انسان مہد یا کم از کم سن رشد سے لحد تک اپنے آپ اس کا ذمہ دار ہے۔ اور وہ مذہب (اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور عمل صالح کرتا رہے) (ہر شخص پر اس کی استطاعت کے مطابق ہی ذمہ داری ہے)

یہ سب ایک طرح سے دینوی پہلو تھا۔ اسلام کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ دنیا و دین دونوں کی بیک وقت بھلائی چاہتا ہے۔ روحانی ترقی اور تزکیہ نفس کے لیے توحید سے بڑھ کر کوئی وسیلہ تصور میں نہیں آتا۔ اگر کوئی شخص خدا کو ایک مان لے اور خیر و شر میں اس کے سوا کسی اور کی قدرت نہ سمجھے اور حشر و حساب کو مان لے تو پھر اس دنیا میں گناہ کا سرزد ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کے ایمان کی پختگی اس کے اعمال میں ہویدا رہتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد فی سبیل اللہ ایسے احکام ہیں جن سے انسان فرشتوں سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔ جس میں عدول حکمی کی صلاحیت ہی نہ ہو (مثلاً فرشتہ) اور وہ کسی کل کی طرح بے اختیار حرکت کرتا چلا جائے، تو نہ وہ ثواب کا مستحق اور نہ عذاب کا مستوجب۔ جس میں خیر و شر کی بہ یک وقت قدرت ہو اور وہ اپنی قوت ارادی و اختیار سے کام لے کر صرف خیر پر عمل کرے تو یقیناً اشرف المخلوقات کہلانے کا اسی کو حق ہو سکتا ہے۔

یہی چیزیں نتیجہ ہیں سیرت پاک کے مطالعے کا، اور یہی چیزیں ہیں جو سیرت پاک کے مطالعے کی دعوت دیتی ہیں۔

مواد اور ماخذ

مختلف اشخاص کی سوانح عمریاں مختلف قسم کے ماخذوں اور مواد کی مدد سے مرتب ہوتی ہیں۔ مواد کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم، بعض وقت تو کسی زبان کی کوئی کہاوت، کوئی ضرب المثل یا کوئی تلمیح ہی اپنے ہیرو کے متعلق معلومات کا واحد ذریعہ ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی بادشاہ ہو، کوئی ممتاز سیاسی شخصیت ہو، کوئی کاریگر یا پیشہ ور ہو، کوئی عامی فلسفی ہو، کوئی شاعر و ادیب ہو، کوئی درویش و صوفی ہو، کوئی نیک شخص ہو، کوئی بد شخص ہو، عقل مند ہو، بے وقوف یا سادہ لوح ہو، غرض ہر ایک قسم کی شخصیت الگ الگ نہج سے کام کرنے پر مجبور کرے گی۔ اگر کسی معمار کی سوانح عمری کا تکملہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ اس کی بنائی ہوئی عمارت کی فنکارانہ اور معاشی و دیگر حیثیتوں سے جانچ کی جائے تو کسی قائد و مصلح کی قیادت میں یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کے اثرات کتنے گہرے، کتنے دیرپا کتنے وسیع ہوئے۔ اور اگر کوئی بہت سی حیثیتوں کا جامع رہا ہو تو سوانح نگار کا کام بھی پھیل جاتا ہے۔ پھر ولادت سے لے کر وفات تک جسمانی حیثیت سے کیسے گزری، دماغی ارتقا کیا ہوا، گھریلو زندگی، پبلک زندگی، احباب سے برتاؤ، دشمن سے سلوک، اور اس کے متعلق اس کے اپنے خیالات، نیز غیروں کے تاثرات بھی دلچسپ دریافت کا سامان ہیں۔

کسی پیغمبر کی حیات طیبہ کا کام جہاں باعث سعادت ہے وہیں مشکلات سے لبریز بھی ہے۔ وہاں مادی اور عام مسائل سے بھی سابقہ ہوتا ہے۔ اور وحی و معجزات سے بھی۔

دنیا میں کسی پیغمبر ہی نہیں، کسی بھی انسان کے حالات اتنے گوناگوں نہیں ہونگے جتنے رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے۔ سیرت پاک کے مواد اور ماخذوں کا سرسری

اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ کے اپنے اقوال و احکام (۲۳) سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جس مقدار میں زبان سے نکلے اُن کا مختصر و محدود حصہ جو محفوظ رہا اور ہم تک پہنچا ہے وہ بھی ہزاروں ہی نہیں لاکھوں حدیثوں کی صورت رکھتا ہے۔ اگر آپ کے افعال اور آپ کی اپنوں میں روا رکھی ہوئی چیزیں بھی لے لی جائیں تو سنت کا یہ مجموعہ بیسیوں مجلدات میں آتا ہے۔

کسی شخص سے ملنے والے سینکڑوں چیزیں بیان کر سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صرف عقیدت مند ہی ۱۰ھ کے موقع پر لاکھ ڈیڑھ لاکھ تھے اس سال حج کو نہ آئے ہوئے خانہ نشینوں کی تعداد یقیناً اس سے کئی گنا زائد ہوگی۔ ماہرین حدیث نے لکھا ہے کہ صحابہ کا وہ حصہ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق کوئی نہ کوئی حدیث مروی ہے ایک لاکھ سے زائد تعداد رکھتا ہے۔ دنیا کی کسی شخصیت کے حالات کے شاہدان عینی اتنے کیا اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ملیں گے۔ آنحضرتؐ سے ملنے والوں میں آپ کے بزرگ یا خورد، رشتہ دار ہیں، گھر والے ہیں، ملازم ہیں، دوست ہیں، اتفاقی ملاقاتی ہیں۔

آپ کی ۶۳ سالہ واقعات سے پُر زندگی میں نہ معلوم کتنے خطوط آپ کو لکھنے پڑے ڈھائی تین سو تو تاریخ نے عہد نبوت کے متعلق اب بھی محفوظ کئے ہیں۔ صرف انھیں کو لیجئے تو کب لکھا، کیوں لکھا، لکھنے کا نتیجہ کیا ہوا، وغیرہ کئی ضخیم جلدوں کا طالب ہوگا۔

معلومات کا ایک اور اہم ماخذ ہمعصر شعراء کا کلام ہے۔ اُن کے اشعار کے اشاروں کی توضیح و تشریح، شاعر کی پرکھ، قوت فیصلہ اور قوت اظہار اور دیگر بہت سے امور اس سلسلے میں لحاظ میں آتے ہیں۔

بیرونی لوگوں کے ہمعصر سفرنامے ہیں بیرون میں آپ کے حالات کی جو اطلاع پہنچی اُس کے بیرونی مؤرخوں کے ہاں تذکرے بھی ہیں۔

پھر آپ کی دی ہوئی اور پیش کی ہوئی تعلیم ہے۔ اس مشن کا مقصد، اس کی تکمیل کے لیے اختیار کی ہوئی تدبیریں، ان وسائل و تدابیر کا اثر و نتیجہ اور اثرات کا استحکام و دیرپائی نیز اُن اثرات کی رفتہ/ رفتہ ترمیم و تبدیل و تجدید کے وجود و اسباب سے بحث کی ضرورت ہوگی۔ اور چونکہ کسی ایک زمانے کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے اور انسانیت ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے آغاز عہد رسالت میں جس درجے پر پہنچ چکی تھی، اس کو بھی

شامل کرلیں۔ اور کام پھیلا کر جامع بنانا چاہیں تو ایک طرح سے ایک ذات قدسی صفات کی زندگی کے لیے ابتدائے آفرینش سے نفخ صور تک کی انسانیت کی تاریخ پر تبصرہ کرنا پڑے گا خاص کر اس شخصیت کے متعلق جس کی نسبت عقیدہ ہے کہ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ۔

کسی شخص کے بہت سے کارناموں کی صحیح اہمیت کے لیے کمیت کی جگہ کیفیت دیکھنی پڑتی ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں سب کے اعداد ملا کر کہتے ہیں کہ ایک کروڑ آدمی مارے گئے۔ اور ۱۹۳۹ء کی جنگ میں چار کروڑ۔ مگر تاریخ عالم میں اُن کی وہ اہمیت نہیں جو جنگ بدر کی ہے۔ جس میں فریقین کے مجموعی طور سے مارے جانے والوں کی تعداد سو بھی نہیں ہے۔ اسی طرح کسی ارب پتی راک فیلر کا ایک کروڑ روپیہ خیرات کر دینا یا مرتے وقت وصیت کرنا کردار کی وہ عظمت نہیں رکھتا جو چند سو روپے کا چندہ دینے والے کا جس سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اس چندے کے بعد گھر میں کیا رکھ چھوڑا ہے تو جواب ملا تھا۔ کہ "بس صرف اللہ اور اس کے رسول کی محبت" مزید برآں بہت سے واقعات اس وقت تک پوری طرح یا تو سمجھے ہی نہیں جاسکتے یا اُن کی صحیح قدر و قیمت نہیں معلوم ہوسکتی جب تک اُن واقعات کے پیش آنے کے مقام کا جغرافیہ معاشی و سیاسی حالت وہاں والوں اور اس واقعے میں حصہ لینے والوں کی نفسیاتی کیفیت، اس مقام کے ماحول اور ہمسائے کی داخلی اور اثر انداز حالتیں اور دیگر بہت سے امور کا مطالعہ نہ کیا جائے اور اوروں کے حالات سے مقابلہ بھی ایک مزید پہلو ہے۔

لکھنے والے کی عقیدت، اہلیت، سہولت، حالات کی مساعدت، وسائل کی فراہمی وغیرہ کا بھی خیال کیا جاتا ہے۔

ایک ہی واقعے سے مختلف ذہن، مختلف نتائج کا استنباط کرتے ہیں۔ سیرت نبویہ اس وقت دنیا کی ہر مہذب زبان میں ملتی ہے۔ اور بعض زبانوں میں ہزاروں کتابیں اس ایک موضوع پر ملتی ہیں۔ اگر مکررات کو حذف بھی کر دیں تو بھی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی خاص پہلو اہمیت رکھتا ہے۔ صرف آپ کی جنگوں ہی کو لیجئے کوئی ان کا ذکر کہانیوں کے طور پر کرتا ہے۔ کوئی فن حرب کی تاریخ میں جگہ دینے کے لیے بیان کرتا ہے۔ کوئی قانون بین الممالک کے قواعد جنگ کی نظیروں کے لیے اُن کا مطالعہ کرتا ہے۔ کوئی عربی سپاہی کی نفسیات، قوت برداشت، بہادری موقع محل سے استفادے کی اہلیت وغیرہ کا مواد اُن میں تلاش کرتا ہے۔

جس مقام پر کوئی شخص زندگی گزار چکا ہو، وہاں عرصہ دراز تک اس کے متعلق تاثرات، کہانیاں اور کہاوتیں پائی جاتی ہیں۔ جن میں حذف اور اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

اتنی قسم کی اور اتنی کثیر چیزوں کی موجودگی میں سوانح نگار کیا کرے؟ ان ہزاروں پہلوؤں میں سے ایک آدھ پر اکتفا کئے بغیر چارہ نہیں۔ اگر اس میں بھی کچھ کامیابی ہو جائے یعنی کسی کو اس میں کچھ کام کی چیز ملے تو فبہا۔ ورنہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ اپنے ذاتی استفادے ہی کے لیے ہے اور بس!

بعثت نبوی کے وقت دُنیا کی حالت

دنیا میں بُرائی اور گناہ کوفنِ لطیف بنا دینے والے بھی اور قوم کی حالت پر کُڑھنے اور دردمند دل رکھنے والے بھی ہر جگہ اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ برائی اور اخلاقی پستی جتنے بڑے طبقے میں پھیلتی اور شدت اختیار کرتی ہے اتنے ہی بڑے کردار کے مصلح کی ضرورت ہوتی ہے۔ انبیائے سلف کے زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک قوم، کسی ایک بستی میں بُرائی کو بھلائی سمجھنے لگنا عام ہوتا تھا۔ اور باقی دنیا ایک حد تک گوارا کرنے کے قابل کردار رکھتی تھی۔ اور نبی بھی خاص مقام کے لیے روانہ کئے گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عہد نبوی کے آغاز پر دُنیا کے کس کس ملک میں مصلح کی ضرورت تھی۔ ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہونے کے باوجود روز افزوں پھیلنے والی نسل انسانی قدیم زمانے میں ذرائع معیشت کی ضرورتوں سے جب اپنوں سے بچھڑتی اور رشتہ داروں سے دور دوسری جگہ جابستی تو پھر اپنے مرکز سے تعلق رکھنے کی ضرورت یا موقع کم ہی پیش آتا تھا۔ ایک تو ذرائع حمل ونقل کی کمی تھی۔ دوسرے ہر مقام اپنی ضرورتوں کے لیے جو زیادہ تر غذا، لباس وغیرہ پر مشتمل ہوتیں، خود اکتفا ہوتا۔ یہ نہ تھا کہ آج کل کی طرح ہر کوئی اپنی کسی نہ کسی ضرورت کے لیے دوسروں کا محتاج ہو، کہیں غلہ نہ ہو، کہیں روئی نہ ہو، کہیں لوہا، کہیں کوئلہ یا پٹرول نہ ہو، کہیں کاغذ کا مواد نہ ہو۔ اس کا نتیجہ تھا کہ قدیم زمانے میں بین الاقوام اور بین الممالک تعلقات ناپید سے تھے۔ ناگزیر نبی اور مصلح بھی قومی ہوتے تھے۔ (عالمگیر اور بین الاقوامی نہیں) اور ان کی تعلیم کسی بربری، کسی غیر بنی اسرائیل، کسی غیر آریہ سے متعلق ہی نہ ہوتی تھی۔ انسانیت میں بین الاقوامی احتیاج رفتہ رفتہ ہی پیدا ہوئی۔ اور عہد نبوی کے آغاز پر اس کا عبوری دور اس حد تک گزر چکا تھا کہ مہمات پسند

عرب تاجر ایک طرف حبش ومصر وشام کو تو دوسری طرف چین وایران وہند کو کارواں لے جایا کرنے لگے تھے۔ بڑے بڑے جہاز بنانا اور زمین کے قلابے ملانا انسان سیکھ چکا تھا۔ ناگزیر اب نبی بھی مختص المکان، اور مختص الزمان ہونے کی جگہ ایسا ہونا ضروری تھا جو معتدل اور مستقل تعلیم دے۔ سرد ممالک ہوں یا گرم، شہری باشندے ہوں کہ خانہ بدوش، سب کو ایک مرکز سے دوبارہ جوڑنا اور سب کے لیے بنیادی مذہب لانا ممکن ہو۔ تعلیم میں مستحب اور نفل کی تھوڑی سی لچک ضرور ہے۔ لیکن اقل قلیل فرائض بنیادی مذہب کا کام دے سکیں، اور وہ سب ہی کے لیے یکساں ہوں۔ یونان کسی زمانے میں حکمت اور فصاحت کے دریا بہا چکا تھا۔ دنیا کو اس کی ذہنی غلامی سے نجات دلانے کے لیے حکمت اور فصاحت کے ایک بہتر اور بلند تر نمونے کی ضرورت تھی۔ روما نے قانون سازی میں کمال پیدا کیا تھا۔ اور رسول عربی کی ولادت سے پانچ ہی سال پہلے مرنے والے شہنشاہ جسٹی نین نے رومی قوانین کی تدوین کا کارنامہ انجام دلا کر دنیا کو ایک چیلنج دے دیا تھا کہ اس سے بہتر قانون لاؤ۔ اسی طرح ہندوں نے کچھ، مصریوں نے کچھ، ایرانیوں نے کچھ، ایسے کارنامے چھوڑے تھے جن سے خاص خاص شعبوں میں انسانی ذہنیت پر اُن کی برتری مسلّم ہو چکی تھی۔ اور ضرورت تھی کہ انسانی ذہن کی صحت مند بالیدگی کے لیے ان کھلنے والے مواقع کو دُور کر دیا جائے۔ اور انسان کو عقل، فکر، نظر، بصر، سمع، تفقہ، تدبر، شعور، علم وغیرہ سے خود کام لینے پر آمادہ کیا جائے۔ ان عطایائے فطری کو معطل کر لینا اسے انفرادی جواب دہی سزا وجزاء سے بھی علیحدہ کر لینا فی الحقیقت اطاعت شعار فرشتوں اور سرکش شیطانوں سے الگ ایک احسن تقویم والی مخلوق کے پیدا کرنے کی غرض کو فوت کر دینا ہے۔ ان تمہیدی نکات کے ساتھ دنیا کے بڑے ممالک کی عام حالت سے جو بعثت نبوی کے وقت تھی، ضروری واقفیت حاصل کر لینی چاہیئے۔

چین

چین نے اقصائے مشرق میں اپنی صلاحیتوں کے معراج کمال کا مظاہرہ اپنے مصلح کونگ فوت سیو (کنفوشیوس) (زمانہ ۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م) کی صورت میں کر دیا تھا۔ عہد نبوی کے آغاز پر وہاں عجیب حالت تھی۔ کنفوشی نظام پارہ پارہ ہو چلا تھا۔ ہند کا بدھ مت وہاں گھسنے اور ایک عبوری دور پیدا کرنے کا باعث بنا ہوا تھا۔ متاخرخاں (Huns ہُن) خانوادے کی

حکومت عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔ اور اس کی جگہ وائی Wai "Wu" اور شو (Shu) کی تین حکومتیں قائم ہوئی تھیں کہ خانہ جنگیوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ چھڑ گیا اور ملک کو انسانیت کی کسی خدمت کے ناقابل بنا چکا تھا۔ گھریلو فتنے پر مستزاد تاتاریوں، ہسیونگ نو اور تبت والوں کے حملے بھی تھے۔ عرصہ دراز کے افتراق کے بعد خانوادہ سوئی نے ۵۸۹ء تا ۶۱۸ء تیس سال کے قلیل عرصے کے لیے ملک میں بہت کچھ وحدت پیدا کی۔ مگر ہجرت نبوی سے دو سال پہلے ہی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر ٹانگ خانوادہ برسراقتدار آیا تو آہستہ آہستہ حالت کچھ سدھری۔ اور ملک میں امن اور یکجہتی تو پیدا ہوئی مگر ہم چومن دیگرے نیست کا ترقی سوز جذبہ انھیں کچھ سیکھنے میں مانع ہی رہا۔ (تفصیلات انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا وغیرہ میں)

ہند

ہند میں ایک ہزار سال قبل مسیح آریہ قبائل آگھسے تھے۔ جات پات کے نظام، مظاہر پرستی کی سطحیت کے تحت کروڑوں دیوتاؤں کی ایجاد، رہبانیت ترک دنیا کو انسانیت کا کمال سمجھنے کا جذبہ اور ہر طرح کی چیزیں اُسے پوری انسانیت کی اجتماعی زندگی کی خدمت کے ناقابل بنا چکی تھیں۔ کنفوشیوس کے، ہمعصر زمانے میں گوتم بدھ نے برہمنوں کی مراسم پرستی کے خلاف احتجاج کر کے ایک دوسری انتہا پسندی کی تعلیم دی۔ علاج صحیح تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ عارضی ضرورتوں کے لیے تھا، چند دن وہ پھلا پھولا۔ مگر ایک تو معتدل حالات کے لیے اس میں ٹھوس بنیادیں نہ تھیں دُوسرے بدھ مت اور برہمنیت کی کشمکش ایک دوسرے پر عارضی فتح کے بعد بالآخر بدھ مت کو بڑے مظالم کے بعد ہند سے خارج کر دینے کا باعث بنی۔

عہد نبوی سے پہلے ہند پر وسط ایشیاء کے سفید خان (Huns) خانوادے کی حکومت تھی مگر ولادت نبوی سے پانچ سال پہلے ۵۶۵ء میں دریائے جیحوں پر اس حکومت کو شکست ہوئی، تو ہند پر سے بھی اس کا تسلط جاتا رہا۔ پھر تھانیسر کے راجہ کا چھوٹا بیٹا ہرش (زمانہ ۶۰۶ تا ۶۴۸ء) شمالی ہند کا مالک بنا۔ آسام بنگال، نیپال، مالوہ، گجرات، کاٹھیاواڑ وغیرہ اس نے رفتہ رفتہ فتح کیے۔ مگر ۶۱۰ء میں ہجرت نبوی سے کچھ پہلے اس نے دکن کا رخ کیا تو چلوکیا خاندان کے راجہ پلی کے سن دوم نے اُسے دریائے نربدا پر شکست دے دی۔ اس کی اولاد نہ تھی۔ اپنی

رعایا کو اس نے آرام طلب بنا لیا تھا۔ اس کی موت کے ساتھ اس کی شہنشاہی کا خاتمہ ہو گیا اور پھر صدیوں تک تباہ کارانہ خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ چلوکیا والوں نے ہرش کو شکست تو دی، مگر کاورم کے پلواوالوں کے ہاتھ خود بھی تباہ ہو گئے اور ان کی سلطنت پنپ نہ سکی۔
(ماخوذ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا وغیرہ)

ترکستان

یہ بڑا مردم خیز خطہ ہے۔ مگر سنہ عیسوی کی سات صدیوں تک یہاں کی حالت کا ہمیں کچھ بھی علم نہیں۔ عہد نبوی کے ہمعصر خان (Huns) تبت پر چھا گئے تھے اور مغربی ترکوں کی مدد سے براج رہے تھے۔ مگر ان میں نہ کوئی تمدن تھا اور نہ خود غرضی کے سوا انسانیت کی خدمت کے لیے ان میں کوئی بلند مطمح نظر ہی۔ (ماخوذ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)

رومی و ایرانی

یونان تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ یورپ میں رومی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ مگر جب وہ مشرقی و مغربی دو حصّوں میں بٹ گئی تو ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبوی کے زمانے میں مغربی رومیوں پر جرمن وغیرہ قبائل ٹوٹ پڑے اور پایۂ تخت روما کے بھی مالک بن گئے تھے۔ ان اَن پڑھ وحشیوں نے جو کچھ کیا ہوگا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے محبت کے مذہب یعنی عیسائیت کو قبول کیا تو غیر عیسائیوں سے زیادہ بے رحمی اور بے اصولی دکھاتے رہے ادھر مشرقی رومی حکومت قسطنطنیہ کے صدر مقام سے ہمسایہ ایرانیوں کے ساتھ صدیوں تک آویزش میں مبتلا رہی۔ عہد نبوی کے ابتدائی زمانے میں ایرانیوں نے اپنے حریفوں سے مصر اور شام وغیرہ تک چھین لیے تھے، اور قرآن مجید میں غلبت الرّوم فی ادنی الارض کا اعلان کیا۔ مگر ۶ھ یعنی صلح حدیبیہ کے زمانے میں نینوی (موصل) کے میدان پر رومی شہنشاہ ہرقل نے ایرانیوں کو ایسی فیصلہ کن شکست دی کہ ان کے ہاں شاہ گردیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور ایران سنبھل ہی نہ سکا قسطنطنیہ کے رومی (بازنطینی) اس فتح سے کیا فائدہ اُٹھاتے جب کہ صدیوں کی بیرونی جنگوں نے ایک طرف ملک کو تباہ و تاراج کر دیا تھا، تو دوسری طرف مذہبی فتنے بھی ان کے ہاں ناقابل بیان تھے۔

چنانچہ حضرت مسیح میں صرف خدائی طبیعت کا ہونا یا خدائی اور انسانی ہر دو طبیعتوں کا پایا جانا یا دو طبیعتوں مگر ایک مشیت کا پایا جانا وغیرہ نظریے فرقہ بندی پیدا کر رہے تھے۔ اور ہر فرقہ اتنا تنگ نظر تھا کہ دوسرے پر اتنے مظالم کرتے رہے کہ جب حکمران فرقے سے مسلمانوں کی جنگ ہوئی تو دوسرے فرقے کے عیسائی دل و جان سے ان اجنبی غیر مذہب والوں کو خوش آمدید کہتے اور ان کو مدد دیتے رہے۔ اور مسلمانوں کے ماتحت رہنا اُن کو غیر فرقے کے عیسائیوں کے ماتحت رہنے سے کہیں زیادہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔

(انحطاط و زوال روما مؤلفہ گبن)

یہی حال ایران کا تھا۔ مزدکیت کی دولت اور عورت میں اباحت پسندانہ اشتراکیت نے عرصے تک مُلک کو نہ صرف خانہ جنگی میں مبتلا رکھا بلکہ ملک کے اخلاق کو ناقابلِ اصلاح طور پر تباہ کر دیا تھا۔ حد ہو گئی کہ مزدک نے بھرے دربار میں شہنشاہ سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ یہ تیری ملکہ بھی صرف تیری نہیں ہے بلکہ اس سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے اور اس پر نہ اُسے غیرت آئی اور نہ یہ شرمائی۔ پھر نوشیرواں تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے باپ کے عمل کو اُلٹ دیا۔ اور اب آتش پرستی نے مزدکیت کے خلاف وہ وہ ظلم ڈھائے کہ بیان سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اسی زمانے میں رسولِ اکرمؐ کی ولادت ہوئی۔ مگر جیسا کہ ہم نے دیکھا رومیوں نے ایرانیوں کو کچھ ایسی زک دی تھی کہ وہ پنپ نہ سکے۔ (کرسٹین سین، ساسانی)

حبش

حبش بھی کافی بڑا علاقہ ہے اس نے ایرانیوں سے یمن کو چھین لیا تھا۔ مگر جب یہ شمالی عرب میں بڑھے تو ولادتِ نبویؐ کے سال یہ "اَصۡحٰبُ الۡفِیۡلِ" کیڑا کھائے ہوئے کھوکھلے دانوں (عَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ) کی طرح ختم ہو گئے۔ اور جلدی ہی عہدِ نبویؐ میں ان کی حکومت عرب میں اور خود حبش میں بھی خانہ جنگیوں وغیرہ میں پھنس کر بیکار و معطل ہو گئی۔ اور مسلمان مہاجرین ہمیشہ خود حبش کی اُن خانہ جنگیوں سے پریشان رہے۔

غرض اس زمانے میں جدھر دیکھو دنیا میں تباہی اور فتنہ و فساد ہی تھا۔ کسی جگہ بلند نظرانہ عالی ہمتی اور دردمندانہ انسانیت پروری نظر ہی نہ آتی تھی۔ ضرورت تھی کہ پوری دنیا کو اب

جھنجھوڑ کر یاد دلایا جائے کہ وہ سب ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہے۔ اور ملک وار، قوم وار، نسل وار، اور ایسے ہی دیگر محدود مذاہب سے نجات دلائی جائے۔ اور تمام انسانی دنیا کے لیے ایک "بنیادی مذہب" پیش کیا جائے جو زماں و مکان کے فرق سے بالا اور جاتیوں اور طبقوں کے امتیاز سے بری ہو۔ اور ہر انسان کو انفرادی حقوق اور ذمہ داریاں عطا کر کے نوعِ بشری کی تخلیق کی اصلی غرض و غایت پوری کرنے کا انتظام کیا جائے۔

عربؔ اور مکہ معظّمہ کا انتخاب دعوتِ اسلام کے مَرکز کے طور پر

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام ہی دنیا کی حالت اصلاح طلب تھی تو اس کی اصلاح کی دعوت کا مرکز کہاں ہو؟

جغرافی وجہ

پرانی دنیا کے نقشے پر نظر ڈالئے تو نظر آ جائے گا کہ ایشیا، یورپ، افریقہ اور اوقیانوسیہ کے براعظموں میں جزیرہ نما عرب کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہ مرکز بھی ایسا کہ ایشیا میں ہوتے ہوئے بھی وہاں سے افریقہ اور یورپ بہت قریب ہیں۔ خاص کر ان دونوں براعظموں کے اس زمانے کے متمدن ترین علاقے یعنی یونان، مصر، روما سے بھی مرکزیت تھی، جس نے عرب کے بھی مرکز مکہ معظمہ کو ناف زمین کا نام دلا دیا تھا۔

کسی مرکز سے ہر انتہائی حصہ قریب ترین ہوتا ہے۔ اور ہر جگہ پہنچنا مرکز ہی سے سہل ترین ہوتا ہے۔ آب و ہوا کا اثر طبائع اور اخلاق پر جو کچھ پڑتا وہ اب مسلم ہے۔ سرد ممالک والوں کی ذکاوت، پہاڑی اور صحرائی لوگوں کی جفاکشی، زرخیز ممالک والوں کی تمدنی ترقیاں وغیرہ مسلّمہ قانونِ قدرت پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بہت ہی محدود رقبے کے اندر مکے کی وادیٔ غیر ذی زرع، طائف کی رشک شام و روم خنکیاں، مدینے کی زرخیزی وغیرہ کا ایسا اجتماع حجاز میں عمل میں آیا کہ اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ایشیا، یورپ اور

افریقہ سے طبعی مماثلت کے ساتھ ساتھ عرب میں ان تینوں براعظموں کے سیاسی مفادات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے وقت پوری قوت سے اثر انداز تھے۔ قسطنطنیہ کے رومیوں نے شمالی عرب پر، ایرانیوں نے مشرقی، اور حبشیوں نے جنوب مغربی عرب پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اور عرب تینوں براعظموں کا سنگم اور عمل ورد عمل کا مرکزی نقطہ بنا ہوا تھا۔

عمرانی وجہ

تاریخ عالم پر محض ایک سرسری نظر سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وحشیت و بدویت کے بعد ہی کسی قوم کا ارتقاء اور اس کے ہاتھوں انقلاب آفریں کارنامے انجام پاتے ہیں۔ اور عروج و تمدن کے زمانے میں کسی قوم میں برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی آپ اصلاح نہیں کر سکتی، بلکہ جلد ہی انحطاط و زوال کے ذریعے سے اس کا رہنمایانہ وجود دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا کی متمدن قوموں کو عموماً وحشیوں اور بدویوں ہی نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود مغلوب کر لیا، رومی شہنشاہی کو جرمنوں نے، چینیوں کو ترکمانوں نے جس طرح زیر کیا، وہ دنیا کو معلوم ہے۔ عہد نبوی کی متمدن دنیا کو صحرائے عرب کے بدویوں کے ذریعے سے جھنجھوڑنے کی ضرورت تھی۔

کوئی ملک پوری طرح حضری اور متمدن زندگی گزارنے لگے تو اس میں زندگی پیدا کرنے والے نئے پیوند کا لگنا اندرونی وسائل سے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر خانہ بدوش بدویوں کے ماحول میں کہیں کہیں شہری زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہوں تو ایسا علاقہ وقتاً فوقتاً صحرا نشینوں کو اپنے اندر کھینچ اور جذب کر کے تازہ قوت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بات عرب میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

نامعلوم وجہ سے دنیا کے تین حصے بڑے نسل کش ہیں۔ صحرائے گوبی، جرمنی کا کالا جنگل اور عرب سینکڑوں ہزاروں سال سے انہیں علاقوں سے اجتماعی ہجرتوں کی موجیں اٹھتی رہی ہیں۔ اور آس پاس کے علاقوں پر چھا جاتی رہیں۔ کیونکہ خود ان کے اپنے اندر آبادی کی تیز ترقی کی تو قوت ہے۔ لیکن آبادی کی پرورش کے لیے غذا وغیرہ کے وسائل بہت کم ہیں۔ یہ بات جو عرب کو حاصل ہے دنیا کے مرکز میں ہونے کے باعث مزید اہمیت پیدا کر دیتی ہے۔

عرب خاص کر حجاز میں ابتک کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے ابتک اپنی ذہنی قوتیں کسی کام میں خرچ نہ کی تھیں۔ اور ان کی توانائیاں سب محفوظ بلکہ لبریز تھیں۔ نپولین کے استنباط کے مطابق سینکڑوں سال سے خانہ جنگیوں اور بے امنیوں کے باعث اُن میں جفا کشی، جاں فروشی، صبر وضبط مستعدی، سادگی اور اسی طرح کے دیگر بلند کردار جو ترقی کناں قوموں کے لیے درکار ہیں خوب پرورش پا چکے تھے۔ بعض دیگر وجوہ سے بات کا پاس، خودداری، عزت نفس بھی اُن میں مستحکم تھے۔ صحرائی زندگی اور کھلی فضا میں پرورش کے باعث اُن کی بصارت، سماعت، اور دیگر حواس بھی شہریوں کے مقابل غیر معمولی طور پر تیز تھے۔ لکھنے پڑھنے کا (گنتی کے پندرہ بیس آدمیوں کو چھوڑیں تو) چونکہ کوئی رواج نہ تھا اس لئے حجازیوں کے حافظے بہت زبردست تھے۔ غذاء میں سادگی، صحرا کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ اور برسوں میں بھی کوئی بیمار نہ ہوتا تھا۔

زراعت پیشہ لوگوں میں جو وابستگی وطن بلکہ زمین زدگی ہوتی ہے، اس کے باعث اُن کا مہمات پسند ہونا، وطن سے کسی بھی لمبے دور و دراز مقام پر جانے پر آمادہ رہنا، اور اسی طرح کے مستعدی کے دیگر امور ممکن نہیں، صنعت وحرفت میں بھی زمین زدگی کافی ہوتی ہے۔ صرف تجارت پیشہ ہی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جو سفر وسیاحت کی ترغیب بھی پاتے اور اس پر مجبور رہ کر اس کے عادی بھی ہو جاتے ہیں۔ مکہ والوں کی بستی قرآنی الفاظ میں "بن کھیتی" کی وادی ہے۔ یہاں زراعت تو کیا صنعت وحرفت کے لیے بھی کوئی سہولت نہیں۔ اور تو اور غذا تک کی درآمد کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کی مستعدی اور تیار باشی کے کیا کہنا۔

فتوحات اور توسیع نیز اُن کے استحکام کے لیے حرکت پذیری Moblity کو جو اہمیت ہے وہ آج مسلّم ہے۔ جس زمانے میں بے جان سواریاں بجز سمندری جہاز کے اور کچھ نہ تھیں، اور برق اور بھاپ پر ابھی انسان کو تسخیر حاصل نہیں ہوئی تھی تو تیز تر سواری گھوڑے کی تھی۔ اور کارآمد ذریعہ حمل ونقل اونٹ جس کا صبر وتحمل، غذا کی سادگی وکمی، کثیر بوجھ کا اُٹھا سکنا، دودھ اور گوشت وغیرہ کا قابل غذا ہونا سب جانتے ہیں۔ گھوڑوں اور اونٹوں سے عرب کو جو خصوصیت ہے وہ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہزاروں کی عربی فوج اپنے اونٹوں کی مدد سے جس تیزی سے حرکت کر سکتی اور لمبے لمبے، دھاوے مار سکتی تھی وہ عربی

فتوحات کی سُرعت، کامیابی اور استحکام کے اہم وسائل میں گنی جاتی ہے۔ اور ماہرین حربیات قدیم سے عربوں پر رشک کرتے رہے ہیں۔

چین اور ہندوستان کی تجارت عرب ہی سے ہو کر یورپ جاتی تھی۔ قریش کا عرب کی تجارت پر حاوی رہنا مصر وشام، عراق وایران، یمن وعمان، حبش وسندھ وغیرہ سے انہوں نے جو تجارتی معاہدے (ایلاف) کر رکھے تھے اور "رحلة الشتاء و الصيف" کے باعث شمال وجنوب کے جس طرح قافلے ملاتے رہتے تھے وہ سب جانتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر اقوام کی مزاج شناس، ملکوں کی راہ شناس، سب سے واقفیت کے باعث خود شناس قوم اس وقت کم ہوگی۔

حکمرانی کا سلیقہ

مکے اور طائف اور پھر مدینے کی شہری مملکتوں میں جو تھوڑا بہت سیاسی نظام تھا وہ خوش قسمتی سے سماجی مساوات پر مبنی تھا۔ سرداری اور اعیانیت سے کوئی جات پات کے ناقابل شکست بندھن نہیں پیدا ہو گئے تھے۔ سب آزاد اور سب برابر کے ہوتے تھے۔ محض عقل و تجربہ کسی کو سردار منتخب کراتے تھے۔ اس ماحول میں رچے ہوئے ہونے کے باعث انہیں جب دنیا پر حکمرانی کا موقع ملے تو انسانوں میں مساوات کی جیسی توقع اُن سے ہو سکتی اور رنگ و زباں ووطن کے اختلافات کو بے اثر قرار دینے کی اُن سے جتنی اُمید ہو سکتی تھی نہ برہمنیت میں ممکن تھی نہ ایرانیت میں نہ رومیت میں، نہ طبقات کا تفرقہ ذہنوں میں اتنا راسخ تھا کہ نکالے نہ نکل سکتا تھا۔

لسانی وجہ

عربی زبان بھی انتخاب کا ایک باعث ہو سکتی تھی۔ اس کا خط جمالیاتی اور خطیاتی نقطہ نظر سے جو صلاحیتیں رکھتا تھا اور خود زبان ادائے مطالب اور فصاحت و بلاغت کی جو غیر متناہی قابلیتیں رکھتی تھی وہ دیگر ہمعصر متمدن زبانوں مثلاً پہلوی، یونانی، سنسکرت اور لاطینی نہ چینی پر بدرجہا تفوق رکھتی تھی۔

نفسیاتی وجہ

چند ساحلی یا سرحدی رقبوں کو چھوڑ کر عرب پر اب تک کسی بیرونی سلطنت کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ اپنی آزادی کے ساتھ ہمیشہ بیرونی پناہ جویوں کے لیے پناہ گاہ ثابت ہوتا رہا۔ دُنیا کی رہنمائی کے لیے کسی غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوم کی جگہ وہی قوم اوروں پر ترجیح رکھتی سمجھی جاسکتی ہے جو آزادوں کی بھی آزاد ہو۔

مکے کی حالت ولادت باسعادت سے قبل

یہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ مکہ ناف زمین پر آباد اور پُرانی دنیا کے بیچوں بیچ تین براعظموں کے وسط میں واقع ہے، جس سے بہتر کوئی مرکز کسی عالمگیر تحریک و تبلیغ کا نہیں ہو سکتا اس طرح اس کا "وادی غیر ذی زرع" بن کھیتی کی بلکہ بے آب و گیاہ سرزمین میں ہونا طماعوں کی طمع سے اس کو محفوظ رکھنے کا باعث تھا۔ تجارتی "رحلۃ الشتاء و الصیف" سے یہاں دولت جمع ہو سکتی تھی۔ اس کی حفاظت قدرت نے یوں کر دی کہ ایک تنگ درّے کو چھوڑ کر وہ وادی جہاں شہر مکہ آباد ہے۔ بلند اور ناقابلِ عبور و مرور پہاڑیوں سے چاروں طرف گھری ہوئی ہے اور مدافعتی اغراض کے لیے بہت موزوں ہے۔ بنجر مکہ اور اس کے ہمشیر شہر یعنی زرخیز طائف نے مل کر یہاں کی آبادی میں وہ خصلتیں اور خصوصیتیں طبعاً پیدا کر دی تھیں۔ جن کا اجتماع نادر ہی ہوتا ہے۔ جب ہی تو انہوں نے رومی، ایرانی اور حبشی شہنشاہیوں کے قبضے کے لیے مسلسل جدوجہد کے باوجود اپنی چھوٹی سی شہری مملکت کو آزاد اور خود مختار رکھا اور کبھی اس پر اجنبیوں کا تسلط نہ ہونے دیا۔ اب ہم دیگر احوال کا مطالعہ کریں گے۔

سیاسی حالت

مکہ ایک خود مختار شہری مملکت تھا۔ بستی کا رقبہ تو چند مربع میل سے زائد نہیں لیکن اُس کے اطراف کا وہ حصہ جہاں تک اس کا موثر تسلط تھا اور جسے وہ حرم کہتے تھے تقریباً سوا سو میل مربع پر مشتمل تھا۔ یہاں مختلف زمانوں میں مختلف قبائل کی حکمرانی رہی۔ سرورِ کائنات

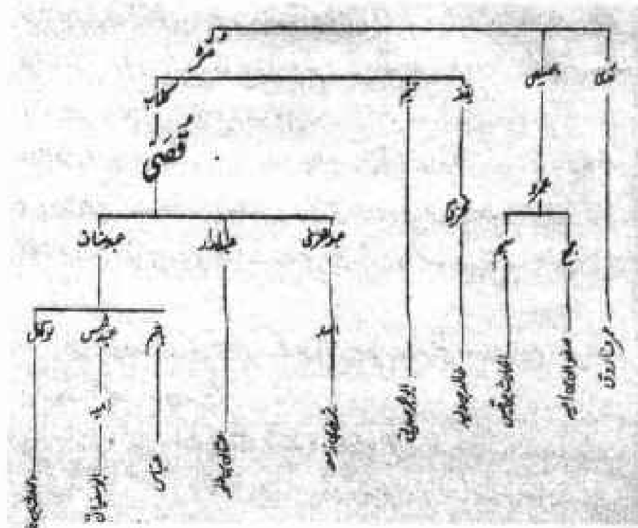
کی ولادت کے وقت یہاں آپ ہی کے خاندان قریش کو سرکردگی حاصل تھی۔ اگرچہ دیگر لوگ بھی بستے تھے۔ لیکن فردی حکومت کا وجود نہ تھا آنحضرتؐ کے پرداداکے دادا قصی نے تقریباً بادشاہ کی سی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اپنی وفات کے وقت اپنے سیاسی فرائض اپنے بچوں میں بانٹ دیے، تو پھر وہ کسی ایک فرد میں دوبارہ جمع نہ ہو سکے۔ بلکہ منتشر تر ہی ہوتے چلے گئے۔ اور ابن عبدربہ کے مطابق دس قبائلی سرداروں کی اعیانیت قائم ہوگئی گویا دس وزراء تھے۔ اور بادشاہ کوئی نہ تھا۔ دارالندوہ کی پارلیمان کسی سے متعلق تھی، تو عبادت گاہ کعبہ کا انتظام کسی اور سے، کوئی قوم کا علمبردار اور سپہ سالار تھا تو تعمان اور ہرجانوں کا تعین کرنا کسی اور کا کام تھا، کوئی افسر خارجہ تھا اور بوقت ضرورت خود ہی سفیر بھی بن کر چلا جاتا تھا تو کیش کی وصولی اور خرچ کسی اور کے ذمے تھی۔ اُن کی تفصیلوں کی تو یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن ان اشاروں سے اتنا ضرور معلوم ہو چکا ہوگا کہ اُن ذہین قریشیوں نے ایک خاصا ترقی یافتہ دستور مملکت قائم کر لیا تھا، جس میں تمام ہی اہم اور بنیادی امور کا انتظام تھا۔ ایک دو نہیں دس گھرانوں میں نظم و نسق کی روایتیں اور تجارب پیدا ہو گئے تھے۔ ایک عالمگیر شہنشاہی کے ہونے والے مالکوں کو ضرورت بھی اسی کی تھی۔

فوج کے سلسلے میں تو یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ غلاموں اور ملازموں کے ذریعے سے ایک مستقل فوج قائمہ بھی ان کے ہاں قائم ہو گئی تھی، جو قومی جنگوں میں بھی ہاتھ بٹاتی اور کاروانوں کے ساتھ حفاظت کے لیے بھی جایا آیا کرتی۔ عدالتی نظام کے سلسلے میں خاندان دار اور قبیلہ وار حکم بھی تھے خانہ کعبہ میں قرعہ و فال بھی تھا۔ موقتی ثالث بھی مقرر ہوتے تھے۔ لیکن ان سب کے علاوہ ایک رضا کار انصاف رسانوں کی جماعت بھی بن گئی تھی۔ اس حلف الفضول میں شریک ہونے والے یہ اقرار کرتے ہیں کہ حدود شہر میں کسی پر ظلم نہ ہونے دیں گے، چاہے شہری پر ہو یا اجنبی مسافر پر اور اس وقت تک ظالم حق رسانی نہ کرے۔

سیاسی سلسلے میں مکے والوں نے آس پاس کے بہت سے قبائل سے حلیفیاں بھی قائم کر لی تھیں جو جنگی اہمیت بھی رکھتی تھیں، اور تجارتی کاروانوں کو آنے جانے میں محفوظ رہ گزر بھی مہیا کرتی تھیں۔ اور اُن کی اپنی قوت بھی اتنی تھی کہ دور دراز مثلاً مدینے کے قبائل ان سے حلیفی کی کوشش میں رہنے لگے تھے۔

کچھ تھوڑا سا خانوادہ واری تذکرہ پس منظر کے لیے مفید ہوگا۔ مکّے میں یوں تو ہزاروں کی آبادی تھی لیکن قبائل قریش کو وہاں سرداری حاصل تھی۔ اُن میں دس قبیلے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اوران کے سردار تھے۔

کعب بن لُوی بن غالب بن قُریش



ان میں سے مکے پر قریش کے قبضے کے وقت اعلیٰ ترین سرداری قُصَی کو حاصل ہوگئی تھی قُصی کے بعد اس کی اولاد میں عہدے بٹ گئے۔ اور خانہ جنگیاں اور رقابتیں چھڑ گئیں۔ عہد نبوی کے آغاز پر عبد مناف کے خاندان میں سے بنی ہاشم اور بنی امیہ میں رقابتیں تھیں۔ اور عبدالمطلب کی وفات کے بعد ابو طالب کے افلاس وغیرہ نے بنی امیہ کا پہلو مضبوط تر کر دیا تھا۔ ابوسفیان جیسے پیدائشی لیڈر اور عثمان غنی جیسے کاروباری مہارت رکھنے والے اسی قبیلے میں تھے۔ خود پیغمبر اسلام اگرچہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے لیکن ایک تو عبدالمطلب کے بڑے بیٹے کے بڑے بیٹے یا اور طور پر جانشین نہ تھے۔ بلکہ یتیم پیدا ہوئے تھے، اور چچا نے پرورش کی تھی۔ یہ کہنا گستاخی کے لیے نہیں امر واقعہ کا اظہار کرنا ہے، کہ آں حضرتؐ ایک جونیئر

گھرانے کے جونیئر فرد تھے۔ آپ کو نبی تسلیم کرنا بنی امیہ ہی کو نہیں خود بنی ہاشم کے سینیئر افراد کو گراں گزرتا تھا۔ ظالم چچا ابولہب ہی نہیں بلکہ ہمدرد سرپرست چچا ابو طالب کو زندگی بھر اپنے سے چھوٹے کی یہ حیثیت تسلیم کرنا وقار کے خلاف ہی نظر آتا رہا۔ قریش کے دیگر قبائل میں بھی بڑی بڑی شخصیتیں تھیں قبیلہ مخزوم میں ابولید بن المغیرہ اور اس کے فرزند حضرت خالد بن ولید نیز ولید کا بھتیجا ابوجہل زمانہ جاہلیت میں اتنی ممتاز حیثیت رکھتے کہ اس کا ذکر کیے بغیر چارہ نہیں۔ آنحضرتؐ نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تھا تو بروایت طبری چھوٹتے ہی قریش نے کہا کہ ولید اس کا زیادہ مستحق ہے، جو "ریحانۃ قریش" (قریش کا پھول) کہلاتا تھا۔ خالد اگرچہ کم عمر تھے۔ لیکن حضرت عمر کا قول تھا کہ عورتیں خالد جیسا بچہ پھر جننے سے عاجز ہیں۔ ابوجہل زمانہ جاہلیت میں اپنی قابلیت اور عمدہ رائے کے باعث "ابوالحکم" کہلاتا تھا۔ اور دارالندوہ کی پارلیمان میں جہاں چالیس برس کی عمر سے کم کوئی رکن نہ ہوسکتا تھا تیس ہی برس کی عمر میں اسے بطور خاص نشست دیدی گئی تھی۔ خودداری اس میں ہٹ دھرمی بن گئی تھی۔ اس کی غرباء پروری و فیاضی کے بھی افسانے ملتے ہیں۔ جیسا کہ ابن حبیب نے کتاب المنمق وغیرہ میں بیان کیا ہے۔

ان سماجی رقابتوں کو ذہن میں رکھے بغیر آغاز اسلام کے قریشی معاندین اور مخالفین اسلام کی نفسیات کا سمجھنا آسان نہ ہوگا۔

علمی حالات

مکّے میں لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہ تھا۔ گنتی کے دس بارہ آدمیوں کو لکھنا آتا تھا۔ لیکن شعر و شاعری اور فصاحت و خطابت کے خوب چرچے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو گھر میں رکھنے کی جگہ بدوی قبائل میں بھیج دیتے تھے۔ تاکہ ٹھیٹ عربی لہجہ اور خالص عربی زبان سیکھیں۔ یہ مکّے ہی کا قومی معبد کعبہ تھا جس میں لٹکانے کی عزت حاصل ہوتو کوئی قصیدہ معلقات میں شامل ہونے کی زندہ جاوید عزت حاصل کرتا۔ عکاظ کی سالانہ بین العرب موتمر ادبی گویا قریش ہی کی سرپرستی کی رہین منت تھی، اور ادائے حج کعبہ پورے عرب زبان کو ایک بنانے اور قریشی علاقے کی بولی کو معیار اور ٹکسالی بنانے میں خاموش لیکن نہایت موثر حصہ لے رہے تھے۔ یہ قریش کی ادب نوازی ہی تھی کہ ان کو نہ تو ید بیضا، کے معجزے کی ضرورت تھی، اور نہ دم عیسیٰ کی۔

بلکہ تھی تو ایک ادبی شہ پارے کی۔ جسے سُن کر وہ جھومنے لگتے۔ اور جس کی تلاوت کو سننے کے لیے وہ باوجود اپنی ضرب المثل مخالفت کے چھپ چھپ کر آتے۔

یہ ادبی ذوق لیکن نوشت وخواند سے اُمّی محض ہونا نسلاً نسل کی خصوصیت تھا۔ اسی لیے انہیں اپنے مطلب کی چیزیں خاص کر اپنے کاروباری حسابات اور قرضداروں کے نام اور رقمیں یاد رکھانے پر مجبور کر کے اُن کے حافظے کی قوت کو غیر معمولی طور پر مستحکم کر دیا تھا، جو ناگریز تھا۔ اس سے بعد کو قرآن وحدیث کے تحفظ کا خود بہ خود انتظام ہو گیا۔

معاشی حالات

وادیٔ "غیر ذی ذرع" کے باشندوں کے لیے تجارت کے سوا کیا چارہ کار تھا ان کے پاس صنعت وحرفت کے لیے خام مواد بھی بالکل نہ تھا۔ اس طرح یکسو ہو کر انہوں نے اپنی قابلیتوں کو تجارت پر مرتکز کر دیا تو نتائج اس زمانے کا خیال کرتے ہوئے حیرت ناک معلوم ہوتے ہیں۔

عرب ایک صحرائے اعظم تھا۔ باہر والے ان کے لق ودق ملک میں کیا آتے انہیں کو حاجت تھی کہ باہر جایا کریں۔ ہندوستان کے برابر بڑے اس صحرائی براعظم کی پوری داخلی و خارجی تجارت کو قریش ہی نے منظم کیا۔ اور اپنے کو اس کا مرکز ومحور بنا دیا تھا۔

چنانچہ آنحضرتؐ کے پردادا عمرو بن عبد مناف (جو اپنی غربا پروری کے باعث ہاشم کے لقب سے مشہور ہیں) اتنے کاروان وکاربرآر تھے کہ قیصر روم اور کسریٰ ایران اور نجاشی حبش اور اقیال یمن سے ایلاف یعنی "منشور تجارت" حاصل کر لئے تھے کہ ان ممالک کو بے کھٹکے کاروان لایا اور لے جایا کریں، مکّے سے عراق نیز عمان (جہاں سے مختصر بحری راستے سے بلوچستان وسندھ اور ہندوستان کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے) ایک طرف فلسطین وشام وعراق دوسری طرف مصر تیسری طرف حبشہ چوتھی طرف یمن اور پانچویں طرف سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں میل کی مسافت پر واقع ہیں ششماہی "رحلة الشتاء و الصيف" آج چودھویں صدی کے نصف دوم میں بھی تصور کے ساتھ رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ مگر قریشی تاجر برابر جاتا تھا۔ سفر کی مسافت اور راستے کے خورد ونوش اور تکان سے بڑھ کر گزرگاہ کے لُٹیرے خود مختار قبائل

مست قبائل سے سربرارا ہوتا تھا۔ اس کے لیے ان کا حیرت زا نظام حلیفی وخفارہ (یا بدرقہ) وجود میں کیا آیا تھا کہ عرب کے کسی شخص کو بھی تجارتی سامان لے کر حجاز، نجد وغیرہ کے وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے مصری قبائل کی سرزمین سے گزرنا پڑتا تھا۔ تو قریشی بدرقے حاصل کرتا۔ قریش کی طئی اور کلب قبائل سے حلیفی تھی جو شمالی عرب میں خیبر اور دومۃ الجندل کے اہم رقبے پر چھائے ہوئے تھے اور یہیں سے عراق، شام اور مصر کو راستے پھوٹتے تھے۔ بنی عمرو بن مرشد سے دوستی کی بنا پر قبائل ربیعہ کی سرزمین قریش کے لیے محفوظ تھی، جس سے بحرین وعمان یعنی پورے مشرقی عرب کی منڈیوں تک رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو بحرین کے سُوق مشقّر جانا ہو تو قریشی خفارہ ہی حاصل کیا جاتا۔ جنوبی عرب میں مہرہ اور حضرموت کے علاقے ہیں۔ سُوق مہرہ جانا ہوتا تو بنی محارب کا بدرقہ حاصل کیا جاتا، حضرموت کے سُوق رابیہ جانے کے لیے قریشی قبیلہ۔ آل کل المرار کا خفارہ حاصل کرتے۔ اور دیگر لوگ کندہ کے آل مسروق کا لیکن قریشی سرپرستی کے باعث آکل المرار کو اپنے حریفوں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ غرض عرب کا شمال، جنوب، مشرق، مغرب اور وسط ہر حصہ قریشی ایلاف کی زنجیروں سے جکڑ گیا تھا۔ ان کے میلے اور ان کے کاروان جتنے مفید ثابت ہوئے ان کو قرآن نے دو معجز نما لفظوں میں یوں یاد دلایا ہے۔ کہ **اطعمهم من جوع وآمنهم** من خوف (فاقے کی جگہ کھانا اور خوف کی جگہ امن) اس نے قریش کو پورے عرب میں ایک مرکزیت ومرجعیت دیدی ہو اور حج کعبہ وعرفات کے لیے عرب کے انتہائی کونوں سے لوگ ہر سال آیا کرتے ہوں تو کیوں حیرت ہو[1]۔

مذہبی حالات

مکّے والے بُت پرست بن گئے تھے۔ لیکن وہ بتوں کو خدا نہیں بلکہ خدا کے پاس (جو واحد اور خالق السماوات والارض تسلیم کیا جاتا تھا) سفارشی سمجھتے تھے اسی لیے بتوں کے بارے میں ان کے ہاں بڑی رواداری نظر آتی ہے۔ نہ صرف اُن کے اپنے شہر ہی کا بُت ہبل کعبے کے پاس تھا، بلکہ جملہ قبائل عرب کے تین سو ساٹھ بُت کعبے کے اطراف تھے، نیز صفا ومروہ پر خود کعبے کی کوٹھری کے اندر علاوہ دیگر تصاویر واصنام کے حضرت ابراہیمؑ ہی نہیں حضرت عیسیٰؑ اور بی

1۔ تفصیلات ابن حبیب اور یعقوبی میں ملیں گی۔ سورۂ ایلاف سے یہی مراد ہے۔

بی مریم کی تصویریں بھی تھیں، جو عیسائی مذہب سے روادارانہ سلوک ظاہر کرتی تھیں۔ ایک ہی گھر میں کوئی بُت پرست ہوتا تو کوئی نصرانی اور کوئی دہریہ لامذہب (جس کی تفصیلیں معارف ابن قتیبہ وغیرہ میں ملتی ہیں۔ نیز ارزقی کی تاریخ مکّہ میں)

بت پرستی کے علاوہ وہ سالانہ حج کا مذہبی تہوار بھی مناتے۔ جس میں طواف کعبہ اور وقوف عرفات کے علاوہ اور طرح طرح کی رسمیں انجام پاتیں۔

معاد (مذہب) و معاش میں ہر ملک اور ہر زمانے میں جو قریبی تعلق رہا ہے اس کا مظاہرہ ہم دیکھتے ہیں کہ حج کے موقع پر ایک بین العرب عظیم الشان تجارتی میلہ لگتا ہے۔ حج کے مہینے (ذی الحجہ) ہی میں نہیں بلکہ اس سے ایک مہینہ پہلے اور ایک مہینہ بعد پورے تین مہینے ''حرام مہینے'' کہلاتے، جس میں قتل و خونریزی حرام تھی۔ حتی کہ قاتل سے انتقام تک اس زمانے میں نہیں لیا جا سکتا۔ تجارتی کاروانوں کو عرب کے بعید ترین گوشوں سے ذی الحجہ کے میلوں کے لیے آنے اور وطن واپس جانے کے لے تین مہینوں کے اس پُر امن زمانے کے سوا اور کیا مطلوب ہو سکتا تھا۔ اس طویل پُر امن زمانے کے وسط میں جو تہوار اور میلے پڑتے ہوں اُن کی مرکزیت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟

اخلاق و عادات

مکّے والے اسلام سے عین ماقبل زمانے میں زندہ قوموں کی جملہ مطلوبہ صفتوں میں اعلیٰ ترین مراتب پر فائز تھے۔ وہ فیاض تھے، بہادر تھے مہمات پسند اور دُور دُور کے سفروں کے شائق و عادی تھے۔ امانت و دیانت کی ان کے ہاں بڑی قدر تھی۔ بات کا پاس تھا۔ غرض ہر چیز تھی لیکن ان پر ایک غلاف چڑھا ہوا تھا۔ توانائیاں تھیں لیکن مرکز گریز اس لیے بے اثر تھیں۔ جان لینے یا دینے میں باک نہ تھا۔ لیکن بے اصول طور پر۔ اس لیے یہ خصوصیت بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ ذہن کے پکے اور استقلال کے پکے تھے۔ لیکن کوئی مقصد و مطمحِ نظر سامنے نہ تھا۔ جس کی تکمیل انہیں عالم انسانیت میں کوئی مرتبہ دلاتی۔ بہادری تھی تو خانہ جنگیوں میں غیرت و خودداری تھی تو لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے میں، فیاضی تھی تو بے اصول اور زیادہ تر مالداروں کی باہمی ضیافتوں میں، ادبی ذوق تھا تو عیاشی کی غزلیات میں، غرض اعلیٰ سے اعلیٰ ادنیٰ ترین

مقاصد کے حصول میں لگا ہوا تھا۔ شیر کی قوت خرگوش کے شکار میں ضائع ہو رہی تھی۔ اور قریش جانور کی طرح پیدا ہوتے اور کھاتے پیتے، زندگی گزار کر جانور ہی کی طرح ختم ہو جاتے۔ اور دنیائے انسانیت میں ان کے مرنے کا نہ کسی کو افسوس ہوتا اور نہ خبر۔

اسلام نے جو کچھ کیا وہ ان ہی صلاحیتوں کو اُجاگر اور منظم کرنا تھا۔ اور (دنیا سے فتنہ و فساد ختم ہو کر اللہ ہی کا بول بالا ہو جائے) کا مطمحِ نظر ان کو دے دینا تھا۔ ماسوئی اللہ کی الوہیتوں کا خاتمہ اور امن چین کا دور دورہ پوری دنیا میں (صرف مکّہ یا عرب ہی میں نہیں) کرایا جائے۔ اس مشن کو پورا کرنے کے لیے اس زمانے میں قریش سے بڑھ کر کوئی اور موزوں قوم پوری دنیا میں ناپید تھی۔

اب ہم دیکھیں گے کہ عبداللہ کے یتیم و بیسر بیٹے محمدؐ (ارواحنا فدہ) ہی کا اس غرض کے لیے کیوں انتخاب ہونا تھا۔

ختم المرسلین کے لیے آپ کے انتخاب کی وجہ

یوں تو کارساز عالم اپنی مخلوق میں سے جس سے جو چاہے کام لے سکتا تھا۔ اس کی قدرت کی کوئی حد نہیں، اور اس کی مشیت پر کسی کا بس نہیں۔ لیکن اس نے اپنی ہی مرضی سے جب ہماری زمینی دنیا کو عالم اسباب قرار دیدیا ہے تو کوئی بات بے سبب نہیں ہونی چاہیئے۔ چاہے ہماری نظر ہر صورت میں حقیقی سبب کو معلوم کرنے سے قاصر کیوں نہ رہے۔

مباحث بالا سے یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ کسی عالمگیر تحریک کے لیے عرب سب سے موزوں مقام تھا۔ اور عرب میں بھی حجاز اور حجاز میں مکّہ۔

مکّہ میں قریش [1] کی سرداری اور سربرآوردہ حیثیت مسلّم تھی۔ لیکن ماہرین عمرانیات کا استقراء و استنباط ہے کہ مسلسل کئی نسلوں تک کوئی سرداری کرے تو زمین کی قوت نمو کی طرح

1۔ قریش حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے قدم کا نشان کعبے کے سامنے مقام ابراہیمؑ میں اب تک محفوظ ہے۔ ابن سعد (1/2 حصہ) کے مطابق ایک مرتبہ بنی مدلج کا ایک قیافہ شناس کھوجی مکّہ آیا۔ تو اس نے آنحضرتؐ کے متعلق کہا تھا کہ آپؐ کے قدم سے زیادہ مقام ابراہیمؑ کے نقش سے کسی اور کو مشابہت نہیں۔

انسانوں کی نئی نسل بھی اپنے بہت سے جوہر ختم کر چکتی ہے۔ آنحضرتؐ کے دادا عبدالمطلب بے شک سردار تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کے والد عبداللہ کا انتقال اپنے بوڑھے باپ کی موجودگی ہی میں ہو گیا تھا۔ اور عبداللہ کو اپنی وفات کے بعد اپنی حاملہ بیوی سے جو بچہ پیدا ہوا اس کے لیے امارت و حکومت اور سرداری کا بظاہر حالات کوئی امکان نہ تھا۔ اول تو دولت، معاملہ فہمی وغیرہ کی بناء پر عبدالمطلب کے بعد قریش کے مختلف گھرانوں خاص کر بنی امیہ میں سرداری بٹ گئی تھی۔ اور خود بنی ہاشم و بنی مطلب کی سرداری بھی چھوٹے بیٹے عبداللہ کو نہیں مل سکتی تھی۔ اور نہ ملی ہی تھی جوان کے اکلوتے یتیم کو وراثت میں ملتی۔ آنحضرتؐ کی ولادت کے چند ہی سال بعد جب عبدالمطلب کی وفات ہوئی تو ابو طالب بزرگ خاندان بنے۔ ان میں دل کی خوبیاں چاہے جتنی بھی رہی ہوں، کاروباری سلیقہ اتنا نہ تھا کہ اپنی سرداری کے لیے اپنی دولت کو اپنا مددگار بنا سکتے۔ ابو طالب کے بعد اُن کے بچوں میں دل کی خوبیاں بھی اتنی نہ تھیں کہ بے رحم چچا ابولہب کو سردار بننے سے روکتیں۔ آنحضرتؐ ہجرت پر مجبور ہوئے تو عقیل بن ابی طالب نے آنحضرت (بی بی خدیجہ) کا مکان تک بیچ کھانے میں باک نہ کیا تھا۔

غرض سرداری کا خون تو رگوں میں ہو لیکن سرداری کا کوئی امکان نہ رہے تو متاخر پشتوں کے ایسے شخص میں سرداری کی خوبیاں تو بہت سی ہوتی ہیں، لیکن موروثی سرداری کی برائیاں یعنی غرور جلد بازی، آرام پسندی، ناتجربہ کاری وغیرہ نہیں ہوتیں۔ ورنہ ہونے والے جانشین کو ماں باپ کا لاڈ پیار، ماحول کی خوشامد و ناز برداری وغیرہ بگڑنے سے بہت کم باز رکھ سکتی ہیں۔ اور ایک جونیئر گھرانے کا جونیئر فرد ہی پورے خانوادے کا چشم و چراغ ہو سکتا تھا۔

یہ خصوصیت دوسرے افراد میں پائی جاتی تھی۔ اب یتیم پیدائش نے رہا سہا غرور اور لاڈ پیار ختم کر دیا ہوگا۔ پھر خاندانی رواج نے ماں کی محبت و توجہ تک سے محروم کر دیا۔ اور کئی سال تک ایک اجنبی دودھ پلائی کے ساتھ اجنبی ماحول میں خالص صحراء کی بدوی زندگی نصیب ہوئی۔ بی بی حلیمہ کا گھرانہ خود غریب تھا۔ وہاں سوائے اپنی مدد آپ کرنے اور سب کا ہاتھ بٹایا کرنے کے سوا کیا امکان تھا۔ بدویوں کے خانہ بدوش ماحول سے زیادہ کونسی چیز انسان کو "وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کی تربیت بچپن کے تاثر پذیر دور میں دے سکتی ہے۔ جب کوئی گھر نہ ہوحتیٰ کہ کوئی مستقل سرزمین بھی اپنی نہ ہو جہاں خدا کا فضل نظر آیا اور پانی،

چارہ موجود ملا خیمے ڈال پڑے۔ اور موسموں کی گردش نے وہ جگہ بے سود بنا دی تو خیمے اکھیڑ پھر خدا کے وسیع ملک میں کسی اور بہتر (گو پھر بھی عارضی) رہائش گاہ کی تلاش میں چل پڑے۔ یہ بدوی زندگی ہے۔

سالہا سال تک ایسی متوکلانہ زندگی عادت کر لینے کے بعد جب گھر آنا پڑا تو دیکھتے کے دیکھتے ماں اور دادا کی مہر و شفقت بھی خدا کی مشیت نے ختم کرا دی۔ اور کثیر العیال چچا کے گھر جا رہنا پڑا۔

ایسے فرد میں سرداری کے غرور خودنمائی کے آنے کا کیا امکان رہ جاتا ہے۔

پھر آں حضرتؐ کا رشتہ ننھیال کی طرف سے مدینے والوں سے تھا۔ اور ماموں کی طرف سے رشتہ طائف والوں سے۔ مکہ، مدینہ، طائف، فطری و انسانی ہر جہت سے باہم انتہائی مختلف حیثیتیں رکھنے والی ان تینوں بستیوں سے یکساں تعلق رکھنے کی وجہ سے مقامی وطنیت کی جگہ خود بخود عالمگیر وطنیت کی طرف آپ کو مائل ہونا پڑا ہوگا۔ اور کسی عالمگیر رہنما کے لیے اسی کی ضرورت تھی۔

وطن آنے پر نو عمری میں چرواہا گری سے سابقہ رہا۔ بے زبان اور مسکین بھیڑ بکریوں کی خدمت جہاں چوکسی، فرض شناسی، پابندی، اوقات، نرمی، اور محنت و مشقت سکھلاتی ہے وہیں خدمت گار میں سید القوم خادمہم کے بمصداق رہنمائی و سرداری کے حقیقی اوصاف پیدا کر دیتی ہے۔

چرواہا گری ختم ہوئی تو تجارت کرنی پڑی۔ یہاں بھی گاہکوں کی مزاج شناسی و مزاج داری، امانت و دیانت، محنت وغیرہ سے سابقہ تھا۔ جس کے بغیر تجارت چل نہیں سکتی۔ اور سب متفق ہیں کہ آپ بہت اچھے تاجر تھے۔ پھر جلد ہی کاروانی تجارت میں حصہ لینا پڑا۔ فلسطین، یمن اور عمان جیسے شمالی جنوبی اور مشرقی کالے کوسوں دور علاقوں کا سفر کرنا، اور رومی، ایرانی اور حمیری علاقوں کے انتظامات سے عہدہ برآ ہونا پڑا تھا۔ اور بعض معقول استنباطات صحیح ہوں تو حبش اور بحری سفر سے بھی آپ کو سابقہ رہا ہوگا۔ ایسے جہاں دیدہ اور تجربہ کار شخص ہی کو چالیس سال کی پختہ عمر میں سرداری کے فرائض سپرد کیے جائیں تو اوروں کے مقابلہ میں بہتر ہو سکتا ہے۔

تربیت انسان کے لیے صیقل کا کام دیتی ہے اور جوہر نکھار دیتی ہے دیکھنا اب یہ ہے کہ آپ میں فطری جوہر کیا تھا۔

ہر محتاج کو مدد دینا، حق رسانی میں پیش پیش لیکن حق طلبی میں سب سے پیچھے رہنا، (جیسا کہ آپ کے شرکاء تجارت کی شہادت ہے) سادگی پسند، ملنسار، مخلص، فیاض، محنتی، فرض شناس، پابند وقت، غرض فطرت نے مکارم اخلاق کا آپ کو وافر حصہ دیا تھا۔ یہ چیزیں بچپن ہی سے آپ میں نظر آتی تھیں۔ اور مذکورۂ بالا شدائد و مصائب نے ان کو اتنا مجلا کر دیا تھا کہ نبوت سے پہلے ایک طرف زبان خلق آپ کو الامین کا خطاب دلا کر آپ کی سرداری کو معنوی طور سے تسلیم کرتی ہے تو بقول ابو طالب ۔

ترجمہ: ''وہ گورا چٹا جس کے روئے انور کا واسطہ دے کر بارش کی دعا، مانگی جاتی تھی۔ اور جو تیموں اور بیواؤں کا ملجاو ماویٰ تھا۔ کہہ کر آپ کی انسانی خوبیوں اور فطری وصفوں کی شہادت دی جاتی ہے فرداً فرداً ایسے اوصاف اوروں میں بھی ہو سکتے ہیں۔ اور رہے ہوں گے۔ لیکن ان سب کا اجتماع کسی اور میں نہ تھا۔ اور ضرورت اسی اجتماع کی تھی، جس کے بعد عالمگیر و دائمی نبوت کی خدمت پر مامور کیا جا سکتا تھا۔

ولادت باسعادت

ہمارے اس عالم اسباب میں عمل ہی کسی کو چھوٹا یا بڑا بناتا ہے۔ سکندر و افلاطون کے بچوں سے کوئی واقف نہیں۔ اور نہ سیرز و ارسطو کے والدین سے حقیقی عظمت کا آغاز اکثر غیر متوقع حلقوں ہی سے ہوتا ہے۔

عام حالتوں میں ہمعصر معتقدین و واقفین کی قدر ناشناسی سے ایک ہی دو نسلوں میں قیمتی معلومات ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتے ہیں۔ رسول کریمؐ کے متعلق اُمی عرب میں کون جانتا تھا۔ کہ آپ رحمت عالم ہونے والے ہیں۔ آپ کی نبوی زندگی کا آغاز بھی چالیس سال کی پختہ عمر میں ہوتا ہے۔ جب کہ آپ کے بچپن کے حالات کو دیکھتے ہوئے اور واقف لوگوں میں سے بہت سے ختم ہو گئے تھے۔ ہمعمروں کو بچپن کی باتیں کتنی یاد رہ سکتی ہیں؟ پھر ہمیں قلم و کاغذ

سے قطعاً ناآشنا ملک سے سابقہ ہے۔ خاندانی ڈائریوں اور دوستوں کے روزنامچوں کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

بہر حال ۵۳ ق ھ کا واقعہ ہے (جسے عموماً ۵۷۰ء کے اور کبھی کبھی ۵۷۱ء کے مطابق سمجھا جاتا ہے) کہ سرکار دو عالمؐ کی تشریف آوری سے دنیا کو سرفرازی حاصل ہوئی۔ آپ حمل ہی میں تھے کہ باپ یتیم کر گئے۔ ماں سسرال ہی میں مقیم رہیں۔

صحیح تاریخ ولادت کے متعلق بڑا اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ہماری ضرورتوں کے لیے اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ سنی مسلمانوں میں یوم ولادت ربیع الاوّل کی بارھویں کو منایا جاتا ہے۔

یہ زمانہ سچ مچ عالم آشوب تھا۔ خدا کو اپنے بندوں پر رحم آیا اور ایک رحمت للعالمین پیدا کیا گیا، جو اُن کو وردنگی اور شیطنت سے نکالے اور انسان اور خدا کا سچا بندہ بننا سکھائے۔ آپ کے بچپن کے حالات اپنے ہم شہریوں ہی کی طرح گزرے ہوں گے۔ اور کسی بچے سے کارنامے ہو بھی کونسے سکتے ہیں۔

شرفاء مکہ میں رواج تھا (جو آج بھی وہاں بڑے گھرانوں میں برقرار ہے) کہ بچہ کسی صحرا نشین دودھ پلائی کے سپرد کر دیا جائے اور کئی سال تک جنگل کی کھلی اور آزاد فضا میں پرورش پانے کے بعد گھر واپس ہو۔ یقیناً بچے کو دکھانے کے بہانے لیکن درحقیقت کچھ انعام و امداد حاصل کرنے ہر چند ماہ میں دو چار دن کے لیے دودھ پلائی کے ساتھ ماں کے پاس واپس آتا ہوگا۔

تاریخ اور سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ کو بھی یہی پیش [1] آیا اور آپ کو دودھ شریک کے طور پر ایک بھائی ضمرہ کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ حلیمہ سعدیہ ایک حلیم الطبع بدون تھیں۔ زیادہ حریص و طماع نہ تھیں۔ اور قناعت پسند، ملنسار اور بامحبت

۱۔ ابن سعد (۱/۱ص ۰۷) کے مطابق دودھ پلائی کے سپرد کرتے وقت بی بی آمنہ نے یہ اشعار کہے تھے۔

أعیذ بالله ذی الجلال | من شرّ ما مرّ علی الجبال
حتّی أراہ حامل الحلال | ویفعل العرف الی الموال

وغیرھم من حشوۃ الرجال

تھیں۔ غریب اور بے وسیلہ بھی تھیں۔ بہر حال یہ جانتے ہوئے بھی بچے کو لے لیا کہ بچے کا باپ نہیں ہے، جو دودھ پلائی کی ناز برداریاں کرے۔ اور دادا اگرچہ وجاہت رکھتا ہے لیکن ایک درجن بیٹوں اور اُن کی کثیر ذریت کی پرورش کا ذمہ دار ہونے سے اس پوتے پر واجبی ہی خرچ کر سکتا ہے۔

تاریخیں تو تفصیل نہیں دیتیں۔ لیکن ہم تصور کر سکتے ہیں کہ ایک بدون کی کسی طرح گزرتی ہوگی۔ سال کے مختلف حصوں میں مختلف مقاموں پر خیمہ زنی، دن بھر بچوں کا اونٹ بکریاں چرانا، یا خیمے کے آس پاس آپس میں کھیلنا، عورتوں کا لکڑیاں جمع کرنا، اُون کا تنا، کبھی صرف کھجور اور دودھ پر قناعت کرنا اور کبھی گوشت ترکاری پکانا، اور اسی طرح کی چند سادہ ضرورتیں رکھنا۔

سیرت کی کتابوں میں اس زمانے کے صرف دو ایک ہی واقعے درج ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آنحضرتؐ اپنی رضاعی ماں کا صرف ایک طرف کا دودھ پیتے تھے۔ اور ماں دوسری طرف سے پلانا بھی چاہتی تو نہ پیتے کہ وہ بھائی کا حصہ ہے۔ دوسرا واقعہ یہ کہ جب آپ ذرا اور بڑے ہوئے تو نہ معلوم کس بات پر مچل کر ایک مرتبہ اپنی بڑی دودھ بہن شیماء کو جو آپ کو کھلایا کرتی تھیں کچھ اس زور سے کاٹا کہ ان کے کندھے پر عمر بھر اس کا نشان رہ گیا۔ (اور اتفاقات زمانہ نے اسے شیماء کے حق میں ہی مفید ثابت کیا) ہونہار اور تیز بچوں کی بے قرار طبیعتیں نو عمری میں اس طرح کی معصوم شرارتوں کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ صحراء کی زندگی سے محنت پسندی کی عادت ہونے کے باوجود آپ کی صحت نازک ہی رہی۔ اور خاص کر جب شہر کو آتے تو بیمار ہو جاتے اور دوبارہ جنگل کو جانے پر بھی سنبھلنے میں عرصہ لگتا چنانچہ دودھ پلائی کے ساتھ بسر کرنے کی مدت اسی لیے معمول سے بہت زیادہ رہی۔

بہر حال جب شہر واپس تشریف لائے تو جلدی ہی ماں آپ کو اور خادمہ ام ایمن کو بھی مدینہ ساتھ لے گئیں۔ جہاں بنی النجار کی بستی میں آپ کا ننھیال تھا۔ یہ سفر ممکن ہے کہ شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے ہو سکونت بھی اسی مکان میں رہی جہاں آنحضرتؐ کے باپ کی قبر تھی۔ (اور یہ اب ۱۳۶۹ھ تک مسجد نبوی کے مغرب میں چند منٹ کے فاصلہ پر موجود ہے) مکہ تو

وادیٔ غیر ذی زرع ہے۔ وہاں پانی کہاں؟ مدینے کی شاداب بستی میں بڑے بڑے کنویں تھے۔ چنانچہ آپ نے یہاں پیرا کی اچھی سیکھ لی۔ غالباً یہ گرمی کا زمانہ ہوگا ابن سعد کے مطابق آنحضرتؐ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہ زیادہ یاد ہے۔ بنی النجار کے اُطم (گڑھی) کے سامنے ہم کھیلا کرتے۔ اُطم پر کوئی چڑیا آکر بیٹھتی تو اُسے اُڑانا ہمارا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ہم عمروں میں اُنیسہ نامی ایک لڑکی بھی کھیل میں شریک رہا کرتی۔" جب مہینہ بھر قیام کے بعد واپس ہونے لگے تو ماں کے ساتھ آپ نابغہ سے بھی راستے میں ملے اور اسی کے خیمے میں اُترے۔ (معلوم نہیں یہ قبائل انصار کا کوئی رشتہ دار فرد تھا یا مشہور شاعر) آخر الذکر نے (بروایت ابن حبیب) جاہلیت میں بھی شراب نوشی ترک کر رکھی تھی۔ اگر وہی تھا تو ایسے کردار والے نے کم سن مہمان پر اچھا ہی اثر چھوڑا ہوگا) گو بقول ابن سعد مدینے ہی میں نابغہ کے گھر میں قیام رہا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر چھ سال کی بیان کی جاتی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھریلو واقعہ بیان کرتے چلیں۔ بعد کی زندگی میں رسول اکرمؐ کو یاد تھا کہ آپ کی والدہ سوکھا گوشت (قدید) کھایا کرتی تھیں کہ تازہ ہر روز کہاں ملتا۔ کفایت شعاری اور سلیقہ مندی ہی ہوگی، کہ قربانی، تحفے وغیرہ موقع کا گوشت محفوظ کرتی تھیں۔

مدینے سے واپس ہو رہے تھے کہ اثنائے راہ ابواء کے مقام پر والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور وہیں دفن کیا گیا۔ ماں کو اپنے اکلوتے اور یتیم بچے سے جو اُنس ہوگا وہ ظاہر ہے۔ آپ کو بھی اپنی والدہ سے ان کی شفقت اور اپنی سعادت مندی کے باعث محبت تھی۔ اس نو عمری میں یہ دائمی جدائی جتنی جگر پاش ہوگی ظاہر ہے چنانچہ بڑی عمر میں جب بھی آپ کو ابواء سے گزرنے کا موقع ہوتا تو آپ ماں کی قبر پر بھی ضرور حاضری دیتے۔ اور آپ کا دل بھر آتا۔

جب کسی نہ کسی طرح گھر مکہ واپس پہنچے تو ایک سوا آٹھ سال کی عمر کے بوڑھے دادا کے سوا اور کس کے ہاں آپ رہ سکتے تھے۔ دادا کو اپنے سب سے زیادہ چہیتے بیٹے کی یتیم ودبیر اور واحد یادگار سے یوں بھی محبت ہونی چاہیئے۔ پھر آپ کی سعادت مندی اور اطاعت شعاری اور مستعدی و ذہانت وغیرہ نے سونے پر سہاگہ کر دیا تھا۔ اور درون خانہ کی بے تکلف زندگی ہی میں نہیں، سنجیدہ شہر دارانہ محفلوں میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب دادا قبیلے کے اہل رائے لوگوں کے ساتھ ہم بزم ہوتے اور سرداری اور حاکم عدالت یا پنچ کی حیثیت سے اُن کے لیے مسند

بچھائی جاتی تو اس وقت بھی لاڈلا پوتا ساتھ رہتا۔ اور مسند ہی پر اپنے لیے جگہ چاہتا۔ لوگ منع کرتے اور کسی کونے میں بیٹھنے کو کہتے۔ لیکن دادا فوراً دخل دے کر اپنے بازو کھلا لیتے اور بتاتے کہ بچے میں خود شناسی کا نادر وصف ہے اور "وہ اپنے آپ کو بزرگ سمجھتا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ بہت بڑے مرتبے والا ہوگا" آپ کا ادب تمیز محفل میں پھر کوئی شکایت کا باعث نہ بنتا۔

دادا کو یہاں تک محبت تھی کہ کہتے ہیں ایک مرتبہ خشک سالی میں اپنے اس پوتے کی خوبیوں کا واسطہ دے کر خدا سے بارش کے لیے گڑگڑا گڑگڑا کر التجا بھی کی تھی۔ بروایت ابن سعد وہ تنہا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اور پوتے کو بُلانے کا حکم دیتے تھے۔ (طبقات ۴۷)

دادا کی شفقت وتربیت کومشکل سے دو سال گزرے تھے کہ قدرت کو اس کو آٹھ سالہ دل ودماغ پر ایک اور صدمہ پہنچانا منظور ہوا۔ ابن ہشام وغیرہ نے لکھا ہے کہ آپؐ دادا کے جنازے کے پیچھے روتے جاتے تھے۔

عبدالمطلب نے بستر مرگ پر فیاض وفراخ حوصلہ بیٹے ابو طالب کو وصیت کی تھی کہ اپنے حقیقی مرحوم بھائی عبداللہ کی یادگار کو اپنی کفالت میں لے لیں، اور پوری خبر گیری کریں، نئے سرپرست چچا ابو طالب کا دل تو فراخ تھا۔ لیکن کثیر العیال ہونے سے ہاتھ تنگ تھا۔ پھر بھی وہ اپنے عزیز بھائی کی واحد یادگار کو اس محبت وشفقت سے اپنے گھر لے جاتے ہیں کہ اس کا غم غلط ہو جاتا ہے۔ اور ناخواندہ مہمان کی جو تکلیفیں ایسی صورتوں میں ہوتی ہیں پیش نہیں آتیں۔

آنحضرتؐ کام سے پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اور جب چچا کے گھر کی حالت دیکھی تو اس میں ذرا بھی عار محسوس نہ کی کہ اپنی بساط بھر روزی کمانے میں ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ آپ شہر والوں کی بکریوں کو چرانے لے جاتے تھے۔ اور مقررہ خفیف اُجرت حاصل کرتے تھے۔ بکریوں کے گلّے کو چوپانی سے شفقت، چوکسی اور حکومت کی تربیت مل گئی۔ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ اراک کے وہ پھل کھاؤ جو سیاہ ہو چکے ہوں۔ چوپانی کرتے وقت میں بھی کھایا کرتا تھا۔ (ابن سعد $\frac{1}{1}$ ۸)

مکّہ ایک تجارتی شہر تھا۔ شہر میں مالدار بھی تھے۔ اور وقتاً فوقتاً ان کی خانگی تقریبیں شہر میں چہل پہل پیدا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ کسی ایسی ہی تقریب میں گانے بجانے کا بھی

انتظام ہوا تھا، جو کسی قدر نادر موقع کہا جا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنے ایک ہمکار چرواہے لڑکے سے انتظام کیا کہ وہ ایک دن کے لیے دونوں گلّوں کی رکھوالی کرے (یقیناً دوسرے مواقع پر آنحضرتؐ نے بھی اس طرح ان رفقاء کا کام کیا ہوگا) اور یہ کہ آپ شہر جا کر گانا سُنیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کے دن تھے اور جب آپ شہر پہنچے تو ابھی تقریب کو شروع ہونے میں دیر تھی۔ آپ تقریب گاہ کے باہر سائے میں انتظار میں بیٹھے تو غنودگی سے آنکھ لگ گئی اور جب بیدار ہوئے تو بعد از وقت تھا۔ اس قدرتی سزا کا آپ کے حساس اور غیور دل پر بڑا اثر ہوا۔ اور پھر کبھی اس طرح فرض کی نظر اندازی اور بے سود دل بہلائی سے جی نہ بہلانے کا عہد کر لیا۔

نوعمری

متفرقات

بی بی آمنہ نے اپنے شوہر عبداللہ کی جوانا مرگی پر جو دلدوز مرثیہ کہا تھا اس کے چند شعر نووی ابن سعد ($\frac{1}{1}$ ۶۲) وغیرہ مؤلفوں نے محفوظ کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ کے گھرانے کے مرد ہی نہیں عورتیں بھی ذہنی حیثیت سے کتنا ممتاز اور بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔

بی بی آمنہ نے اپنے مرتے وقت بھی کہتے ہیں کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھ کر چند اشعار پڑھے جو تاریخوں نے نقل کئے ہیں۔ مگر ان کی زبان بعد کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے۔ بی بی آمنہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ عسرت سے زندگی گزارتی تھیں۔ چنانچہ سوکھے گوشت کے کباب کھایا کرنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:۔

آنحضرتؐ کی لوری بھی مشہور ہے جو بی بی حلیمہ دیا کرتی تھیں:۔

یـا رب اذا اعـطیتـه فـابقـه واعـلـمـه الی العلیٰ وارقـه
وادحـض ابـاطیل العدیٰ بـحقـه

ایک لوری آپ کو جو دودھ بہن شیماء سے (جو عمر میں آپ سے بڑی تھیں اور آپ کو کھلایا کرتی تھیں منسوب سیرۃ حلبیہ میں منقول ہوئی ہے۔ مگر اس کے مندرجات عام بچوں

پر صادق نہیں آتے ہیں۔ خاص آنحضرتؐ سے مخصوص معلوم ہوتے ہیں۔ اور ایک جاہل بدوی نوعمر لڑکی سے ایسی لوری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنے گھر کی مروّجہ لوریاں ہی سُنا سکتی تھیں۔

بی بی حلیمہ کی بدویانہ زندگی میں آس پاس کے میلوں کو جایا کرنا عادتی بات ہوگی۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ بھی نوعمری میں سوق عکاظ میں بی بی حلیمہ کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ عکاظ میں خرید و فروخت بھی ہوتی تھی شعر بازی بھی، کشتی کا دنگل بھی لگتا تھا۔ غیب داں نجومیوں کی دکانیں بھی سجتی تھیں۔ بی بی حلیمہ بھی ایک ہذلی عرّاف (غیب داں) کے پاس دل بہلانے پہنچیں۔ وہ بچوں کا زائچہ بتانے سے اختصاص رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے کچھ واہی تباہی باتیں کی ہوں گی۔

آپ کو سات برس کی عمر میں آنکھوں میں تکلیف اور سخت آشوب چشم کا بھی ایک بار پتہ چلتا ہے اور لکھا ہے کہ مکّہ میں علاج ناکام رہا۔ تو لوگوں کے مشورے سے آپ کے دادا عبدالمطلب اپ کو عکاظ لے گئے۔ جہاں قریب میں ایک عیسائی خانقاہ تھی۔ وہاں کے راہب نے آنحضرتؐ کے لیے علاج کا نسخہ تجویز کیا تھا (جیسا کہ ابوالجوزی نے لکھا ہے) قفطی نے اخبار الحکماء میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو بھیج کر حارث بن کلدہ نامی طبیب کو مکّے میں اپنے علاج کے لیے بلایا تھا۔ معلوم نہیں کس زمانے کا ذکر ہے۔

نوعمری میں آپ اتنے ذہین تھے کہ کبھی دادا وغیرہ بزرگ کوئی چیز گھر میں کھو دیتے اور آپ کو ڈھونڈ لانے کے لیے کہتے تھے کبھی آپ خالی ہاتھ واپس نہ آتے۔ ایک دفعہ عبدالمطلب کے کچھ اونٹ کھو گئے۔ بہت کچھ ملازموں سے تلاش کے بعد دادا نے آپ کو بھیج دیا لیکن جب آپ کو واپسی میں دیر ہوئی تو پریشان ہوئے اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے کہ سات آٹھ برس کے بچے کو کس کام پر بھیج دیا۔ اور نہ معلوم اُسے پہاڑوں، وادیوں میں کیا افتاد پیش آئے۔ چنانچہ کعبے کا طواف کر کے خدا سے گڑگڑا کر آپ کی سلامتی کی دعا کی تھی۔ اور کچھ دیر بعد آں حضرتؐ نے آ کر اونٹوں کے ملنے کی اطلاع پہنچائی، تو بوڑھے دادا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اور عہد کیا کہ آپ کو آئندہ ایسے کاموں پر نہیں بھیجیں گے۔

ابن حبیب نے کتاب المحبّر میں لکھا ہے کہ عبدالمطلب مکّے کے اُن چند لوگوں میں تھے جو شراب نہیں پیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے گھرانے میں پلنا نوعمروں کو تاثر پذیر عمر میں بہت سی برائیوں سے خود بخود ہی دُور رکھنے کا باعث تھا۔ اور چچاؤں، پھوپھیوں وغیرہ کی مدہوش بدمستیوں سے جو بُری تربیت ہو سکتی تھی اس سے آپ محفوظ رہے تھے۔

دادا کی وفات پر آپ کی عمر آٹھ سال کی بتائی جاتی ہے۔ پھر چچا ابوطالب نے آپ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ اور ابوطالب کے ہمراہ پہلی مرتبہ آنحضرتؐ کے سفر کا پتہ آپ کی نو سالہ عمر ہی میں چلتا ہے۔ آپ کے مچلنے اور اصرار کرنے ہی پر چچا آپ کو ساتھ لے گئے ہوں گے لیکن سعادت مند نوعمر جتنے چھوٹے چھوٹے بے شمار کام اپنی پھرتی سے کر کے ہاتھ بٹاتے ہیں اس کے باعث ابوطالب کو آپؐ کے ساتھ لینے پر پچھتاوا نہیں ہوا ہوگا۔

اس سفر میں بحیرا راہب سے آنحضرتؐ کی ملاقات بیان کی جاتی ہے۔ ابوطالب مکّے سے چل کر بصری پہنچے (جو بیت المقدس اور دمشق کے مابین اس زمانہ میں ایک اہم تجارتی منڈی اور کاروانی اسٹیشن تھا) یہ علاقہ چونکہ بیزنطینی رومیوں کے قبضے میں تھا اس لیے ہوشیار عیسائی پادریوں نے کوئی تعجب نہیں جو اسے مسیحی تبلیغ کے لیے تاک لیا ہو۔ اور یہاں خانقاہ اور راہب رہتے ہوں جو ہر نو وارد غیر عیسائی سے تپاک سے ملتے اور ان میں اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہوں۔ اوّل تو ایک نو برس کے بچے کی تعلیم و تلقین ہی کیا ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے اس زمانے میں عیسائیوں میں اتنی پھوٹ اور سر پھٹول ہو رہی تھی کہ راہبوں کا آس پاس کی مناظرہ بازی سے اجنبیوں میں تبلیغ کے لیے وقت نکالنا مشکل ہی تھا۔ یوں بھی بحیرا راہب کا ابوطالب اور اُن کے ساتھیوں کو ضیافت پر مدعو کرنا، اور کھانے کے بعد رخصت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کی صحبت نہیں رہی ہوگی۔ اور زیادہ تر سالار کارواں اور معمّر لوگوں ہی سے بات چیت ہو رہی ہو گی۔ گو سب سے کم سن مہمان پر بھی شفقت اور دو چار بچوں کی سمجھ کی باتیں بھی ناممکن نہیں ہیں۔ عرب مؤلفوں کا یہ بیان چاہے صحیح ہو یا نہ کہ بحیرا راہب نے قیافے سے پتہ چلا کر آنحضرتؐ کے متعلق بیان کیا کہ آپ نبی بننے والے ہیں۔ لیکن کاسانوا وغیرہ عیسائی مؤلف یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں عیسائی دنیا میں یہ عام عقیدہ تھا کہ ایک مسیحا اور آخری نبی جلد مبعوث ہونے والا ہے۔ اور سب لوگ اس کے انتظار میں تھے۔ ممکن ہے کہ بحیرا نے بھی

اس کا ذکر کیا ہو۔ عیسائی عقیدہ بہرحال یہ نہیں تھا کہ مسیحا کی آمد حجاز میں ہوگی۔ ان حالات میں بحیرا کی گفتگو سے آنحضرتؐ میں نبی بننے کا شوق پیدا ہونا قرین قیاس نہیں۔

بصریٰ الشام سے واپسی کے بعد دس گیارہ سال تک زندگی کیسے بسر ہوتی رہی ہمارے مؤلف ساکت ہیں۔ بہرحال اعتدال اور شرافت کی زندگی گزارنا، اپنے سرپرست چچا کا ان کے کاروبار تجارت میں ہاتھ بٹانا اور شہری زندگی میں عفاف اور غریب نوازی کے شہرے کے ساتھ شریک رہنا فرض کر لیا جائے ابن سعد کے مطابق ابوطالب کے گھر میں بچوں کا ناشتہ جب آتا سب مل کر "لوٹ لیتے" لیکن جب چند مرتبہ دیکھا کہ یتیم بھتیجا اس لوٹ میں شریک نہیں رہتا تو پھر آپ کا ناشتہ الگ اور مستقل دیا جانے لگا۔ نوعمری میں یہ سنجیدگی مستقبل کی شخصیت کی خمیر کا پتہ دے کر اپنی وقعت ابھی سے پیدا کرانا شروع کر چکی تھی سیرۃ حلبیہ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابوطالب نے مکّے والوں کی ایک بت پرستانہ عید میں حصّہ لینے کے لیے آپ کو بہت بُرا بھلا کہہ کر مجبور کیا لیکن کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ ابوطالب نے پھر کبھی آپ کو اس پر مجبور نہیں کیا۔ کلبی کی کتاب الاصنام کا واقعہ بھی غالباً اسی موقعہ کا جز ہے کہ آنحضرتؐ نے جاہلیت میں ایک بُھوری بھیڑ قربانی دی تھی۔

اس کے بعد عالم نوجوانی میں چند واقعات ملتے ہیں جن سے۔

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

تنبیہ

ابھی اوپر سیرۃ حلبیہ کے حوالے سے زمانہ جاہلیت کی جس جاترا کا ذکر کیا گیا، اس کی کچھ مزید تفصیل رسول اکرمؐ کی کھلائی بی بی ام ایمن کی ایک روایت میں ملتی ہے۔ (جو اگرچہ واقدی کے حوالے سے نقل ہوئی ہے لیکن وہ قرین قیاس ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ واقدی کی ہر بات غلط ہی ہو) اور وہ یہ ہے کہ یہ بُوانہ نامی بُت کی سالانہ تقریب تھی۔ لوگ اس کی پوجا کے بعد سر منڈاتے تھے۔ جب وہاں جانے سے سال بسال آنحضرتؐ نے انکار کیا تو ایک سال ابوطالب بھی خفا ہوئے اور پھوپھیاں بھی۔ اور کہا کہ اپنی قوم کی عید میں شریک نہ ہونا اور مجمع کو

بڑھانے میں حصہ نہ لینا بڑی بُری بات ہے۔ اور پھوپھیاں اتنی بضد ہوئیں کہ آنحضرتؐ بھی ساتھ جانے پر آمادہ ہوئے۔ اور پھر غیبی حوادث پیش آئے وغیرہ۔ اور یہ سب نوعمری اور زمانہ جاہلیت کا واقعہ ہے۔ اور بصداے آیت "ماکنت تدری ماالکتب و الایمان" (سورہ شوریٰ آیت نمبر۵۲) کبھی نبی بننے سے پہلے پیش بھی آیا ہو تو ناممکن نہیں ہے۔

نوجوانی

حرب فجار

اہل عرب نے اپنی آمدنی کے پُرامن وسائل میں ایک محصول درآمد یا عشر بھی قائم کر رکھا تھا۔ اور میلوں جاتراؤں میں جو لوگ تجارتی سامان فروخت کے لیے لاتے اس کا دسواں حصّہ (عُشر) میلے کے مقام کے سردار کو ملتا۔ زیادہ لوگوں کو آنے اور زیادہ سامان لانے کی تشویق دلانے کے لیے قدیم زمانے سے انہوں نے حرام مہینوں کا ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ مختلف قبائل کی یہ تقریبیں مختلف زمانوں میں ہوتی تھیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میلے سے پندرہ دن پہلے اور پندرہ دن بعد جملہ ایک مہینہ "حرام" سمجھا جاتا تھا جس میں انتقام جوئی اور معمولی قتل ولوٹ ناجائز سمجھے جاتے تھے۔ اور دشمن بھی امن وامان سے بازو سے گزر سکتا۔ قبائل مضر رجب کے مہینہ کو حرام سمجھتے۔ قبائل ربیعہ کا کوئی اور زمانہ تھا[1]۔ اور کعبے کے حج اور منا کے میلے کے سلسلے میں تین مہینوں کا زمانہ حرام سمجھا جاتا تھا۔ یعنی ذی القعد، ذی الحجہ اور محرم

ان حرام مہینوں کی کبھی حرمت شکنی ہو جاتی تو اسے فجار یعنی بُرا کام سمجھا جاتا۔ آنحضرتؐ کے زمانہ ماقبل نبوت میں ایسے چار واقعے بیان کئے جاتے ہیں جن میں سے بظاہر دو کے وقت آپ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اُن ہنگاموں کے وجوہ واسباب سے یہاں بحث نہیں۔ وہ عام جاہلی ہنگامے ہیں۔ کبھی قرضے کی ادائیگی میں ٹال مٹول، کبھی کسی عورت سے چھیڑ چھاڑ، کبھی ذاتی لن ترانیاں اور کسی غیر قبیلے والے کے جواب پر خفگی اور کبھی حرام مہینوں کی تازہ حرمت شکنی کا انتقام وغیرہ۔

۱۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے کسی حوالے سے رمضان لکھا ہے۔

عرب میں ابوبراء ملاعب الاسنہ نامی ایک مشہور نیزہ باز تھا۔ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ایک حرب فجار میں بڑی بہادری سے اس کو نیزہ مارا تھا۔ ابن ہشام نے چوتھے فجار کے متعلق لکھا ہے۔ کہ آنحضرتؐ اُن تیروں کو روکنے میں حصہ لیتے جو آپ کے چچاؤں پر اُن کے دشمن نشانہ لگا کر چلاتے تھے۔ ابن سعد نے اس وقت آنحضرتؐ کی عمر بیس سال بتائی اور آپ کا یہ جملہ نقل کیا ہے کہ "میں تب وہاں اپنے چچاؤں کے ساتھ شریک تھا اور کچھ تیر بھی چلائے اور مجھے پسند نہیں ہے کہ میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔"

حِلف الفضول

چوتھے فجار میں بنی ہاشم کے سردار زبیر بن عبدالمطلب تھے جیسا کہ ابن حبیب نے لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ خوں ریزی زیادہ ہوئی تھی۔ اور بات بھی زیادہ معمولی تھی۔ چنانچہ قریش اس پر پشیمان ہوئے اور جلدی ہی ایک نیا واقعہ پیش آیا۔ جس کا ذکر نیچے آئے گا) تو فجار کی لڑائی میں جو قریشی سردار شریک ہوئے تھے۔ خاص کر زبیر بن عبدالمطلب (آنحضرتؐ کے چچا) اور قبیلۂ تیم کے عبداللہ بن جدعانے اہلِ شہر کو اُس "حِلف الفضول" کے تازہ کرنے کی دعوت دی، جو جرہمی دور میں (قصی کے مکے پر قبضہ سے پہلے) پایا جاتا تھا۔ اور یہ حرب فجار کے چند ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔

ابن قتیبہ نے جرہمی دور کے اس ادارے کو جو مختصر توضیح کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند افراد نے ایک انجمن امداد مظلومین قائم کی تھی اور اس میں شریک ہونے والے رضا کار متحدہ طور سے اپنے شہر میں ظالموں کا ہاتھ روکتے اور مظلوموں کو اُن کا حق دلاتے۔

حرب فجار کے بعد عبداللہ بن جدعان کے مکان میں لوگ ضیافت کی دعوت پر جمع ہوئے۔ وہ بہت بوڑھا اور بااثر بھی تھا۔ اور بعض دفینوں کے ملنے سے بڑا مال دار بھی تھا۔ اور غالبًا اسی کا مکان سب سے کشادہ تھا۔ بہر حال اصل محرک کون تھا۔ اس بارے میں سہیلی وغیرہ ہمارے مورخ ایک قصہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اسی زمانے میں ایک زبیدی (یمنی) تاجر نے مکے میں اپنے ادھار بیچے ہوئے سامان کی قیمت وصول نہ ہو سکنے اور ہر کوشش کو ہارنے پر کچھ دل جلے طنز و ہجو کے شعر کہے۔ زبیر بن عبدالمطلب کو اس سے دل پر چوٹ لگی۔

اور انہوں نے ایسی رضا کار جماعت کی تحریک کی۔ زبیر نے اس انجمن کی تعریف میں بہت سے اشعار بھی کہے ہیں جو سہیلی نے نقل کئے ہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ محرک یہی ہوں۔ ا درمحض ان کی کم سنی اور کم مالی کی وجہ سے ابن جدعان کی سرپرستی حاصل کی گئی ہو اور اس کے گھر میں جلسہ طلب کیا گیا اور حسب عادت ضیافت ہوئی ہو۔ (عبداللہ بن جدعان کے قبیلۂ) تیم کے بنی ہاشم کے معززین بھی جمع ہوئے۔ اور بنی عبدالمطلب، بنی زہرہ، اور ایک روایت میں بنی حارث بن مہر کے بھی۔ اور ان سرداروں نے حلف اُٹھا کر اقرار کیا کہ وہ حدود شہر مکہ میں کسی کو کسی پر ظلم کرنے نہ دیں گے۔ اور مظلوم کو متحدہ امداد دے کر ظالم سے اس کا حق دلائیں گے۔

ابن ہشام اور حُمیدی وغیرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان کی روایت کی ہے کہ "میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں حلف لینے شریک تھا۔ اور سُرخ اونٹوں کے گلے کے عوض بھی اس شرکت کے اعزاز سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا، اور اگر اب زمانۂ اسلام میں بھی مجھے کوئی اس کی دُہائی دے کر پکارے تو اس کی مدد کو دوڑ دوں" انہوں نے حلف اس پر لیا تھا کہ حقوق ان کے مالکوں کو دلائے جائیں اور کوئی ظالم کسی مظلوم پر دست درازی نہ کرے۔

مکے والوں کو اس پر بجا طور سے فخر ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں باقی عرب بلکہ باقی دنیا میں لاٹھی راج کا دور دورہ تھا، اس وقت انہوں نے رضا کارانہ امداد مظلومین کے لیے اپنی جتھا بندی کی، اور تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے رات کی بات دن ہوتے ہوتے بھلا نہ دی بلکہ ہمیشہ اس کی لاج رکھی۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کی دُہائی سے ابوجہل وغیرہ بڑے بڑے سرغنے تھراتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زمانۂ اسلام میں ہجرت سے قبل بعض وقت اس میں موثر عملی حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ابن ہشام میں بیان ہوا ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ اسے مستقل ادارہ بنانے اور وقت بہ وقت نئے ارکان کو بھرتی کرنے کی جانب توجہ نہیں کی گئی جس کے باعث ایک ہی نسل کے بعد یہ انجمن ختم ہو گئی۔ یوں بھی اسلام آ جانے کے باعث اس کی زیادہ ضرورت بھی نہ رہی۔ حلف الفضول میں شریک ہونے والوں نے جو حلف لیا وہ یہ تھا:۔

خدا کی قسم ہم سب مل کر ایک ہاتھ بن جائیں گے اور وہ مظلوم کے ساتھ رہ کر اس وقت تک ظالم کے خلاف اُٹھا ہوا رہے گا تاکہ آنکہ وہ (ظالم) اس (مظلوم) کو حق ادا نہ کر دے اور یہ اس وقت تک جب تک کہ سمندر گھونگوں کو بھگوتا رہے اور حراء وثبیر کے پہاڑ اپنی جگہ قائم رہیں اور ہماری معیشت میں مساوات رہے گی۔

اس کا آخر فقرہ بھی غور طلب ہے۔ مورخ ساکت سے ہیں کہ اس کا منشا کیا تھا۔ بہر حال یہ تو یقین ہے کہ مدد کو جانے والے جب اپنی جان سے حاضر تھے تو اپنے مال کی کیا پروا کرتے ہوں گے۔

تجارت

شہر مکہ ایک "وادیٔ غیر ذی زرع" میں آباد ہے۔ اس لیے یہاں والوں کے لیے کسی کھیتی باڑی کا کوئی سوال نہیں۔ صنعت کچھ ضرور ہوگی۔ لیکن اس کے لیے خام سامان باہر ہی سے لانا ہوتا ہوگا۔ اس لیے تجارتی کاروبار ہی اصل ذریعۂ معاش سمجھنا چاہیئے۔

خاندان بنی ہاشم میں کسی صنعتی پیشے، دستکاری کا ذکر مورخ نہیں کرتے ہیں۔ تجارت میں کپڑے غلے، چمڑے، خشک میوے، اسلحہ، عطر اور سنگار کا سامان ہی اہم شعبے تھے بظاہر اوّل الذکر دو شعبوں ہی سے آنحضرتؐ کے خاندان کو تعلق تھا۔

کاروانی کاروبار میں عام طور پر سو فی صدی نفع کا مؤلف ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ایک تو اُس کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی۔ اور دوسرے جوکھم بھی کافی رہتا۔ کئی ہفتوں کے مسلسل کوچ میں کچھ نہ کچھ اونٹ تھکن سے مر جاتے۔ دورانِ سفر میں اپنے اور جانوروں کے کھانے چارے کے اخراجات بھی گھر سے لازماً بڑھ جاتے محافظ دستہ الگ ساتھ لینا پڑتا۔ کیونکہ بیسیوں قبائل کی سرزمین سے گزرنے میں دشمنوں کے علاوہ اتفاقی رہزنوں کا بھی خطرہ رہتا۔ اس لیے کاروانی کاروبار اکثر سرمایہ مشترکہ کے اصول پر ہوتا۔ یعنی ایک تو کئی کئی لوگ مل کر نکلتے اور پھر ہر شخص اپنے علاوہ دوست احباب وغیرہ کا سامان نصف نفع میں شرکت یا کسی ایسی ہی شرط پر ساتھ لیتا۔ اور جتنا زیادہ سامان ساتھ ہوتا اتنا ہی سفر کے نقصان اور مصارف کی پابجائی ہو کر کچھ نفع بچ رہنے کا امکان ہوتا۔

نو دس سال کی نوعمری میں چچا کے ساتھ دادا کی وفات کے ایک ہی سال بعد کاروانی سفر میں آنحضرتؐ کا فلسطین جانا بیان ہو چکا۔ اس کے بعد پچیس سالہ عمر سے قبل مکرر کسی سفر کا مورخ ذکر نہیں کرتے۔ اس کے معنے یہ تو نہ ہوں گے کہ آنحضرتؐ یہ پورا عرصہ بیکار اور اپنے چچا پر بار رہے۔ بلکہ حضری تجارت میں مشغول رہے ہونگے۔ یقیناً چچا کی کوئی دکان شہر میں ہوگی اور اس میں آپ بھی وقت دیتے ہونگے۔ اس کے بھی پتہ چلتا ہے کہ مختلف سالوں میں جب دیگر لوگ کارواں لے کر جاتے تو آنحضرتؐ اپنا سامان اُن کے سپرد کرتے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک شخص (قیس بن السائب) سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بہتر ساجھی کوئی نہ پایا۔ اگر ہم ان کا سامان لے کر جاتے تو واپسی پر وہ ہمارا استقبال کر کے صرف ہماری خیر وعافیت پوچھتے اور چلے جاتے۔ اور بعد میں حساب دینے پر قطعاً تکرار اور حجت نہ کرتے۔ حالانکہ دیگر لوگ سب سے پہلی بات صرف اپنے مال کی کیفیت کے متعلق پوچھتے۔ اس کے برخلاف اگر خود وہ ہمارا سامان لے کر جاتے تو واپسی پر جب تک پائی پائی بیباق نہ کر لیتے گھر تک نہ جاتے۔ اور اسی لیے ہم میں وہ الامین (امانت دار و دیانت مند) کے لقب سے معروف تھے۔"

طبری نے امام زہری کے حوالے سے ایک روایت کی ہے کہ "بی بی خدیجہ نے آنحضرتؐ اور قریش کے ایک اور شخص کو اُجرت پر سُوق حباشہ بھیجا جو تھامہ میں ہے مکے کے جنوب میں چھ دن کے راستے پر یمن کے رُخ حباشہ کاروانی راستے پر ایک مشہور مقام تھا۔ اور وہاں کا میلہ جو رجب میں تین دن لگتا تھا فلسطین کے مقابلے میں یہ قریب اور سہل الوصول بھی تھا۔ ابن سیدالناس کی روایت میں بی بی خدیجہ نے آپ کو دو مرتبہ جرش بھی سامان دے کر بھیجا اور ہر دفعہ معاوضے میں ایک اونٹ دیا۔ اگر یہ جُرش ہے تو وہ مکے کے جنوب میں طائف سے کچھ آگے یمن کے رُخ ایک اہم قلعہ بند شہری مملکت تھی۔ اور وہاں بڑا بازار لگتا تھا۔ اور اگر جرش ہے تو وہ شرق اردن میں ایک بڑا یونانی شہر تھا۔ ممکن ہے کہ ان سفروں کی کامیابی اور آنحضرتؐ کی خوش معاملگی ہی نے بی بی خدیجہ کو اس پر آمادہ کیا ہو کہ آنحضرت کو اپنا سامان تجارت دے کر دور دراز علاقۂ فلسطین روانہ کریں۔ بی بی خدیجہ بیوہ تھیں۔ تقریباً چالیس سال کی عمر تھی دولت مندی میں شہر میں اُن کی ٹکر کی عورتیں تو کیا مرد بھی کم تھے۔ وہ تاجرہ کہلاتی تھیں اور طاہرہ کے لقب سے معروف ہونا بیان کی جاتی ہیں۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو طالب ہی نے آنحضرتؐ سے کہا تھا کہ ''بیٹا کئی سال کی قحط سالیوں سے ہمارا حال خراب ہے۔ ہمارے پاس نہ سرمایہ ہے اور نہ مال تجارت کہ اپنا کاروبار کریں۔ تم خدیجہ سے جا کر کہو تو ممکن ہے کہ وہ اپنا کچھ سامان تمہاری تحویل میں بھی کرے'' غالباً یہ اولین سفر حباشہ ہی کے موقع کا واقعہ ہے۔ اگرچہ راوی اسی کو سفر فلسطین سے متعلق کرتے ہیں۔

بہر حال ایک قریشی کارواں جب شام جانے کے لیے تیار ہوا تو بی بی خدیجہ نے اپنا بہت سا سامان آنحضرتؐ کی تحویل میں دیا۔ اور ساتھ اپنے غلام میسرہ کو (خدمت کے لیے) اور اپنے ایک رشتہ دار خزیمہ کو بھی کر دیا۔ خزیمہ کی موجودگی ممکن ہے کہ کاروبار سیکھنے یا آنحضرتؐ کو سکھانے کے لیے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مال کی نگرانی کے لیے ہو۔

اس سفر میں بھی آنحضرتؐ کے بُصریٰ الشام تک جانے کا پتہ چلتا ہے۔ راستے میں بحیرۂ مردار پڑتا ہے۔ جو ممکن ہے آں حضرت نے دیکھا ہو۔ اور نسطورا راہب سے (جو غالباً نسطوری فرقے کا تھا) ملاقات بیان کی جاتی ہے۔ راہبوں کے کاروانوں سے ملنے کی وجہ اوپر بیان ہو چکی ہے۔ لکھا ہے کہ ایک دن بی بی خدیجہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے مکان کے اوپر کی منزل میں بیٹھی تھیں کہ ایک کارواں دُور سے شہر کی طرف آتا نظر آیا۔ اور یہ آنحضرتؐ ہی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی مکّے میں کئی کئی منزلہ مکان ہوتے تھے، جو شہر کی گرم آب و ہوا کے باعث ضروری بھی تھے۔

مورخ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے حُسنِ انتظام اور دیانت سے بی بی خدیجہ کو توقع سے دُگنا نفع ملا تو بی بی نے آنحضرت کو بھی وعدے سے دُگنا معاوضہ خوش ہو کر دیا۔ اصل وعدہ کہتے ہیں کہ ''دو اُونٹنیوں'' کا تھا۔ (دو اُونٹ بھر سامان یا دو سادہ اونٹ معلوم نہیں)

ابن سعد سے معلوم ہوتا ہے کہ مکّے میں وقتاً فوقتاً آنحضرتؐ بی بی خدیجہ سے ملنے جاتے تھے جو آپ کو بہت چاہنے لگی تھیں۔ اور کسی وقت اپنی سہیلیوں میں بیٹھی ہوتیں اور آنحضرت آتے تو آپ سے بھی ضرور ملتیں۔ ان سماجی ملاقاتوں میں اور امور کے ساتھ معاشی و کاروباری امور پر بھی گفتگو ہوتی ہوگی۔

ابوداؤد وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ بعثت سے قبل ایک مرتبہ کسی کاروبار کے سلسلے میں عبداللہ بن الحماس ؓ نے آپ سے کہا تھا کہ ذرا ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں، پھر بھول گیا۔ تین دن کے بعد اتفاقاً اِدھر سے گزرا تو آنحضرتؐ سڑک ہی پر منتظر تھے۔ بات کا آپ کو اتنا پاس تھا۔ اخلاق کا کیا ٹھکانا کہ پھر بھی اُسے کچھ بُرا بھلا نہ کہا۔

مسند امام احمد بن حنبل (ج ۴ ص ۲۰۶) میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ مشرقی عرب یعنی بحرین کے (جسے آج کل الحساء کہتے ہیں) قبیلۂ عبدالقیس کا ایک وفد آنحضرت کی زندگی کے اواخر میں مدینہ آ کر باریاب ہوا۔ اور آنحضرتؐ نے اُن سے اُن کے ملک کی بعض تفصیلیں بیان کر کے کیفیت پوچھی تو وہ لوگ حیران ہوئے کہ آپ کو اس علاقے کا اتنا گہرا علم کیسے ہوا۔ اس پر کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے یہ فرمایا کہ میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ مشقّر اور وبا کے شہرۂ آفاق میلوں وغیرہ میں بھی آنحضرتؐ شاید تجارتی کاروبار کے سلسلے میں گئے ہیں اور ممکن ہے کہ یہ بی بی خدیجہ کے کارندے ہی کی حیثیت سے ہو۔ مگر اس کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں۔ ممکن ہے شادی کے بعد بھی اپنی بیوی کا سامان لے کر آنحضرت کاروبار کے لیے جاتے رہے ہوں۔

آنحضرتؐ نے نبوت کے ابتدائی سالوں میں (ہجرت مدینہ سے قبل) جب اپنے ساتھیوں کو حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت دی تو اپنے چچازاد بھائی جعفر طیار کو نجاشی کے نام ایک تعارفی خط بھی دیا تھا، جسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ اس خط کا انداز ایسا ہے جو کسی متعارف شخص کے نام ہی ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ پھر اس وقت آنحضرت کا یہ فرمانا کہ ''وہ ایک ایسے بادشاہ کا ملک ہے جس میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا'' نیز حدیث میں آنحضرتؐ سے ایک سے زیادہ حبشی الفاظ کا مروی ہونا یہ سب اس بات کے قیاس کا موقع دیتے ہیں کہ غالباً آپ نے کبھی حبشہ کا بھی سفر کیا تھا۔ اور نجاشی سے ملاقات بھی کی تھی۔ (جس کا موقع حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ کو بھی اسلام سے قبل ملا تھا) حبشہ جانے کا سہل راستہ تو وہی تھا جو مہاجرین اسلام نے اختیار کیا تھا کہ شعیبہ (جدہ) میں جہاز پر سوار ہو کر بحر احمر کے دوسرے ساحل پر جا اُتریں۔ دوسرا رستہ یہ تھا کہ ایلہ (عقبہ) اور جزیرہ نمائے سینا یا شاید غزہ سے ہو کر (جہاں آنحضرتؐ کے پردادا مدفون بھی ہیں) مصر اور پھر وہاں سے دریائے نیل کے کنارے کنارے حبشہ جائیں۔

دریا کے بہاؤ کی سہولت کے باعث حبشہ سے مصر کشتی میں آنا بھی ممکن ہے اگر یہ قیاس و استنباط بے جانہ سمجھا جائے تو آنحضرتؐ کے بحری سفر کا بھی اس طرح امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ قرآن مجید کے اولیں مخاطب آنحضرتؐ تھے۔ اس لیے شام کے "جنّتٌ تجری من تحتها الانهار" اور سمندری سفر کے فوائد و خطرات کا قرآن میں بار بار اور تفصیلی ذکر آنا بے وجہ نہیں سمجھا جا سکتا (قطع کلام کے طرز پر عرض کرتا ہے کہ باغوں میں نہروں کا بہنا ہم ہندیوں کو سمجھ میں آتا ہے۔ باغوں کے "نیچے سے" نہروں کا بہنا کم از کم مجھے شام جا کر مشاہدہ کرنے سے پہلے سمجھ میں نہ آسکا تھا)

بحری سفر وغیرہ کی خیال آرائیاں سیرت نگاروں کی شان میں بے ادبی بالکل نہیں۔ اسلام سے پہلے کے ان واقعات کے واقف اگر حدیث صحیح ہونے کے دور سے قبل فوت ہو چکے ہوں تو تاریخ (انسانی کے لیے کونسی نادر بات ہے؟ "سیروفی الارض" کا قرآن میں حکم دس پندرہ جگہ آیا ہے۔ جو ذات ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے وہ خود اس تعلیم کی تعمیل کر چکی ہو تو اس میں قباحت تو کوئی نہیں معلوم ہوتی۔

شادی خانہ آبادی

جب آپ کی عمر پچیس (۲۵) سال دو مہینے دس دن کی ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی سے عقد کیا۔ حضرت خدیجہؓ ایک حسین اور دولت مند عورت تھیں۔ بہت سے سردارانِ قریش ان کے ساتھ عقد کے خواہش مند تھے مگر انہوں نے سب سے انکار کر دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت، دیانت اور صداقت کا مکہ میں شہرہ ہوا۔ اور آپ کی پاک بازی کا ہر جگہ ذکر ہونے لگا تو یہ خبریں حضرت خدیجہؓ کو بھی ملیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ حضرت خدیجہؓ کے بھائی یعنی عوام بن خویلد کی زوجہ تھیں اُن سے تمام حالات ذاتی اُن کو معلوم ہوئے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کو رغبت پیدا ہوئی۔ مزید امتحان کی غرض سے اپنا مال تجارت دے کر اپنے غلام میسرہ کے ساتھ تجارت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے شام بھیجا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت اور صفات عالیہ کا اُن کو بہت ثبوت ملا اس لیے انہوں نے نفیسہ بنت امیہ

یعنی اُخت یعلےٰ بن اُمیہ کے ذریعہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا۔ ابنِ اسحاق لکھتے ہیں کہ بُلا کر بالمشافہ بھی بات پختہ کی۔ اس موقعہ پر اس پسند کی جو وجہ اُنہوں نے بیان کی ہے وہ خود اُن کے الفاظ میں یہ ہے۔ یعنی میں نے آپ کی صداقت اور اچھے اخلاق کی وجہ سے آپ کو پسند کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اطلاع خواجہ ابو طالب کو دی۔ انہوں نے اس کو نہایت خوشی سے منظور کیا۔ پھر بنی ہاشم اور روساءِ مُضر کو لے کر حضرت خدیجہؓ کے مکان پر گئے اور نکاح ہوا اس نکاح کے وقت خواجہ ابو طالب نے نہایت بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ اُس وقت آپؐ کے بزرگوں کا آپؐ کے متعلق کیسا خیال تھا اور آپؐ کے عادات و اطوار نے اِن پر کیا اثر ڈالا تھا۔ خواجہ ابو طالب کے خطبہ کہ یہ الفاظ ہیں:

> "حمد و ثنا اُسی خدا کے لیے ہے جس نے ہمیں ابراہیم کے فرزند اور اسمٰعیل کی ذریات میں بنایا۔ ہمیں مَعد و مُضر کے پاک اصل سے باہر لایا۔ اپنے گھر کا نگہبان اور اپنے حَرم کا پیشوا بنایا۔ ایسا گھر ہمیں عطا فرمایا کہ اطراف و جوانب کے لوگ اس کی زیارت کے قصد سے آتے ہیں۔ ایسا حرم عنایت فرمایا کہ جو شخص وہاں آ جائے امان میں ہو جاتا ہے اور ہمیں لوگوں پر حاکم مقرر کیا۔ اما بعد یہ میرے بھائی کا لڑکا محمد بن عبداللہ ہے۔ یہ ایک ایسا جوان ہے کہ قریش کے کسی شخص کا اِس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ کہ یہ اس سے بڑھا رہے گا۔ ہاں مال اس کے پاس کم ہے۔ لیکن مال ڈھلتی چھاوں ہے۔ اور ایک چیز بدلنے والی ہے۔ محمدؐ وہ شخص ہے جس کی میرے ساتھ قرابت و یگانگت کو تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ خدیجہ بنت خویلد کو چاہتا ہے اور میرے مال میں سے بیس اونٹ مہر مقرر کرتا ہے۔ اور اس کا مستقبل خدا کی قسم عظیم الشان اور جلیل القدر ہے۔"

جب خواجہ ابو طالب کا خطبہ تمام ہوا تو ورقہ بن نوفل نے بھی جو حضرت خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی تھے خطبہ پڑھا۔ اُن کے خطبہ کا مضمون یہ ہے:

حمد و ثنا خدا کے لیے ہے جس نے ہمیں ویسا ہی بنایا جیسا کہ اے ابوطالب آپ نے ذکر کیا۔ اور ہمیں وہ تمام فضیلتیں عطا فرمائیں جن کو آپ نے شمار کیا۔ پس ہم لوگ تمام عرب کے پیشوا اور سردار ہیں۔ اور آپ لوگ تمام فضائل کے اہل ہیں۔ کوئی جماعت آپ کے فضائل کا انکار نہیں کر سکتی۔ اور کوئی شخص آپ کے فخر و شرف کو رد نہیں کر سکتا۔ اور بے شک ہم لوگوں نے نہایت رغبت سے آپ کے ساتھ شامل ہونے اور ملنے کو پسند کیا۔ پس اے قریش گواہ رہو کہ خدیجہ بنت خویلد کو میں نے محمدؐ بن عبداللہ کی زوجیت میں دیا۔ چار سو (۴۰۰) مثقال کے بدلے۔

خواجہ ابوطالب نے فرمایا کہ اے ورقہ! عمر بن اُسد موجود ہیں میں بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ بھی آپ کے بیان میں شریک ہوں۔ عمر بن اُسد نے کہا کہ میں نے خدیجہ بنت خویلد کو محمدؐ بن عبداللہ کی زوجیت میں دیا۔ اس پر طرفین سے ایجاب وقبول ہو گیا۔

نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس (۴۰) سال کی تھی۔ بیوہ تھیں اس سے پہلے ان کے دو نکاح ہو چکے تھے۔ ایک ابی ہالہ بن زرارہ تمیمی سے اس سے دو اولاد ہوئی تھی ہند بن ابی ہالہ اور زینب بنت ابی ہالہ۔ اس کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی سے۔ اس سے بھی دو اولاد ہوئی تھیں عبداللہ بن عتیق اور ایک لڑکی۔

سماجی اور شہری زندگی

شادی کے بعد

بی بی خدیجہ کو ان کے دونوں متوفی شوہروں سے جو بچے تھے وہ غالباً عرب کے رواج کے مطابق بی بی کے سُسرالوں میں رہ گئے ہوں گے خاص کر اس لیے کہ بی بی کے اس نکاح کے وقت ان بچوں کی عمریں کافی بڑی ہوں گی۔ بہرحال آنحضرتؐ کی گھریلو زندگی میں ان سوتیلے بچوں کا کوئی خاص ذکر نہیں آتا۔ اگرچہ یہ قیاس کر لیا جا سکتا ہے کہ آپ کا برتاؤ اُن کے ساتھ انتہائی محبت اور شفقت ہی کا رہا ہو گا۔

رضاعی ماں سے بھی آپ کو ہمیشہ محبت رہی۔ چنانچہ سہیلی نے (ص ۱۱۱) میں لکھا ہے کہ آپ کی شادی کے بعد بھی آپ کو ایک مرتبہ بڑھی دودھ پلائی آئی۔ اور اس مرتبہ نئی دُلہن بی بی خدیجہؓ نے خاص سلوک کیا۔ اور کئی اونٹنیاں عطا کیں جن کو لے کر حلیمہ سعدیہ دُعا دیتی رخصت ہوئیں۔ ابن سعد (۲؍۱ص ۱۷) ابن سعد کے مطابق بی بی حلیمہ نے قحط سالی کی شکایت کی تھی۔ اور چالیس بکریاں اور ایک اونٹ بی بی نے عطا کیا تھا۔

آپ کی گھریلو زندگی کا یہ دور کتنا خوشگوار تھا، اس کا اندازہ نہ صرف اس سے ہوتا ہے کہ دس سال کے عرصہ میں چھ سات بچے ہوئے بلکہ اس سے بھی کہ بی بی خدیجہ کی وفات کے بعد آنحضرت اُن کے جس قدر اور جس پیرائے میں ذکر فرماتے تھے اس سے آپ کی سب سے چہیتی بیوی بی بی عائشہؓ تک کو بھی بڑا رشک ہوتا تھا۔

حدیث کی کتابوں میں اس کا خاص تفصیل سے ذکر ہے کہ آنحضرتؐ جب گھر میں رہتے تو بیوی بچوں سے کس قدر پیار اور محبت سے پیش آتے، ان کا دل بہلاتا، ان کی سمجھ کے

مطابق ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ ایثار و خیرات کی تربیت دیتے رہنے اور صحیح معنوں میں شریک زندگی بنا آپ کا شیوہ تھا۔

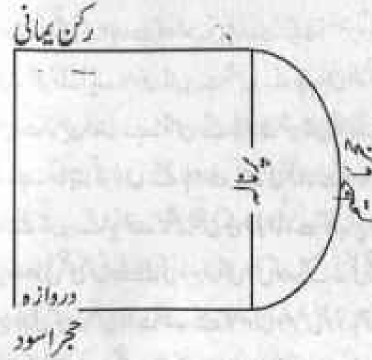
شادی کے بعد لیکن نبوت سے پہلے پندرہ سالہ زندگی کس طرح گزری اس کا اندازہ ایک سب سے زیادہ واقف کار اور عینی شاہد کے چند جملوں سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نبوت کے ابتدائی زمانے میں ذات امی لقب کو گھبراہٹ سی تھی تو اس وقت آپ کو تسلی دیتے ہوئے آپؐ کی بیوی بی بی خدیجہؓ فرمایا کرتی تھیں۔ ''اندیشہ مت کرو اللہ تعالیٰ تم کو آفات میں نہ ڈالے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بجز نیکی کے اور کچھ نہ کرے گا۔ کیونکہ تم صلۂ رحم کرتے ہو اور عیال کا بار اُٹھاتے ہو اور کسب کرتے ہو اور مہمانوں کی ضیافت اور حق کے کاموں پر لوگوں کی اعانت کرتے ہو، اور یتیم کو جگہ دیتے ہو، اور راست بات کہتے ہو، اور امانت میں خیانت نہیں کرتے ہو اور عاجزوں کی دستگیری کرتے ہو، اور فقیروں کے ساتھ نیکی اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کرتے ہو۔''

اس اقتباس سے علاوہ اور خصوصیات کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسب معیشت بھی کرتے تھے۔ اور محض مالدار بیوی کی دولت کھا کر گزارا کرنا بالکل پسند نہ فرماتے تھے۔ بعض روایتوں میں غلے کے بیوپار کا پتہ چلتا ہے۔ ممکن ہے آپ کسی اور بیوپاری کے شریک کار رہے ہوں۔

اس زمانے میں طبری کے مطابق مکے میں ایک بار قحط پڑا۔ اور ابو طالب کا بڑا کنبہ خاص کر دشواری محسوس کرنے لگا۔ اس وقت آنحضرت صلعم اپنے سوتیلے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گئے اور فرمایا کہ اس قحط سالی میں ابو طالب کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کو آپ نے اور حضرت جعفر کو حضرت عباسؓ نے لے کر اپنے گھروں میں رکھ لیا۔ نیکی کرنے کے ساتھ نیکی پر آمادہ کرنے میں بھی آپ پیش پیش رہے۔

اس قسم کے شریفانہ طرز عمل سے شہر میں آپ کے وقار کا روز افزوں ہو جانا ناگزیر تھا۔ اگرچہ ازرقی وغیرہ مؤرخین کے مطابق بلدۂ مکہ کی رکنیت چالیس سالہ عمر سے قبل کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی، لیکن آپ کی فراست اور ناطرفداری پر معترین کو جو اعتماد تھا اس کا اندازہ ایک سے زیادہ شہری جھگڑوں کو سلجھانے میں آپ کے حصہ لینے سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ

کی عمر تقریباً ۳۵ سال کی تھی کہ عبادت گاہ کعبہ کی عمارت ایک آتشزدگی اور پھر طغیانی کی سیل سے متاثر ہو گئی تھی۔ شہر مکہ ایک وادی میں ہے جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں اور کعبے کا مقام اس وادی کا پست ترین حصہ ہے۔ جس کے باعث شہر میں خفیف سی بارش بھی ہو تو سارا پانی وہیں چلا آتا ہے۔ سابقہ تجربوں کے باعث کعبے کی عمارت کو عامر الجادر نامی سردار نے ایک دیوار کے احاطے میں لے لیا تھا۔ تاکہ سیل کی زد عمارت کعبہ پر نہ پڑے۔ لیکن زیر ذکر سال بارش اتنی زیادہ ہوئی تھی کہ احاطے کی دیوار بھی اس کو روک نہ سکی تھی۔ ناگزیر نئے سرے سے بنانے کی تجویز ہوئی تھی۔ اس وقت تک کعبے کا طول و عرض نو نو ہاتھ تھا اور اونچائی قد آدم سے کچھ زیادہ تھی۔ اور کوئی چھت نہ تھی۔ شہر میں طغیانی ہوئی تو سمندر میں بھی طوفان ناگزیر تھا۔ اتفاق سے رومی تاجروں کا جہاز شعیبہ (جدہ) کے پاس سے گزر رہا تھا وہ طوفان سے خشکی پر چڑھ آیا۔ اور ٹوٹ گیا۔ ازرقی کے مطابق مکے والوں کو خبر ہوئی تو باوجود اپنی جہالت کے انسانیت سے پیش آئے۔ چنانچہ جتنے آدمی بھی زندہ بچے تھے اُن کی خبر گیری کی اور جو سامان بھی وہ بچا سکتے تھے ان کو نہ صرف اچھے داموں خرید لیا بلکہ محصول درآمد بھی معاف کر دیا۔ یہاں تک کہ جہاز کی لکڑی بھی لے کر معاوضہ دیا۔ مکے میں باقوم نامی قبطی (مصری) بڑھئی کا ذکر ملتا ہے ایک روایت میں وہ انہیں طوفان زدہ پناہ گزینوں میں سے تھا۔ اور اہل مکے کے اچھے سلوک کو دیکھ کر وہیں بس گیا تھا۔ اس طرح بعض روایتوں کے مطابق جہاز کا سامان نفیس تعمیری ضرورتوں یعنی سنگ مرمر، لوہے، لکڑی وغیرہ پر مشتمل تھا اور ایک گرجے کی تیاری کے لیے مصر سے حبشہ جا رہا تھا۔ وہ سامان بلا طلب ہاتھ آیا۔ ایک مزید نیک فالی یہ پیش آئی تھی کہ کعبے کے تمام چڑھاوے اور نذریں کعبے کے دروازے کے پاس ہی جس اندھے کنویں میں حفاظت کے لیے لوگ ڈالدیا کرتے تھے اس میں ایک بڑا سا سانپ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اکثر نظر آ کر دہشت کا باعث بنا ہوا تھا۔ اتفاق سے کعبے کی ترمیم کی تجویز کے زمانے میں سانپ ایک دن سر نکالے کنویں پر سے جھانک رہا تھا کہ ایک عقاب آیا اور جھپٹا مار کر اُسے پکڑ لے گیا۔ ان تمام قدرتی اتفاقات نے اہل مکہ کو اس پر آمادہ کیا کہ اپنی اس پُرانی اور مقدس عبادت گاہ کی تعمیر میں پیسہ بھی پاک لگائیں، ''کسبیوں کی کمائی، سود کی رقم اور ظلم سے لیا ہوا روپیہ'' اس میں شریک نہ کریں۔ کعبہ ایک چاردیواری ہے۔ اس کی تعمیر اب بانٹ دی گئی۔



دروازے کے رُخ کی دیوار بنی عبد مناف اور بنی زہرہ کے حصے میں آئی۔ حجر اسود اور رُکن یمانی کی درمیانی دیوار کا بنی مخزوم و تیم وغیرہ نے ذمہ لے لیا۔ پشت کی دیوار بنی سہم اور بنی جمح نے لی حجر یا حطیم کا رُخ بنی عبدالدار و بنی اسد اور بنی عدی نے لیا۔ پوری پرانی عمارت انتہائی ادب سے ڈرتے ڈرتے ڈھائی گئی۔ طول و عرض بھی سابق سے دُگنا کر دیا گیا۔ کہ سیڑھی کی ضرورت رہے۔ (اور دربان کے لیے آمدنی کا ذریعہ ہو) اور اوپر چھت بھی ڈالی گئی۔ کعبے کا کچھ حصہ حطیم کے نام سے بغیر چھت کے نیم دائرہ شکل کا باہر رکھا گیا۔ اور دیوار دونوں طرف سے کعبے کے ساتھ غیر متصل رکھی گئی تا کہ ہر کوئی ہر وقت وہاں جا سکے۔ اس کے اندر جانا گویا کعبے کے اندر ہی جانا تھا۔ اور معمولی معاہدہ کرنا، قسم وغیرہ کھانا ہو تو اب لوگ حطیم کو استعمال کرنے لگے اور اصل کعبے کے اندر ہفتے میں صرف دو بار پیر اور جمعرات کو نیز خاص خاص تقریبوں کے موقع پر داخلہ دیا جانے لگا۔ غرض دیواریں اُٹھنے لگیں۔ اور تمام اہل شہر پتھر لانے اور جمانے میں حصہ لینے لگے۔ جب یہ کوئی ڈیڑھ گز اونچی ہو گئی تو حجر اسود کو دیوار میں ایسی جگہ نصب کرنے کا سوال پیدا ہوا کہ طواف کرنے والے کو وہ نظر آئے جسے وہ بوسہ بھی دے سکے۔ حجر اسود ایک مقدس پتھر تھا۔ اس کی تنصیب ایک بڑا اعزاز تھا۔ اس لیے قبائل اس میں جھگڑنے لگے۔ اور مرنے مارنے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ جو سب سے زور کا حصہ عمارت میں رکھتے تھے یعنی حطیم والے انہوں نے ایک خون بھرا پیالہ لا کر حلف لیا کہ وہ اس اعزاز سے دست بردار نہ ہوں گے۔ اور نشان کے طور پر وہ چاٹنے لگے۔ چار پانچ دن تک تعمیر کا کام رُک گیا۔ پھر لوگ

کعبے کے پاس ہی جمع ہو کر مشورہ کرنے لگے۔ ایک دن بوڑھے (امیہ بن المغیرہ) نے مشورہ دیا کہ "اس کو خدا ہی پر چھوڑ دو۔ اور اب جو شخص اس راستے سب سے پہلے آئے اُس کو ثالث بنا لو۔" اتفاق سے آنحضرتؐ آتے نظر آئے تو لوگ دور ہی سے چلانے لگے کہ "یہ تو امین آرہا ہے ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں یہ تو محمدؐ ہے۔" آنحضرتؐ قریب پہنچے تو ماجرا آپ کو سنایا گیا۔ آنحضرتؐ چاہتے تو وہ اعزاز صرف اپنے لیے یا اپنے خاندان کے لیے مخصوص کر سکتے۔ مگر آپ نے فوراً ایک چادر مانگی اور اُسے بچھا کر حجر اسود کو (جو مشکل سے دس پندرہ انچ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے) اس پر رکھا پھر جملہ قبائل کے نمائندوں سے خواہش کی کہ چادر کے کونے پکڑ کر اُٹھائیں اور جب وہ مقام تنصیب کے قریب پہنچا تو اپنے دست مبارک سے اُٹھا کر اس کو دیوار پر بٹھا دیا اور اس طرح ایک طویل اور خون ریز خانہ جنگی کے احتمال کا بخوشی سدِ باب فرما دیا۔ اصل جھگڑالو لوگوں کے نام بھی اب کسی کو معلوم نہیں، اور نہ اُن لوگوں کے جنہوں نے چادر تانی تھی۔ محمد الامین کا نام البتہ صلح جو اور صلح کل کی حیثیت سے قیامت تک ایک اُسوۂ حسنہ بنا رہے گا کہ جھگڑے کس طرح چکائے جاتے ہیں۔

اس سلسلے کا آخری واقعہ بھی ذکر کرتے چلیں۔ مکے والوں کا لباس ایک تہمد اور ایک چادر ہوتا تھا۔ غربا کے پاس تو چادر بھی نہ ہوتی تھی۔ اس تعمیر کعبہ میں وزنی پتھر کندھے پر رکھ کر لانا پڑتا تھا تو خراش سے بچنے کے لیے بہت سے غربا اپنے تہمد ہی کی لپیٹ کر کندھے پر گدہ بنا لیتے تھے۔ آنحضرتؐ کا کندھا بھی خراش سے متاثر نظر آنے لگا تو آپ کے چچا عباسؓ نے مشورہ دیا کہ تم بھی ایسا ہی کر لو۔ آپ نے ایسا ہی فرمایا۔ لیکن گر پڑے اور برہنگی پر اتنی شرم اور ندامت ہوئی کہ پھر اس کا کبھی ارادہ نہ فرمایا۔

آفتاب رسالت کا طلوع

بیت اللہ (کعبہ) کی تعمیر جس اعتقاد اور اہتمام سے ہوئی، اور اس کے چندوں میں ہر قسم کی حرام و مشتبہ کمائیوں سے پرہیز کر کے صرف پاک اور جائز آمدنی قبول کی گئی وہ شہر کے نو عمر اور حساس دماغوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہی ہو گی۔ اس کے احترام کا حال یہ تھا کہ لوگ وہاں جھوٹی قسم کھانے سے گھبراتے تھے۔ انتہائی اہم اور یقین آفریں قسم کھانی ہو تو کعبے کے حصہ

میں لوگ حلف لیتے تھے۔ اور مشہور ہو گیا تھا کہ وہاں جھوٹی قسم کھانے سے زندگی ختم، نام و نشان نابود اور گھر بار اُجڑ جاتا ہے۔

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جب خدائے واحد کے اس گھر میں ایک دیوستھان بن گیا اور تین سو ساٹھ (۳۶۰) بُت اس کے اندر اور اس کے احاطے میں آ گئے تو ذاتی غور و فکر کرنے والے دلوں کو اُلجھن ہوئے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ بُت جن میں سے بہتوں کی صورت شکل تک کاریگروں کی عدم مہارت سے بھدی اور بے ڈول ہے یہ بُت جو ہمارے ہی ہاتھوں کے مصنوعات ہیں اور جو نہ بول سکتے ہیں اور نہ حرکت کر سکتے ہیں جو اس قابل نہیں کہ کوئی ان کو ضرر پہنچائے تو روک بھی سکیں، وہ کس حد تک کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتے ہیں؟ ان کا صحیح مقام قومی اور انفرادی زندگی میں کیا ہے؟ پھر یہ قصے بھی سننے میں آئے تھے کہ ایک غلّہ پیدا کرنے والے رجبے کے باشندوں نے بجائے مٹی پتھر کے آٹے کا بڑے قد و قامت کا پتلا بنایا اور اُسے اپنا معبود ٹھہرایا اور پھر ایک سال قحط ہوا تو اسی معبود کو کاٹ کاٹ کر اور توڑ پھوڑ کر کھا گئے۔ یا جہاں لکڑی کے بُت تھے تو مسافر سردی وغیرہ کے زمانے میں راتوں کو چپکے سے اپنے چولہوں کا ایندھن ان سے فراہم کر لیتے تھے ایسے معبود کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ اس سے بڑھ کر نفرت پیدا کرنے والا مکّے کے اندر یہ واقعہ تھا کہ اساف نامی شخص نے نائلہ کے ساتھ زنا کرنے کے لیے ایک دفعہ خانہ کعبہ کے اندر چار دیواری کا آسرا پایا اور لوگوں نے تشہیر کے لیے اُن کے بُت شہر کے دو ممتاز مقاموں پر رکھ دیے تو چند ہی سال بعد مختلف ناواقف لوگ ان ملعون بتوں کی پوجا کرنے لگے تھے۔

ایسے واقعات پر چند اعلیٰ دماغوں کا سوچ میں پڑ جانا ناگزیر تھا۔ عام اہلِ شہر تو بُت پرست تھے۔ البتہ بعض لوگ بیرونی ممالک کے سفر سے متاثر آئے تھے۔ اور اپنے ملک کی بے سروپا بُت پرستی سے نفرت کرنے لگے تھے۔ اسی سلسلے میں مکّے کے اندر ہی کچھ لوگ عیسائی ہو گئے تھے، اور کچھ دہریئے اور مادہ پرست والا مذہب ہو کر "خوش باش دمے کہ زندگانی این ست" یا "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے قائل ہو گئے تھے۔ کچھ توحید تک پہنچ گئے تھے لیکن حیران تھے کہ عبد و معبود میں رشتہ کس طرح قائم کریں۔ وہ اپنے دل کی تڑپ اشعار وغیرہ میں ظاہر کرنے لگے اور ایک مشہور شخص نے کہا کہ "اے خدا تو ہی بتا کہ میں تیری کس طرح عبادت

بجالاؤں، کھڑا رہوں یا جھکوں یا سجدے میں گر پڑوں۔ یا سر کے بل اُلٹا کھڑا ہو جاؤں۔ یا کسی پہلو پر پڑوں مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ تو جیسا چاہے گا میں ویسا کرنے پر ہر طرح آمادہ ہوں۔"

غرض "فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست" آنحضرت کا عام خاندان تو اہلِ شہر کا ہم خیال تھا۔ البتہ آپ کی بیوی خدیجہ کے ایک قریبی رشتہ دار ورقہ بن نوفل نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ وقتاً فوقتاً اہلِ شہر میں مذہبی مسائل پر بھی گفتگو ہوتی ہوگی۔ بہر حال مختلف اسباب نے جلد ہی اب آنحضرت کو انسان کے مقصدِ حیات اور خالق کائنات کے مسئلے پر متوجہ کر دیا۔ غالباً چند دن آپ یوں ہی سوچتے رہے ہوں گے کبھی بیوی سے گفتگو کی ہوگی، کبھی احباب سے، کبھی بزرگانِ خاندان و شہر سے، اور کبھی سب طرف سے لاجوابی اور مایوسی دیکھ کر تنہا کسی درخت کے نیچے، کسی چٹان کے سائے میں بیٹھ جاتے اور گھنٹوں اسی طرح گزر جاتے ہوں گے۔ تحنث کرنے یعنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر کچھ عرصے کے لیے تنہا کسی غار میں جا کر چلّہ بیٹھ جانے کی ترغیب یا ترکیب طبری کے مطابق مکّے میں معروف و معمول چیز تھی۔ معلوم نہیں مکّے میں یہ چیزیں کہاں سے آئیں۔ ممکن ہے سنتِ ابراہیم کا بقایا ہو۔

بہر حال ہمارے مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ رمضان کا پورا مہینہ آپ شہر مکّے کے باہر اپنے مکان سے تقریباً ڈھائی تین فرلانگ کے فاصلہ پر حرا نامی پہاڑ کے ایک غار میں رہ جاتے تھے۔ کھانا پینا کچھ تو آپ ساتھ لے جاتے اور پھر کبھی ضرورت پر عارضی طور سے گھر واپس آ جاتے یا آپ کی بیوی خادم یا غلام کے ہاتھ آپ کو ضرورت کا سامان تازہ بھیج دیتیں۔ یقیناً یہاں روزے اور ریاضت کا سلسلہ جاری رہتا ہوگا۔ لیکن تفصیل معلوم نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی بھولا بھٹکا مسافر یا مسکین ادھر سے گزرتا تو آپ اپنے مختصر توشے میں اس کو بھی شریک فرمایا کرتے اور یہ مہینہ ختم ہوتا تو مکّہ آ کر گھر جانے سے پہلے کعبے کا طواف کرتے۔

جبل حرا (جو اَب جبل نور کے نام سے مشہور ہے اور جس کا ترجمہ بائبل میں فاران آیا ہے) مکّے کے شمال مشرق میں منا و عرفات کو جاتے وقت بائیں ہاتھ پر سڑک سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ بارش سے جو سیلاب آتا ہے اس سے شہر کی حفاظت کے لیے ترکی دور میں یہاں ایک طویل کنڈ بنا کر سیلاب کے رُخ کو بدلا گیا ہے۔ اس سے ذرا آگے بڑھیں تو سفید سا ایک نورانی پہاڑ ہے۔ کچھ چکّر دار پہاڑی چڑھائی کریں تو ترکوں کے لیے دعا نکلتی ہے

کہ انہوں نے یہاں پانی پینے کے لیے حوض تعمیر کیے ہیں، جن میں بارش کا پانی جمع ہو کر خاصے طویل عرصے تک کام دیتا ہے۔ اور اوپر پہنچیں تو چوٹی کے قریب چند چٹانیں اور گنڈ اوپر تلے آزو بازو اس طرح جمع ہو گئے ہیں کہ اُن سے ایک سطح فرش کے ساتھ ایک غار بن گیا ہے اور چند قدرتی سیڑھیاں سی بن گئی ہیں۔ اندر جاؤ تو خدا کی قدرت نظر آتی ہے۔ تقریباً چار گز لمبا پونے دو گز چوڑا اور اتنا اونچا کہ ایک پورے قد کا آدمی وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا اور اندر آرام سے پاؤں پھیلا کر سو سکتا ہے۔ دھوپ اور بارش سے بھی کافی حفاظت ہے اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ غار جو لمبا سا مستطیل شکل کا ہے قدرۃً کعبہ رُخ ہے۔ غارِ حرا میں آنحضرتؐ کا تحنت یا چلہ کشی کا سلسلہ ٹھیک کتنے سال جاری رہا باوجود تلاش مجھے معلوم نہ ہو سکا لیکن یہ مدت بہر حال پانچ سال سے کم جاری رہی ہو گی۔

مادّی تجارب اور اُن کے نتائج کا تو آدمی بہت کچھ تذکرہ کر سکتا اور اُن کو الفاظ کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ لیکن روحانی تجارب کے حواس ظاہری سے معلوم کرنا ممکن نہیں۔

آنحضرتؐ پر کیا گزری پورے طور سے کیسے بیان ہو سکتا ہے بہر حال مستند روایات اور سوانح نگاروں کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یقیناً دل کی خلش کو اس سے سکون ملنے لگا ہو گا کیونکہ ہر سال اس کا اعادہ ہونے لگا تھا۔ بلکہ یقیناً اس میں زیادہ مزہ آنے لگا ہو گا۔ کہتے ہیں کہ ان روحانی ترقیاتِ مدارج کے سلسلے میں اوّلاً رؤیا ہائے صادقہ پیش آنے لگے۔ یعنی بارہا ایسے خواب نظر آتے جن کی بعد میں جلد تعبیر نکل آتی۔ پھر رفتہ رفتہ بعض وقت آپ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ کوئی درخت یا کوئی پتھر آپ سے مخاطب ہے۔ اور آواز دے رہا ہے، رفتہ رفتہ یہ آوازیں بامعنی الفاظ کی صورت اختیار کرتی گئیں۔

شروع میں اُن چیزوں سے آپ کو ڈر لگا۔ بارہا آواز پر کسی انسان کی تلاش کی مگر کوئی ہو تو نظر آئے۔ رفتہ رفتہ ان غیبی دوستوں سے انسیت بڑھتی گئی۔ ان کا انتظار رہنے اور ان کے دوبارہ آنے پر لطف آنے لگا۔

رفتہ رفتہ دنیا سے جی اُٹھنے لیکن باہمہ و بے ہمہ ہونے کی طرف میلان ہونے لگا۔ تزکیۂ نفس و ارتکاز و انہماک پہلے ہی سے مجلّی اور پاک صاف دل پر وہ اثرات دکھانے لگا جو انسان کو انسانیت کا ملہ تک پہنچاتے اور عبد و معبود، خالق و مخلوق میں راست رشتہ جوڑتے ہیں۔

ضمیریوں تو ہر کسی کو بُرائی سے روکنے اور بھلائی کی ہدایت کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر ایسے پاک ضمیر کا ضمیر کتنا صحیح ہادی و مصلح نہ ہو جاتا ہو گا۔

چند سال تک اس تزکیۂ نفس اور صفائی باطن کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں بیوی بچوں اور گھر بار سے تعلق بے تعلقی کا سا ہو گیا۔ چنانچہ آپ کی آخری اولاد تعمیر کعبہ کے پہلے ہی پیدا ہوئی۔ بی بی خدیجہ سے پھر کوئی بچہ نہ ہوا۔

اب عمر اپنی پختگی کو پہنچی۔ چالیس سال ہونے کو آئے تو قدرت کی طرف سے وحی والہام کے لیے تیار کیا جانے لگا۔ اور رسولِ امی کو رب العالمین نے چاہا کہ رحمۃ للعالمین بنا دے۔

آخر پھر رمضان کا مہینہ آیا۔ چلہ شروع کر کے چند ہفتے ہو گئے تھے کہ جبرئیل امین خدا کا پیام پہنچانے یا وحی کا ذریعہ بننے کے لیے حاضر ہوئے اور خاتم النبیین کو عہدۂ رسالت کا جائزہ دلا دیا گیا۔ اللّٰھم صل علیٰ محمد۔

پہلی وحی کے وقت تو کوئی پاس نہ تھا۔ لیکن آئندہ (۲۳) سال تک مسلسل وحی آتی رہی۔ اور اس کا مشاہدہ کرنے والے بہت سے موجود بھی ہوتے تھے۔ پبلک نے اپنے مشاہدے کا تذکرہ جو چھوڑا ہے اسے ہم بالتشبیہ کچھ نہ کچھ اپنے ماحول کی چیزوں کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں۔ وحی کو ایک ٹیلی فون سمجھنا چاہیے جو خدا اپنے پیغمبر کو کرتا ہے محدثین اور مورخین کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک گھنٹی کی سی آواز سنتے۔ آپ کے بہت قریب رہنے والوں (مثلاً ابوبکرؓ و عمرؓ) کو ایسے موقعوں پر کچھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی سنائی دیتی۔ گو نظر کچھ نہ آتا۔ پیام رسانی کی یہ وصولی جو شدت و جلالت رکھتی تھی اس کا مشاہدہ بعض صحابہ کی زبانی یوں مروی ہے کہ اگر شدت کے جاڑوں میں بھی یہ موقع پیش آیا تو آنحضرت کی پیشانی پسینے سے تر بتر ہو جاتی۔ اونٹنی پر سوار رہتے تو بوجھ کے مارے وہ اکثر بیٹھ جاتی۔ اور اگر کبھی نہ بیٹھتی تو اس کے پاؤں کچھ ایسے جھنے لگتے کہ گمان ہوتا کہ اب ہڈی بیچ کر ٹوٹ ہی جائے گی۔ ایک مرتبہ ایسی حالت میں ایک صحابی کی ماندی پر آپ زانو رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ بوجھ کی شدت سے حواس باختہ ہو گئے۔ اور خیال کیا کہ ران کی ہڈی بیچ سے ٹوٹ جانے والی ہے۔

فرشتہ یا ملائکہ کے معنی ''بھیجے ہوئے'' یا ''پیام رساں'' ہیں۔ اور اس سے وہ مخلوق مراد

لی جاتی ہے۔ جو انسان اور خدا کے مابین رابطہ بخشتی اور پیام رسانی کرتی ہے۔ رسول کریمؐ کا بیان ہے کہ پیام رساں فرشتہ (جبرئیل) کبھی انسان کی شکل میں نظر آتا، کبھی پکھوں سے اڑنے والی ایک نئی نوع خلقت کی شکل اور کبھی کسی اور شکل میں۔

چونکہ نبی ہر شخص نہیں بنتا۔ اس لیے نبوت کے یہ تعلقات بھی ہر کسی کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اور اُن چیزوں کو تعیین کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص اہمیت بھی نہیں ہے۔ کہ وحی کس طرح آتی تھی۔ بلکہ وحی کیا آئی اور کس طرح محفوظ رہی یہی ہمارے لیے اہمیت رکھتا ہے۔

غرض ۴۰ محمدی مطابق ۱۲ قبل ہجرت م ۶۱۰ء کے رمضان میں وہ دور ختم ہو گیا جو نبوت محمدیؐ کا پس منظر تھا۔ وحی کی آمد ایک عہد آفریں واقعہ تھا جس سے آپ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اب اسی کا مطالعہ کرنا ہے۔

نبوت کا مکّی دَور

نبوت کا آغاز ربانی وحی سے ہوتا ہے خدا اپنی ہدایت اور حکم اپنے پیغام رساں کے پاس بھیجتا ہے۔ کہ بندوں اور انسانوں تک پہنچا دے۔ نبوت کوئی موروثی پیشہ نہیں کہ بچہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کو بچپن ہی سے اس پیشے میں مشغول دیکھ کر اس سے مانوس اور خود بخود واقف ہوتا چلا جائے۔ ایک نکوکار راست باز لیکن اُسی شخص کو جب یک بیک یہ اطلاع ملی کہ "تو خدا کا رسول ہے۔ اور تیرا فریضہ ہے کہ اپنی قوم کو حق و ہدایت کی طرف بلائے۔" تو جو نفسیاتی کیفیت اور ذہنی ردِ عمل پیدا ہوا ہوگا اُس کا تھوڑا بہت اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے کہ جو مشہور سیرت نگار ابن اسحاق نے بیان کی ہے کہ "آنحضرتؐ نے اپنی بیوی خدیجہ سے کہا کہ جوں ہی میں تنہا ہوتا ہوں تو آواز سُنا کرتا ہوں جو مجھے اے محمد کہہ کر پکارتی ہے مجھے نیند نہیں بلکہ بیداری میں ایک نور سا محسوس ہوتا ہے۔ خدا کی قسم مجھے اُن بتوں اور کاہنوں کی غیب گوئیوں سے بڑھ کر کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ کیا میں بھی کوئی کاہن بن گیا ہوں؟ کیا مجھے آواز دینے والا کوئی جن اور شیطان تو نہیں۔

غرض یہ خوف ناگزیر تھا کہ لوگ جھوٹا، مجنوں یا آسیب زدہ اور کاہن سمجھنے لگیں گے۔ کیونکہ مُلک میں نبوت اور خدا کی رسالت سے کوئی واقف نہ تھا اور اسی بنا پر اس نازک فرق کو

بھی محسوس نہ کر سکتا تھا جو شیطانی القاء اور ملکوتی الہام میں ہوتا ہے کیونکہ بظاہر دونوں غیب دانی کی حد تک مماثلت رکھتے دکھائی دیتے ہیں۔

غمگسار بیوی نے طرح طرح سے تسلی کا سامان کیا۔ ایک طرف تو اپنے غیر متزلزل ایقان کا اظہار کیا کہ تم جیسے نکوکار اور سراپا فیض منش کو خدا کبھی آسیب وغیرہ شیطانی مصائب میں مبتلا نہ کرے گا۔ پھر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جو عیسائی تھے لے گئیں۔ اور انہوں نے یہ ماجرا سن کر اطمینان دلایا کہ یہ باتیں شیطانی نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ تو حضرت موسیٰ کے ناموس[1] یعنی توریت سے مشابہ ہیں۔ اور یہاں تک کہا کہ تمہارے اصلاحی کام میں اگر رکاوٹیں اور مشکلیں پیش آئیں اور اس وقت تک میں زندہ رہوں تو ہر طرح تمہارا سینہ سپر رہوں گا۔ (یہ یاد رہے کہ خود عیسائی مورخوں کے مطابق آغاز اسلام کے وقت عیسائی عام طور پر آخری تسلی دہندے اور مسیحا کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اس پر تعجب نہ ہو) اس کے ساتھ بی بی خدیجہ نے ایک اور اطمینان دہانی اور تشفی کا ذریعہ بتایا جو بی بی کو غالباً اپنے عیسائی رشتہ داروں سے معلوم ہوا ہوگا۔ چنانچہ ابن ہشام کے مطابق بی بی نے آں حضرتؐ سے کہا کہ جس وقت تمہیں جبرئیل فرشتہ نظر آنے لگے تو مجھ سے کہو۔ آنحضرتؐ نے کچھ عرصہ بعد کہا کہ لو وہ مجھے اب نظر آ رہا ہے۔ بی بی نے کہا آؤ میرے دائیں پہلو میں بیٹھو اور کہو کیا اب بھی نظر آ رہا ہے۔ آپ نے کہا ہاں۔ تو کہا اُٹھو میرے بائیں پہلو میں بیٹھو اور کہو، کیا اب بھی نظر آ رہا ہے۔ آپ نے کہا ہاں۔ پھر آپ کو اپنے سامنے بٹھا کر وہی سوال کیا، آخر میں آپ کو اپنی قمیص کے اندر کھینچ کر بے تکلفی اختیار کر لی اور پوچھا کیا اب بھی نظر آ رہا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں آب نظر نہیں آ رہا ہے اس پر بی بی نے کہا کہ اگر وہ شیطان ہوتا تو ہماری اس شرم کے وقت ہرگز نہ ٹلتا۔ وہ فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

ابتدائی وحی کے بعد پھر کچھ عرصے تک تازہ وحی نہیں آئی۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں یہ واقعہ (جسے اصطلاحاً فترت وحی کہتے ہیں) تین سال تک جاری رہا۔

یہ تین سال کا عرصہ ناگزیر کئی طرح سے گزرا ہوگا۔ ابتدائی زمانے میں اوّلین وحی کی دہشت، بعد کے زمانے میں سکون و اطمینان، پھر اس کی طرف رغبت، اور آخر میں انتظار اور

1۔ ناموس یونانی لفظ ہے اور توریت عبرانی دونوں کے لفظی معنے "قانون" کے ہیں۔

بے چینی۔ اس آخری دور کے متعلق مورخین بیان کرتے ہیں کہ انتظار کی شدت اور ناکامی پر رنج کا آنحضرتؐ پر ایسا اثر طاری ہو جاتا تھا کہ پہاڑ کی چوٹی پر سے اپنے کو گرا کر جان دینے کو جی چاہتا تھا۔ ایسے وفور بیخودی کے وقت پھر آپ کی دنیوی آنکھوں پر پردہ چھا جاتا۔ اور چشمائے بصیرت وا ہو جائیں۔ اور آپ کو جبرئیل بھی نظر آ جاتے۔ اور کہتے کہ تم خدا کے سچے رسول ہو، اس پر آپ کا پھر اطمینان ہو جاتا اور مجاہدہ و ریاضت کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں بیوی اور گھر سے تعلق برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ راتوں کو ایک طویل عبادت کے بعد کعبے کے احاطے میں سو جایا کرتے تھے۔ دن کو عبادت اور نماز میں مشغول رہتے۔ اور تزکیہ نفس اور خدمت خلق کے سوا کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔

آخر ریاضت نے نفس کے آخری (زنگار کو بھی صاف کر دیا اور دنیا کی آخری خواہش کو بھی ختم کر دیا۔ اور ایسا انسان تیار ہو گیا جو شکل تو انسان ہی کی رکھے، لیکن اس کی ہر حرکت، ہر لفظ اور ہر ادا فنافی اللہ ہو جائے۔ یہ ہونے کے بعد آپ کو تو نہیں آپ کی بیوی کو یہ خطرہ گزرا کہ کیا خدا نے اسے چھوڑ دیا ہے؟ کیا خدا اُس سے ناراض ہو گیا ہے؟ تو تربیت اور تیاری کی مدت کا آخری لمحہ بھی ختم ہو گیا اور یہ وحی آئی۔

''قسم ہے روزِ روشن کی اور قسم ہے شب تاریک کی تیرے رب نے نہ تو تجھے چھوڑ دیا اور نہ تجھ سے ناراض ہوا ہے۔ تیرے لیے ہر آئندہ چیز، ہر گزشتہ چیز سے بہتر ہوگی۔ اور جلد تیرا رب تجھے وہ چیز دیگا جس سے تو خوش ہو جائے گا۔ کیا اس نے تجھے یتیم پانے کے باوجود سہارا نہیں مہیا کیا؟ اور بھٹکا ہوا ہونے کے باوجود سیدھے راستے پر نہیں لگایا؟ کیا محتاج پانے کے بعد مال دار اور غنی نہیں کر دیا؟ تو بھی اب کسی یتیم کو نہ دبا۔ اور کسی سائل کو نہ جھڑک، اور اپنے رب کی نعمت سب سے بیان کر۔'' (سورۂ والضحیٰ)

''اپنے رب کی نعمت سب سے بیان کر۔'' یہ ہدایت تھی جو تبلیغ رسالت کے متعلق آپ کو وصول ہوئی۔

اس ابتدائی زمانے میں جو سُورے اور آیتیں نازل ہوئی تھیں ان میں سے سورۂ اقرأ میں خدائے واحد کی خلاقی کا ذکر ہو کر تمام مادہ پرستی اور دہریت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ سورۂ مدثر

میں لوگوں کو ہر قسم کی بُرائی کے بُرے انجام سے ڈرانے، ربِ اکبر ہی کی عبادت کرنے، نماز کے وقت جسم اور لباس کو پاک رکھنے۔ خدا کو ناراض کرنے والی ہر بات (رُجز) کو چھوڑنے، اور کسی بھی عنایت و خدمت کے بعد احسان نہ جتانے کا حکم آیا۔ سورۂ حجر میں یہ حکم آیا کہ ''تجھے جو بھی حکم دیا جاتا ہے وہ خوب کھول کر بیان کر دیا کر اور مشرکوں کی پرواہ نہ کر۔'' سورۂ شعرا میں ایک طرف تو یہ حکم آیا کہ ''اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا سے ڈرا''۔ اور دوسری طرف وحی کو کہانتوں ہاتفوں، بتوں سے نکلنے والی آوازوں اور دیگر تمام شیطانی باتوں اور خود ساختہ شعروں اور خیال آرائیوں سے الگ قرار دے کر معترضوں کا جواب دیا گیا۔ پارۂ عم کی مختلف سُورتوں میں انسان کو خدا کی وحدانیت ماننے اور نکوکار رہنے کی بار بار نئے انداز میں تاکید آتی اور دلیل و ترغیب بھی مہیا کی گئی کہ انسانی دسترس سے بالا زمین و آسمان، چاند سورج، ہوا اور سمندر، بارش اور موسم اور خود ہم انسانوں کو سوائے خدا کے کون بنا سکتا ہے۔ وہی نیست سے ہست کرتا ہے اور وہی زندوں کو موت دے کر فنا کرتا ہے۔ کیا وہی دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا، اور زندہ کر کے اس زندگی کے اعمال پر سزا و جزا نہیں دے سکتا؟ پھر نکوکاری اور بدکاری پر جنت، دوزخ اور قیامت و حساب کتاب کے تذکرے کئے گئے ہیں۔ اور اس طرح وہ اساس اور وہ اصل بنیاد مہیا کی گئی جو انسان کو اختیار رکھنے کے باوجود ضبط پر آمادہ کر سکتی ہے اور لذت کے باوجود بُرائی کو انسان اچھا نہیں سمجھتا۔

اسلام اور جہالت کا فرق یہی بتایا گیا کہ جاہل اچھے اور بُرے کا معیار اپنی لذت اور آرام کو قرار دیتا ہے۔ اور اس طرح بُرائی بھی اچھی بات نظر آنے لگتی ہے، جو محض شیطنت ہے۔ ''زین لہم الشیطان اعمالہم، زین لہم سوءُ اعمالہم'' اب ہم یہ دیکھیں گے کہ تبلیغ و دعوت رسالت کا کام کس طرح انجام پایا۔

تبلیغ رسالت

جب تک فراغت اور فراوانی نہ ہو، پیٹ کا دھندا، انسان کا ہو کہ کسی اور جانور کا کسی اور کام خاص کا ''ذہنی تفتیش'' کی طرف توجہ کا موقع نہیں دیتا۔ اور اگر عبا داتی ''اوہام و خرافات'' کی طرف انسان کی کچھ توجہ بھی ہوتی ہے تو روزگار میں فراوانی کی تمنا میں۔

عہدِ رسالت سے کئی سال پہلے ہی سے مکے والوں نے بین الممالک تجارت اور کاروانی

کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اور ... نبوی میں ایسے کافی لوگ تھے جو انسان کی تخلیق کی غرض و غایت اور خالق و مخلوق کے تعلقات سے دلچسپی نئے سرے سے لے رہے تھے۔ انہیں حالات میں بعثت محمدی عمل میں آتی ہے۔

ایک طرف مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ ابتدائی وحی کے بعد تین سال تک فترت کا زمانہ رہا۔ یعنی پھر کوئی اور وحی نہ آئی۔ دوسری طرف اُن کا یہ بھی بیان ہے کہ ابتدائی تین سال تک مخفی تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔ ان دونوں میں کچھ نہ کچھ تعلق ہونا چاہیئے۔

وحی کے آغاز پر رسول اکرمؐ نے یقیناً اپنی رازداں رفیق زندگی سے اس کا ذکر کیا ہوگا۔ اس صاف باطن، صاف دل کو آمنا کہنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ حضرت علیؓ آپ کے چچا زاد بھائی تو تھے لیکن ساتھ ہی زیر پرورش طفل نابالغ بھی۔ انہوں نے بھی اور گھر کے لونڈی غلام اور حسن سلوک کے پروردۂ احسان زید بن حارثہ اور ان کی بیوی وغیرہ بھی اسی کے بعد مسلمان ہو گئے ہوں گے۔ آپ کے رفیق خاص حضرت ابوبکرؓ سے بھی آپ نے ذکر کیا ہوگا۔ اُن کو بھی تصدیق کرتے کیا دیر لگتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اُس ابتدائی دور کے "نومسلم" یکا یک اپنے اندر ایک بجلی کی رو سے اتصال محسوس کر کے اس بے پناہ جوش سے تبلیغ خدا پرستی کرنے لگے کہ اس کی نظیر دیگر مذاہب میں کم ملتی ہے۔ عورتوں کی جدوجہد کا ہم الگ ذکر کریں گے۔ مردوں میں حضرت ابوبکرؓ کی کوششیں خاص طور پر کامیاب رہیں۔ ایک طرف اُن کے حلقۂ احباب میں سے زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبید اللہ اور ایک روایت میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم خاص ان ہی کی تبلیغ اور بحث و ترغیب پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور دوسری طرف انہیں نے بلال، عامر بن فہیرہ، ام عبیس، زنیرہ، نہدیہ، اور لبینہ رضی اللہ عنہم متعدد مردوں اور عورتوں کو خرید خرید کر آزاد کیا۔ بہ ظاہر یہ اس لیے خریدے گئے تھے کہ اسلام لانے کی "پاداش" میں اُن کے آقا ایذا رسانی کر رہے تھے۔ یہ ٹھیک طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ ان لونڈی غلاموں میں اسلام کس طرح اور کس کی کوشش سے پھیلا۔ بہر حال صدیق اکبر کا تن من دھن اسلام کے لیے وقف ہو گیا تھا اور مسلمان لونڈی اور غلاموں کو کفر کی اذیتوں سے نجات دلانے میں وہ بہت خاص مسرت محسوس کرتے تھے۔

تبلیغ کیا تھی؟ اُس زمانے کی نازل شدہ آیات و سور تہائے قرآنی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کو ایک ماننے، اس کے ہر طرح کے شرک سے پاک ہونے اور مرنے کے بعد انسان کے دوبارہ زندہ ہو کر حساب و کتاب دینے اور اسی کے مطابق جنت یا دوزخ کی جزا و سزا پانے پر مشتمل تھی۔ صنابت پرستی کی لغویت، فرشتوں کا وجود انہیں کے ذریعے سے خدا کا اپنے رسولوں پر وحی کرنا اور بندوں کی ہدایت کے لیے مامور کرنا بیان ہوتا تھا۔ اخلاق حسنہ اور خیر خیرات کی ترغیب بھی دی جاتی تھی۔

تبلیغ کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی دوست یا تجسس پسند ملتا تو رسول اکرمؐ خوش الحانی سے قرآن مجید کی کچھ آیتیں اُسے سناتے۔ پھر اُن کی تشریح و توضیح کر کے ہر مخاطب کے حسب حال اسلام کی تفصیل بیان کرتے۔ ایک طرف خدائے خلاق و رحیم کی بے پایاں نعمتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس کی قدرت و قوت یاد دلا کر آخرت کے حساب و کتاب سے ڈرایا جاتا ہے۔ اسی طرح ملک کے مروجہ اخلاق کی بُرائی بیان کی جاتی ہے۔ کہ خود ہماری ہی دستکاری کے نمونے، جو خود اپنے آپ کی بھی کوئی حفاظت نہیں کر سکتے، اور نہ بول، سُن حرکت کر سکتے ہیں وہ خدا یا خدا کے ہاں شفیع کیسے ہو سکتے ہیں۔

غرض "آمنت باللہ و ملائکہ و کتبہ و رسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہ و شرہ من اللہ" اس تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے جو اس زمانے میں دی جاتی تھی۔

قرآن مجید کی تلاوت میں کچھ ایسا سحر تھا اس کے سامنے جائے دیان عرب بھی سر دھننے لگتا تھا۔ ایسی روایتیں ملتی ہیں کہ اسلام کے سخت ترین مخالف بھی راتوں کو چھپ کر مسکن نبوی کے پاس جاتے اور تلاوت نبوی سے اور کچھ نہیں تو موسیقی کا لطف اُٹھاتے اور کوشش کرتے کہ کوئی اُنہیں دیکھنے نہ پائے۔ اور بار بار راستے میں دیکھ لئے جاتے تو فضیحت بھی ہوتی۔

تاریخ طبری میں خاص کر تفصیل سے اس کا ذکر ہے کہ کب کب اور کس کس طرح رسول اللہ لوگوں کے مجامع سے استفادہ کرتے اور تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دیتے۔

ابھی نماز پنجگانہ لازم نہیں ہوئی تھی لیکن ابتدا ہی سے (دن میں غالباً دو بار چاشت اور عشاء کے وقت) خدائے واحد کی عبادت ہو جایا کرتی تھی۔ مورخ کہتے ہیں کہ ابتداً سویرے

چاشت (ضحیٰ) کے وقت آنحضرتؐ کعبے کے سامنے نماز باجماعت ادا کیا کرتے تھے۔ بُت پرستی کی مذمت میں جب شدت ہوئی تو قریش نے اس سے روکنا اور اذیت دینا شروع کیا۔ اس وقت ہی کا ذکر ہوگا جو سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ آپ شہر کے باہر وادیوں اور دروں میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا فرماتے۔

یہ ٹھیک طور سے معلوم نہیں کہ الارقم نامی صحابی کے مکان میں آپ کب اور کن حالات میں جا فروکش ہوئے۔ آپ کا مکان غالباً مرکز شہر سے ذرا دور تھا۔ بیت الارقم کعبے سے بالکل قریب کوہ صفا پر تھا۔ اس میں کافی گنجائش تھی (وہ آج بھی موجود ہے۔ اور ترکی دور کے تحفظ کے بعد سعودی دور میں اُس کی تزئین بھی ہوئی ہے۔ اور اس تک جانے کی تنگ گلی کو بعض دوسرے مکان توڑ کر چوڑا بھی کیا گیا ہے) اس مقدس و مبارک مکان میں تبلیغی اجتماع بھی ہوتے اور غالباً نماز باجماعت بھی ہوتی، وہاں سے بیت اللہ کعبہ بھی نظر آتا۔

خود حضرت ابوبکرؓ کا بھی اپنے مکان کے صحن میں ایک مسجد بنانا اور وہاں تلاوت قرآن کی محفلوں کا منعقد کیا کرنا تاریخ میں ثبت ہے۔ اُس کو سننے کے لیے بھی آس پاس کے آزاد لوگ اور لونڈی غلام بھی آجایا کرتے تھے۔ اور اُن کے سوز و گداز اور بہی خواہانہ فہمائش و تبلیغ سے متاثر ہوا کرتے تھے۔

تین برس کی سینہ بسینہ راز میں تبلیغ کے بعد علانیہ کام کا آغاز ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں اصابہؔ ابن حجر وغیرہ میں لکھا ہے کہ جب پہلی مرتبہ علانیہ نماز باجماعت حرم کعبہ میں ہوئی اور قریشی انداز سے مختلف طریقے کی عبادت بجالائی گئی تو ہنگامہ مچا اور قریش کی دست درازیوں سے ایک مسلمان حارث بن ابی ہالہ (غالباً بی بی خدیجہ کے پہلے شوہر کے کسی اور بیوی کے بطن سے پیدا شدہ فرزند) اس موقع پر شہید ہو گئے۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک پھر حرم کعبہ میں مسلمانوں کی نماز بند ہوگئی ہوگی۔

جب مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت سعید بن زید اور حضرت ابوذر جیسے بالغ العمر لوگوں کو اسلام لانے پر اُن کے معمر رشتہ داروں نے مارا پیٹا اور طرح طرح کی تکلیف دی تو رسول اللہؐ کے خلاف آپ کے بزرگ قبیلہ ابوطالب کے پاس شکایتی وفود کا آنا بے جا نہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک وفد نے آکر ابوطالب کو نہائیہ دیا کہ اپنے بھتیجے کو

یا تو بتوں کی مذمت وغیرہ سے روکئے یا پھر اپنی حمایت سے نکال دیجئے۔ ابوطالب کے سمجھانے پر آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے میں سورج بھی توڑ کر لا کر رکھیں تو میں اپنے فریضے سے باز نہیں آسکتا۔ اگر آپ میری حمایت نہیں کر سکتے تو بھی پروا نہیں۔ میں خدا کے حکم سے یہ کام انجام دے رہا ہوں۔ اور اُسی کی حفاظت میرے لیے کافی ہے۔ ایک اور موقع پر عتبہ نامی ایک سنجیدہ مزاج قریشی نے تنہا آکر آپ سے بحث کی اور پوچھا کہ آپ کا اس تبلیغ سے کیا منشا ہے؟ دولت چاہتے ہو؟ خوبصورت بیویاں چاہتے ہو؟ پورے شہر کی سرداری چاہتے ہو؟ ہم ہر چیز کے لیے آمادہ ہیں۔ صرف ہمارے دیوتاؤں کی مذمت سے باز آجاؤ۔ اور ان کی پوجا کرنے والوں کی (جن میں ہمارے محترم آباواجداد بھی تھے) جہنمی ہونے کے اعلان سے دست بردار ہو جاؤ۔ آنحضرتؐ نے جواب میں قرآن مجید کی تلاوت شروع فرمائی اس میں خدا کے عذاب سے ڈرایا گیا تھا۔ عتبہ اتنا متاثر ہوا کہ اسے خوف ہوا کہ کہیں وہ دھمکی اسی لمحے پوری ہو کر خدا کا عذاب نہ نازل ہو جائے۔ اس نے قسمیں دیں کہ مزید تلاوت نہ فرمائیں اور وہاں سے خاموش چلا گیا۔

اعلان نبوت پر چھ(۶) سال گزر گئے۔ اور آہستہ آہستہ اسلام پھیلتا ہی گیا۔ اور جو ایک مرتبہ مسلمان ہو گیا پھر کوئی ترہیب یا ترغیب حتیٰ کہ سخت سے سخت ایذا رسانی بھی اس کو اس سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ کر سکی۔ اس سے قریش کے مشرک سرغنوں کا غصہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ ایذا رسانی پر صبر بلکہ موذی کی خدمت بھی اس زمانے میں رسول اللہ کا ایک اصول نظر آتا ہے۔ اس سے بھی بعض غیر متوقع اور اچھے نتائج نکلے۔ مثلاً آنحضرت کے چچا حمزہ کو ایک دن شکار سے واپسی پر اطلاع ملی کہ آنحضرتؐ کی استہزا اور جسمانی ایذا رسانی اس روز خاص طور پر ابوجہل نے بہت کی۔ اب تک حمزہ کو اسلام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس اطلاع پر وہ یکا یک بپھرے۔ ہاتھ میں کمان تھی۔ اسی سے ابوجہل کو حرم کعبہ میں دے مارا اور کہا کہ اچھا اب میں بھی مسلمان ہوتا ہوں کسی کی ہمت ہو تو ہاتھ ڈالے۔

رُکانہ پہلوان کے اسلام کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں۔ اس نے تصدیق نبوت کے لیے آنحضرتؐ کو کشتی لڑنے کی دعوت دی۔ اور یہ بھی کہا کہ ہار جاؤں تو میری ایک تہائی بکریاں نذر۔ اس کے اطمینان کے لیے آنحضرتؐ نے اُس کو ایک مرتبہ نہیں تین مرتبہ پٹک دیا۔ اور

اس کی ساری بکریاں بھی لے لیں۔ وہ رونے لگا تو ساری بکریں اُسے واپس دے دیں۔ اس پر وہ اتنا متاثر ہوا کہ خلوص دل سے مسلمان ہوگیا۔ (شرح سیر کبیر) یہ وہ پہلوان تھا کہ کسی چمڑے پر تن کر کھڑا ہو جاتا اور لوگ چمڑا کھینچتے تو چمڑا پھٹ جاتا۔ مگر اس کے قدموں کے نیچے سے نہ نکلتا۔

حضرت عمرؓ کا اسلام ایک اور نوعیت کا ہے۔ وہ نہ معلوم قریش کے قبیلے میں کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جو آنحضرتؐ کا قصہ پاک کرے، اپنی خودداری و بہادری پر چوٹ محسوس کی، انعام کا لالچ ہوا۔ بہر حال آنحضرتؐ کو قتل کرنے اور اپنے قبیلے کو آنحضرتؐ کے قبیلے سے جنگ کے جوکھم میں ڈالنے پر آمادہ ہوگئے۔ وہ آنحضرتؐ کے مسکن کی طرف جارہے تھے کہ اُن کے ایک رشتہ دار نے مل کر طعنہ دیا کہ "آنحضرتؐ کو پھر قتل کرنا پہلے اپنے گھر کی خبر لو جہاں تمہاری سگی بہن اور بہنوئی مسلمان ہوگئے ہیں۔" وہ غصے کی حالت میں گھر آئے اور مار پیٹ کی تو زخمی بہن نے کہا "ہاں ہم مسلمان ہوگئے ہیں۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔" نہ معلوم آواز میں کیا جلال تھا کہ اُن کے جسم پر کپکپی آگئی اور خفتہ ضمیر بیدار ہوگیا کہ وہ کس مہمل ہٹ میں مبتلا ہیں۔ خدا ایک ہی ہوسکتا ہے۔ بُت بیکار اور بے اثر ہیں۔ اور اس بے غرض مصلح کی مخلصانہ پکار سے اختلاف محض ہٹ ہے۔ اب وہ کچھ مزید تفصیلات دریافت کرنے لگے بہن کے اس جملہ سے بھی اس نفسیاتی کیفیت میں وہ مزید متاثر ہوئے ہوں گے کہ تو ناپاک ہے۔ قرآن کو چھو نہیں سکتا۔ پہلے غسل کرکے آ۔ پھر اس مقدس چیز کے پڑھنے کی تجھے اجازت ملے گی۔ وہ فولاد اب گرمی سے موم بن چکا تھا۔ اس حالت میں آکر جناب رسالتمآبؐ سے ملتے ہیں۔ اور قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ پھر سطوت عمری اسلام کی تائید میں صرف ہونے لگتی ہے۔ وہ بیت الارقم میں موجود جملہ مسلمانوں کو لے کر حرم کعبہ میں آتے ہیں۔ اور رسول اللہؐ وہاں نماز با جماعت ادا کرتے ہیں۔ کسی قریشی کی مجال نہیں ہوتی کہ دم مارے۔ اسی کا ردعمل وہ مقاطعہ ہوتا ہے جس کے باعث تین سال تک آنحضرتؐ کا خاندان مصیبت میں رہتا ہے۔

اب ۱۰ نبوی کا زمانہ ہے۔ مقاطعہ برخاست ہوچکا تھا لیکن بی بی خدیجہؓ اور ابو طالب یکے بعد دیگرے اس عام الحزن میں داغ فرقت دے جاتے ہیں۔ نئے بزرگ قبیلہ ابولہب سے پہلے بھی نہیں بنتی تھی۔ اب اس نے اعلان کردیا کہ آنحضرتؐ کو کنبہ بدر کردیا گیا

ہے مجبوراً آپ طائف قسمت آزمائی کے لیے جاتے ہیں۔ وہاں تبلیغ کی مختصر کوشش اتنی ناکام رہی کہ زخموں سے چور آپ کو مکّہ واپس ہونا پڑا۔ خاندان سے اب تعلق نہ تھا۔ اس لیے بعض احباب کی حمایت حاصل کرکے آپ شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ بظاہر شرط یہ تھی کہ اب مکّہ میں کوئی تبلیغی تقریر نہ کریں۔

مکّے میں ہر سال حج ہوتا تھا۔ اور میلے بھی لگتے تھے۔ وہاں کوئی پابندی نہ تھی۔ آپ سوق عکاظ میں بھی نظر آتے ہیں۔ سوق ذوالمجاز و مجنہ میں بھی۔ پھر شہر مکّہ کے عین باہر میدان منا میں پہلے سال آپ مختلف قبائل کے پڑاؤوں میں جاتے ہیں۔ مورخین کے بقول پندرہ قبیلوں سے یکے بعد دیگرے آپ وہاں ملے۔ اُن سے کہا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے کر اپنے ساتھ لے چلو اور میری تبلیغ کی تائید کرو۔ اس پر دین ہی نہیں دنیا میں بھی بہت جلد قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج تمہارے قدموں میں آگریں گے کہیں کامیابی نہ ہوئی۔ ہر اجتماع اور تخاطب کے وقت ابولہب خدائی فوجدار کی طرح پیچھے پہنچتا اور قبیلے کو آگاہ کردیتا کہ اس مجنوں کی بات میں نہ آنا۔ ورنہ پورے قریش سے لڑائی مول لینی پڑے گی۔ آخر آنحضرتؐ منا سے مکّہ واپس ہو رہے تھے کہ سوچا کہ درۂ عقبہ میں بھی آخری کوشش کرلینی چاہیے وہاں مدینے کے چند حاجی نظر آئے معلوم نہیں تفریحاً آئے ہوئے تھے یا وہیں پڑاؤ ڈالا تھا۔ اُن سے آنحضرتؐ کا ننھیالی رشتہ بھی تھا۔ یہ لوگ یہودیوں کی ہمسائگی کے باعث پیغمبروں اور حشر و نشر کے مسائل سے مانوس بھی تھے۔ اور اس زمانے کے اہل کتاب کے اس تصور سے بھی آشنا تھے کہ ایک آخری تسلی دہندہ اور نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ وہ یہودیوں سے یہ طعنہ بھی سنتے رہے تھے کہ جب "وہ" نبی آجائے گا تو یہودی اپنے سب دشمنوں کو مزہ چکھائیں گے۔ جنگ بعاث کے یہ ستم دیدہ نبی کی بعثت کی خبر سنتے ہیں۔ اور خود اس کے پاس جانے کی جگہ وہی ان کے پاس آتا ہے تو خوش نصیبی کے کیا کہنے وہ فوراً اسلام لاتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اپنے ملک میں اس کی تبلیغ بھی کریں گے۔

ان کی کوشش سے دس بارہ آدمی جو مدینے میں مسلمان ہوئے تھے وہ دوسرے سال درۂ عقبہ میں حج کے موقع پر آنحضرتؐ سے ملتے ہیں۔ اور اپنے اور اپنے خاندانوں کی بیعت پیش کرتے ہیں کہ توحید و عبادت کے علاوہ زنا۔ سرقہ اور قتل اولاد نہ کریں گے کسی پر جان بوجھ

کر بہتان نہ لگائیں گے۔ اور کسی بھی اچھی بات کے حکم میں آنحضرتؐ کی نافرمانی نہ کریں گے۔ اُن کی خواہش پر ایک معلم حضرت عمیر اُن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور وہ مدینہ جا کر جاں فشانی سے تبلیغ بھی کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ اس اللہ کے نیک بندے نے جس لطیف انداز میں اپنا فریضہ انجام دیا اور اجڈ سر پھرے سرداروں کو جس خوبی سے رام کیا اس کی تفصیلی داستان طبری میں ہے۔ یہ مختصر سطور اس کی متحمل نہیں۔ انہیں سرداروں میں سے ایک وہ تھا جو گویا مدینے کا حضرت عمر تھا۔ ویسا ہی تند مزاج اور زود رنج۔ لیکن جب چند آیات قرآنی کی تلاوت نے اس کو اسلام کا فریفتہ کر دیا تو تندی تو نہ گئی لیکن رُخ بدل گیا محلّے میں آ کر اعلان کیا کہ میرے ہاتھوں خیر چاہتے ہو تو مسلمان ہو جاؤ ورنہ مجھ سے بدتر کوئی دشمن نہیں۔ شام ہوتے ہوتے پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

ایک اور سال گزرتا ہے اور حضرت عمیر کے ہاتھوں جو لوگ مسلمان ہوئے تھے ان میں بہتر حج کے موقع پر منا آتے ہیں اور درۂ عقبہ میں اپنے آقا و مولیٰ رسول خدا سے مل کر اقرار کرتے ہیں کہ اگر آپ یا آپ کے مکی ساتھی مدینہ آ جائیں تو وہ ان سب کی میزبانی کریں گے اور ایسی ہی مدافعت و حفاظت گویا وہ اپنے ہی کنبے رشتے والوں کی مدافعت کر رہے ہیں۔ آنحضرتؐ بھی فرماتے ہیں کہ "تمہاری جنگ میری جنگ، تمہاری صلح میری صلح، میں اب تمہارے ہی میں کا ایک فرد ہو گیا۔

یہ معلوم تاریخ عالم میں ایک واقع معاہدہ عمرانی تھا، جس میں چند لوگوں نے ایک فرد کو اپنا سردار بنایا اور معاہدے کے ذریعے سے حقوق و فرائض متعین ہوئے۔ پھر ہجرت عمل میں آتی ہے۔

ہجرت کے بعد دورِ تمکین و حکومت میں بھی اولین مقصد تبلیغ دین ہے۔ اس کے لیے ہر طرف معلم و مبلغ بھیجے جاتے ہیں۔ اور مملکتی وسائل اُن کی حفاظت و پشت پناہی کے لیے رہتے ہیں۔ غیر مسلم رعایا کے ساتھ پورا انصاف ہوتا ہے لیکن انہیں محسوس کرایا جاتا ہے کہ ایک نسل یا جغرافی یا دنیاوارانہ مملکت کی جگہ ایک ایسی مملکت میں جو ایک خاص تصور حیات رکھتی ہے۔ اُن کی حیثیت کی کمی یا برابری اُن کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ان پر تو بار زیادہ نہیں کیا جاتا لیکن مسلمان کسان سے مالگذاری کم کر دی جاتی ہے۔ مسلمان تاجر سے محصول درآمد نصف کر دیا

جاتا ہے مسلمان پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اور غیر مسلم اگر جہاد میں سرفروشی کے لیے ماتحتانہ اتحادِ عمل نہ کرے بلکہ آرام سے گھر میں بیٹھا رہنا چاہے تو جزیہ ادا کرے۔ غیر مسلم رعیت تو بنتا ہے لیکن صدرِ مملکت اور حاکم بن سکتا اب اس کا حق صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ بھی حکومت کے تصور حیات کو اپنا تصور حیات قرار دے اور گہوارے سے قبر تک زندگی کے ہر لمحے اور ہر شعبہ میں اسی تصور حیات کے لیے تن من دھن سے لگ جائے۔

اسلام آسان چیز نہیں۔ امر بالمعروف مگر نفی الاقس کی وہاں گنجائش نہیں۔ خود رسول اللہؐ دوسروں کو جتنا حکم دیتے تھے اس سے زیادہ نوافل کے طور پر خود کام انجام دیتے تھے۔ صدقات و خیرات کو اپنے اور اپنے کنبے کے لیے حرام کر لیا اُس کا اثر کیسے نہ پڑتا۔

رسول اکرمؐ کا تبلیغ دین میں عورتوں نے کیا ہاتھ بٹایا؟

تمہید

اپنے بہت سے ہم وطنوں کی طرح حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم نو عمری میں تجارت اور کمیشن ایجنسی کے اکل حلال حاصل فرمایا کرتے۔ اور جو محتاج تر ہوتے اُن کی ممکنہ دستگیری فرمایا کرتے تھے۔ لیکن چالیس سال کی عمر میں ۶۱۰ء/۱۳ق ھ میں جب آپ تبلیغ رسالت پر مامور ہوئے تو پھر اُس کے بعد سے آپ کا پورا وقت اصلاح و تبلیغ ہی میں صرف ہونے لگا اور دن کے چوبیس گھنٹے آپ تن من دھن سے اسی فریضے کی انجام دہی میں مشغول رہنے لگے۔

دنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں انبیاء کو اپنے مقدس کام میں بھی کن فیکونی کامیابیاں نہیں ہوئیں۔ ہر نئی اصلاحی تحریک کی طرح اسلام کو بھی پھیلنے میں اَن گنت لوگوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ آج کی صحبت میں عورتوں سے اس سلسلے میں جو مدد عہد نبوی میں ملی اس کا مختصر تذکرہ مطلوب ہے۔ ہمارے مردمورّخوں نے مواد کم چھوڑا ہے لیکن جو بھی ملتا ہے وہ سبق آموز ہے۔

خدیجہ بنتِ خویلد

اس سلسلے میں سب سے پہلے ام المومنین خدیجہ الکبریٰ کا ذکر ناگزیر ہے۔ آپ نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم تھیں، بلکہ تبلیغ اسلام کے ابتدائی اور نہایت کٹھن

کام میں اصول خدمت بھی آپ نے انجام دیں۔ اگر یہ عاشق زار اور رفیق سرو تن رسول کریمؐ کو میسّر نہ آتیں تو عالم اسباب کے لحاظ سے اسلام کا آغاز معلوم نہیں ہو بھی سکتا یا نہیں۔ اور بہت سے دیگر انبیاء سلف کی طرح ختم المرسلین بھی شاید بہت محدود کارکردگی کے بعد دنیا سے رخصت ہو جاتے۔

غرباء پروری اور محتاج نوازی ہی سے کسی آدمی کا اثر اپنے ماحول پر قائم ہوتا ہے۔ امیروں کی دعوت اور ہمسروں کی ضیافت سے ملک میں حقیقی وقار و ہر دل عزیزی بالکل قائم نہیں ہوتی۔ لیکن غریبوں محتاجوں کی مدد کا جذبہ بیکار ہوتا ہے۔ جب ''کریماں را دست اندر درہم نیست'' کی بے بسی ہو۔ زمانہ نبوت سے قبل ہی بی بی خدیجہ کی پوری دولت اپنے فیاض اور یتیموں، مسکینوں، بیواؤں کے بے غرض خدمت گزار شوہر کے لیے وقف تھی جو یتیموں محتاجوں اور بیواؤں کی بے مزد خدمت گزاری میں صرف ہوتی، اور شوہر کے لیے امیر و غریب سب کا احترام حاصل کروا چکی تھی۔ یہ وقار زمانہ اسلام کی تبلیغ میں محض بے اثر تو یقیناً نہیں رہا ہوگا۔

اسلام کے عین آغاز پر کام کی دشواری اور دیگر وجوہ سے جو ہیبت رسول کریمؐ کے دل پر تھی، اسی وقت ایک مونس غمگسار سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی۔ بی بی کا کوشش کرتے رہنا کہ آپ کا دل بڑھائیں تقاضائے بشریت سے کوئی بات ہو تو اطمینان دلانا اور حوصلہ افزائی کرنا، ایسے کئی واقعات کتب سیرت میں معروف ہیں اسی طرح اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل تک (جو عیسائی تھے) اسلام کے آغاز کی اطلاع کا پہنچانا، اور اس سے آنحضرتؐ کی ملاقات کرانا بھی سب جانتے ہیں۔ بعض روایتوں میں (دیکھو سیرت کرامت علی) مکے میں ایک اور عیسائی عداس تک اسلام کی تبلیغ کرنا بی بی کی طرف منسوب ہے۔ بی بی کا خود ایمان لانا اور اپنے گھر کے تمام لونڈی غلاموں میں اس کی اشاعت میں مدد دینا بھی شاید قابل ذکر ہے۔ بی بی کا اپنے میکے کے خاندان پر بھی ضرور اثر پڑا ہوگا۔ قریش کے ظالمانہ معاشی و سماجی مقاطعے میں بی بی بھی شعب ابی طالب میں محصور رہیں۔ اور آپ کے بھتیجے حکیم بن حزام کا کبھی کبھی آپ کو آذوقہ بھجوانا، اور قریش کے آڑے آنے کی کوشش کرنا شاید اس کی مثال کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے کہ کاملاً مسلمان نہ بھی ہوں تو اہل خاندان مخالفت نہیں کرتے بلکہ معاونت ہی کرتے ہیں۔

غُزیّہ

محمد بن حبیب البغدادی (فوت ۲۴۵ھ) نے اپنی کتاب المحبر میں لکھا ہے کہ یہ خاتون مسلمان ہونے کے بعد قریش کی عورتوں میں تبلیغ کرنے لگیں، اور بہت سی عورتیں مکّے میں اُن کی کوشش سے مسلمان ہوئیں تو قریش بہت بگڑے چونکہ یہ اصل میں قریشی نہ تھیں بلکہ صحرا نشین بدوِن تھیں، اس لیے اُن کو خارج البلد کرنا کافی سمجھا۔ چنانچہ ایک قافلے کے سپرد اُن کو کیا گیا کہ قید و بند کی حالت میں اُن کے قبیلے پہنچا دیا جائے۔ قافلے والوں نے انہیں ایک اونٹ کی ننگی پیٹھ پر رسیوں سے باندھ دیا۔ بی بی کا بیان ہے کہ انہوں نے مجھے ایک بار بھی کھانا پانی نہ دیا بلکہ منزل میں اُترتے تو ہاتھ پاؤں باندھ کر دھوپ میں ڈال دیتے۔ تین رات دن اس حالت میں گزرے تو میری حالت غیر ہو گئی۔ اور مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ ایک رات میں اسی حالت میں پڑی تھی یکا یک غیب سے کوئی چیز آ کر منہ کو لگی۔ کچھ پانی پیا تو ہوش آیا۔ اور سیر ہو کر پانی پیا صبح لوگ اُٹھے اور میری حالت کو بدلا ہوا اور بہتر پایا تو سمجھے کہ شاید رات کو میں نے قید و بند کو کسی طرح کھول کر قافلے کا پانی چوری سے پی لیا ہے۔ لیکن نہ تو میری رسیاں کھلی تھیں اور نہ مشکیزوں کے منہ۔ جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ کوئی چوری نہیں ہوئی بلکہ محض خدا کا فضل اور غیبی تائید ہوئی تو وہ اس سے سخت متاثر اور تائب ہوئے اور سب کے سب اسلام لائے۔ بی بی کی جناب رسالتؐ سے حُسن عقیدت کا یہ حال تھا کہ آیت اِن وَھَبَتْ نَفْسَهَالِلنبی بھی آپ ہی کے متعلق وارد ہوئی ہے۔

ام شریک دوسیہ

سیر الصحابیات (دارالمصنفین) میں اسد الغابہ (۵/۵۲۹) کے حوالے سے لکھا ہے کہ اُن کی وجہ سے "قریش کی عورتوں میں اسلام پھیلا جو نہایت مخفی طور پر اس خدمت کو انجام دیتی تھیں۔" آیا ناموں کے متعلق اختلاف روایت کے ساتھ مذکورہ بالا قصہ ہی ہے یا کوئی اور تحقیق طلب رہتا ہے۔

فاطمہ بنت الخطاب

حضرت عمرؓ کی بہن تھیں۔ انہوں نے جس طرح حضرت عمرؓ کو متاثر کیا جس سے حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے معروف واقعہ ہے۔ بظاہر یہ ان چند محدود قریشی عورتوں میں سے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں بھی لکھ پڑھ سکتی تھیں۔

سعدیٰ بنت کریز

ابن حجر نے اصابہ (۸/۱۰۶) میں لکھا ہے کہ سعدیٰ بنت کریز کی ترغیب پر حضرت عثمان اسلام لائے تھے۔ یہ غالباً اُن کی خالہ تھیں۔ مزید تفصیلیں معلوم نہ ہو سکیں۔

(بحوالہ سیر الصحابیات)

بیعت عقبہ ثالثہ میں جو ہجرت کی تمہید تھی دو عورتوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ یہ تو ہجرت کے قبل کے چند واقعات بطور نمونہ جمع کیے گئے ہیں۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی جہاں عورتیں مکّے سے کہیں زیادہ آزاد خیال اور خود مختار ہوتا کہی جاتی ہیں، یقیناً تبلیغ میں حصہ لیتی رہی ہوں گی مثلاً:

ام سلیم بنت ملحان

بڑی شیر دل خاتون تھیں۔ ان کا اور ان کی بہن کا شمشیر بکف معرکہ کارزار میں حصہ لیا کرنا معروف ہے۔ بی بی ام سلیم کے متعلق لکھا ہے کہ جب معرکہ حنین میں اسلامی فوج کے مکّی رضا کار بھاگ کھڑے ہوئے تھے تو فتح کے بعد بی بی نے آنحضرت کو مشورہ دیا تھا کہ ان سب مکّی مفرورین کا سر قلم کر دیا جائے۔ (بحوالہ صحیح مسلم، سیر الصحابیات)

ان کے شوہر ابوطلحہ بُت پرست تھے، اور ایک درخت کی پوجا کرتے تھے۔ یہ جو مسلمان ہو چکی تھیں بار بار اپنے شوہر کو جھنجھوڑتی رہیں اور طعن و تضحیک کرتی رہیں، کہ جو پودا زمین کے اندر سے نکلے وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ شوہر متاثر ہوئے مسلمان ہو گئے۔

(اصابہ ابن سعد وغیرہ بحوالہ سیر الصحابیات)

متفرقات

مسجد نبوی میں رسول کریمؐ نے وعظ کے لیے اُن کی ایک الگ محفل رکھی تھی۔ اور ہفتے میں اس کے لیے ایک دن مخصوص کر رکھا تھا۔ چندوں کی خصوصی اپیلوں پر بھی ایسی محفلیں لبیک کہتی تھیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ حضرت بلالؓ صفوں میں پھر کر اُن سے چندہ جمع کرنے لگے اور خواتین اپنی بالیاں، کنگن اور زیور اُتار اُتار کر رسول اللہ کی درخواست پر چندہ دیتی گئیں۔

عورتوں کا نرس، باورچی وغیرہ بن کر جنگوں میں رضا کارانہ جانا یہاں غیر متعلق ہے البتہ شاید اس کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ بیرون سے غیر مسلم قبائل کی سفارتیں جب مدینہ پہنچیں تو ابن سعد وغیرہ میں اکثر ایک انصاری عورت کے مکان کا ذکر آتا ہے کہ وہ وہاں اُترتیں اور وہیں اُن کی خوب ضیافت اور مہمانداری ہوتی تھی۔

غرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تبلیغ اسلام میں عورتوں نے بھی رسول اکرمؐ کا خوب ہاتھ بٹایا۔ اپنے شوہروں کو، اپنے ملازموں، لونڈی، غلاموں کو نیز اپنے رشتہ داروں اور ملنے والی سہیلیوں کو اسلام لانے کی ترغیب دی۔ اسلام کی راہ میں اُنہوں نے طرح طرح کی تکلیفیں بھی سہیں۔ حبشہ کو ہجرت بھی کی ان کی پختہ ایمان کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ حبشہ کے عیسائی ماحول میں بی بی ام حبیبہ کے شوہر عبیداللہ بن جحش اور بی بی سودہ کے شوہر سکران اسلام سے ارتداد کر کے عیسائی ہو گئے مگر یہ دونوں بیبیاں اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ اس کے اجر میں دونوں کو ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت عمرؓ کے گھرانے کی دو لونڈیاں زُنیرہ اور لبینہ بھی مکّے میں مسلمان ہو گئی تھیں۔ حضرت عمرؓ اسلام سے قبل ان کو اس پر سخت ایذا دیا کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ مارتے مارتے خود ہی تھک جاتے تو چھوڑ دیتے اور کہتے کہ یہ نہ سمجھنا کہ تم پر رحم آیا ہے بلکہ تھک گیا ہوں۔ اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔ ذرا ستالوں تو پھر ماروں۔ مگر یہ تکلیف بھی اُن کو گوارا تھی۔ ارتداد نہیں۔ ابولہب کی لونڈی
ثوبیہ نے بھی (جس نے چند دن رسول اللہ کو دودھ پلایا تھا) معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہو گئی ۹
تھیں۔ چونکہ آزاد کر دی گئی تھیں اس لیے غالباً ابولہب کا بس نہ چلتا ہوگا۔ کہ بیچاری بڑھیا کو سزا دیتا۔

یہ تو ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ شفاء بنت عبداللہ العدویہ نے کب اسلام قبول کیا۔ یہ حضرت عمرؓ کی رشتہ دار تھیں اور لکھنے پڑھنے کی بھی ماہر۔ آنحضرتؐ نے ان ہی کو مامور کیا تھا کہ اپنی بیوی ام المومنین حفصہ کو بھی لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ یقیناً اُنہوں نے بھی ترویج اسلام میں خاص حصہ لیا ہوگا۔

قریش سے تعلقات

رسول مکّی روحنا فداہ کے تعلقات قریش سے سچ پوچھیے تو پوری سیرت نبویؐ پر حاوی ہیں اُن کا آغاز بعثت کے وقت سے ہوتا ہے اور اختتام فتح مکّہ کے بھی بعد حجۃ الوداع میں ہوتا ہے۔ اس کے مختلف اجزاء مختلف ابواب میں آ چکے ہیں۔ حقیقی سیاسی تعلقات کا آغاز بیعت عقبۂ ثالثہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد قریش نے آنحضرتؐ کے قتل کی سازش کر کے گویا اسلام کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا۔

ہجرت کاروانوں کی گزرکی بندش، بدر احد، خندق کے معرکے سب اسی کے اجزا ہیں چونکہ "عہد نبوی کے میدانِ جنگ" میں ان معرکوں کا پس منظر اور نتائج کافی تفصیل سے بتا دیے گئے ہیں۔ اس لیے یہاں ناظرین کو صرف اس کتاب کا حوالہ دے دینا کافی معلوم ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکّہ پر دو مضمون یہاں شریک کئے جاتے ہیں۔ ان میں بھی قریش سے سیاسی تعلقات پر کافی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ کی یہاں گنجائش یا ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

صلح حدیبیہ کی فتح یا
عہد نبوی کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریخ عالم میں ایک انقلابی نقطہ اور ایک عہد آفریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایران اور روم کی سلطنتیں دنیا پر چھا جانے کی کوشش میں باہم زندگی وموت کی آویزش میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ اگرچہ چین اور ہند میں بھی متمدن قومیں حکمران تھیں۔ لیکن بحرمتوسط اس زمانے میں بھی نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے بلکہ سیاسی و معاشی حیثیت سے "وسط الارض" (میڈی ٹرائین) تھا۔ یونان اسی سمندر پر آباد ہے تو روم بھی مصر وشام بھی اسی کے ساحل پر ہیں تو خود عرب کی شمالی سرحدیں اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ ایران بھی اپنے حدود مملکت اس تک پہنچانے کی کوشش میں تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے کئی بار کامیاب ہو چکا تھا۔ قدرت نے عرب کو ایشیاء یورپ اور افریقہ کے تینوں براعظموں کے بیچوں بیچ پیدا کیا ہے اور اس عرب میں بھی مکہ آباد ساحلی علاقے کے وسط میں واقع ہے اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ ناف زمین پر آباد ہے۔ اور پرانی دنیا کی کوئی عالمگیر تحریک اس سے بہتر مرکز مشکل سے پا سکتی ہے۔ یورپ کی سردیوں، افریقہ کی گرمیوں اور ایشیاء کی سر سبزیوں میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ حجاز کو عطا ہوا ہے۔ اور اس امر نے وہاں والوں کو تینوں براعظموں کی اخلاقی خوبیاں عطا کر دی تھیں۔ جنگی نقطہ نظر سے بھی اس سے محفوظ مقام کم مل سکتے تھے۔

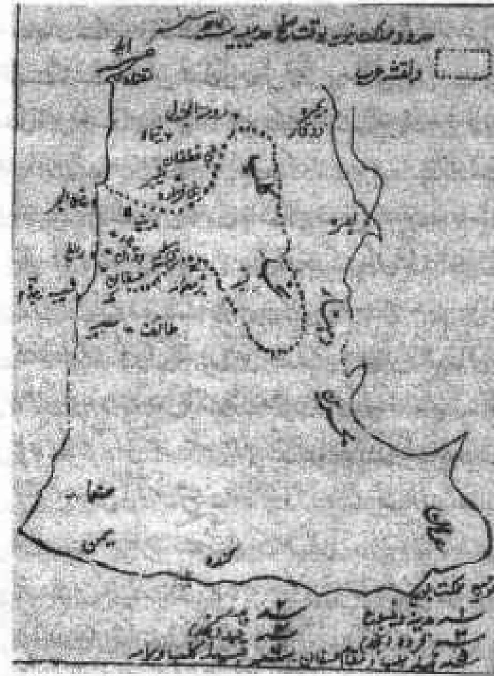
۶۱۰/۱۳ ق ھ میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آبائی شہر مکہ میں اصلاح دین کی کوشش شروع

فرمائی اور معدودے چند لوگوں کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ عام اہل ملک کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر تیرہ کٹھن سالوں کے اختتام پر ۶۲۲ء/۱ھ میں آپ کو وطن سے بے وطن ہو کر مدینہ منورہ جا رہنا پڑا جیسا کہ معلوم ہے۔ نراج میں آپ نے ایک تنظیم پیدا کرنے اور ایک شہری مملکت قائم کرنے میں کامیابی حاصل فرمائی جس کا تحریری دستور تاریخ نے آج تک (۵۲) دفعات کی ایک دستاویز کی صورت میں محفوظ رکھا ہے۔[1]

مدینہ آنے کے چند ہی مہینوں بعد آپ آس پاس کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرمانے اور ان سے حلیفانہ تعلقات قائم فرمانے لگے۔ چنانچہ مدینے سے ینبوع تک جو علاقہ ہے وہاں کے قبائل (بنی ضمرہ و مدلج وغیرہ) نے باوجود اسلام قبول نہ کرنے کے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر کوئی مدینے پر حملہ آور ہو تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں اور اگر ان کے علاقے پر کوئی چڑھائی کرے تو مسلمان ان کو مدد دیں۔ البتہ جارحانہ پیش قدمی میں غیر جانبداری برتی جائے۔[2] یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے۔ اور مکے والے اگر شام مصر یا عراق جانا چاہتے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستے کی بندش قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انہیں اتنا بے بس نہ کر سکی۔ ۳ھ میں اُحد میں مسلمانوں کو صدمہ پہنچا لیکن فوراً ہی انہوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ نجد کے علاقے میں جو مدینے کے مشرق میں ہے اپنے اثرات پھیلا دیے۔ اور مکے والوں کو عراق جانے کا جو متبادل گو تکلیف دہ راستہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ اسی اثنا میں بنی قینقاع اور بنی النضیر کے یہودی مضافات مدینہ سے جلاوطنی پر مجبور ہوئے تو انہوں نے مدینے کے شمال میں خیبر وغیرہ کی یہودی بستیوں میں جا کر بسنا اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنی شروع کیں۔ اور قریش وغطفان وغیرہ قبائل کو ورغلانے کا آغاز کیا۔ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل ایک بڑا اہم کاروانی جنکشن تھا۔ مدینہ آنے والے کاروانوں کو یہاں چھیڑا جانے لگا۔[3] جو کوئی تعجب نہیں کہ یہودی سرمایہ داروں کے اثرات ہی کے باعث ہوا ہو اور انہیں یہودیوں کی کوشش سے

۱۔ اس پر میرا مضمون "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" مجلہ طیلسانیین حیدر آباد دکن ۱۹۳۹ء
۲۔ ان کے متن کے لیے دیکھیے میری عربی تالیف "الوثائق السیاسیہ"
۳۔ التنبیہ والاشراف للمسعودی ص ۲۴۸۔

غطفان وفزارہ نے ایک طرف سے اور قریش اور ان کے حلیفوں نے دوسری طرف سے خندق کے معرکے میں مدینے کا محاصرہ کیا اور انتظام کر لیا گیا کہ عین نازک لمحے میں مدینے کے اندر کے باقی یہودی یعنی بنی قریظہ بھی غداری کریں۔ جب کسی طرح یہ بلا ٹلی اور بنی قریظہ کو اپنے کئے کی بھگتنی پڑی تو خیبر و تیماء اور وادی القریٰ و مقنا وغیرہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف نئے سرے سے شدید جدوجہد کا آغاز کیا۔



یہ مسلمانوں کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا۔ شمال میں خیبر وغیرہ یہودی قوت کے مرکز تھے۔ شمال مشرق میں فزارہ وغطفان کے قبائل خیبر والوں کے حلیف تھے۔ اور ان کی مسلمانوں سے بنتی نہ تھی۔ اور جب موقع ملتا یہ مسلمانوں کی تاخت کے درپے رہتے تھے۔[1] جنوب میں مکہ تھا جس کی قوت چاہے معاشی طور سے متاثر ہوئی ہو جنگی حیثیت سے برقرار تھی اور وہ سب

ا۔ عیینہ بن حصن الفزاری کی تاخت مدینہ وغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔

کے سب غم وغصہ سے بے قرار اور مسلمانوں کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے اور ناکامیوں کی جلن الگ تھی۔ آثار یہ نظر آ رہے تھے کہ خیبر میں جا بسے ہوئے (جلاوطنانِ مدینہ یعنی، بنی النضیر کی کوششیں رنگ لائیں گی۔ اور یہود، غطفان اور قریش کی سہ گانہ قوت مدینے پر ہلہ بول دے گی۔ جس کی مدافعت آسان نہ تھی۔ معرکہ خندق میں دس ہزار لشکر مدینے پر چڑھ آیا تھا، جس میں یہود شریک نہ تھے۔ مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا۔ خندق میں جوان اور بچے مل کر مسلمانوں کے پاس کوئی تین ہزار آدمی تھے۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

ضرورت تھی کہ خیبر اور مکہ دونوں کی قوت کا استیصال کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ وقت واحد میں ان دونوں مرکزوں پر حملہ کر سکتے۔ یا کم از کم مدینے کی مدافعت کے قابل محافظ دستہ چھوڑ کر کسی ایک مرکز کو تباہ کر سکنے والی فوج روانہ کر سکتے۔ ساتھ ہی اس کا بھی خوف لگا ہوا تھا، (جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے کتاب المبسوط[1] میں نہایت بالغ نظری اور تہ بینی سے واضح کیا ہے) کہ اگر مسلمان مکہ جاتے ہیں تو خیبر وغطفان مدینے پر چڑھ نہ دوڑیں۔ اور اگر مسلمان خیبر جائیں تو مکے والے اپنے حواشی وموالی کے ساتھ آ کر مدینہ لوٹ نہ لیں۔ کیونکہ مدینہ بیچوں بیچ واقع ہے۔ خیبر اس کے شمال میں کوئی پانچ منزل کی مسافت پر ہے تو مکہ اس کے جنوب میں بارہ منزل پر ہے۔

ان حالات میں سیاست دانی کا اقتضا وہی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک دشمن سے صلح کر کے دوسرے کے مقابلے میں اس کو دوست ورنہ کم از کم ناطرفدار بنا دیا جائے اور جب ایک سے فراغت ہو جائے گی تو دوسرا خود ہی ہتھیار ڈال دے گا اور پھر اُسے سرزوری کی جرأت نہ ہو گی۔ سوال یہ تھا کہ صلح مکے والوں سے کی جائے یا خیبر والوں سے؟ خیبر کے حلیف و معاون یعنی فزارہ وغطفان محض لوٹ مار کے شائق اور بالکل بے اصول خانہ بدوش عرب تھے

ا۔ جلد ۱۰ ص ۸۶ نیز انہیں کی شرح السیر الکبیر للامام محمد الشیبانی جلد اول ص ۲۰۱ جہاں قریش اور خیبر والوں میں ایک معاہدے کے ہو چکنے کا ذکر ہے۔ کان بین اہل مکۃ واہل خیبر من المواخاۃ علی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا توجہ علی احد الفریقین اغار الفریق الآخر علی المدینۃ فوادع اہل مکۃ لیأمن جانبہم اذا توجہ الی خیبر۔

خیبر میں یہودی تھے، جو تمدنی اور نسلی وجود سے عربوں سے الگ تھے۔ ان کو اپنی جلا وطنی اور جائیداد کے لٹنے کا داغ تھا۔ جو جائیداد کی واپسی کے بغیر مٹ نہ سکتا تھا۔ سرمایہ داری کی وجہ سے کوئی معمولی "مابہ الاختلاط" اُن کو مطمئن نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ ہی اُن کی بات پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ خیبر کا مالدار مرکز ایک نسبۃً غیر جنگجو قوم کے قبضے میں ہونے سے آسان تر مالِ غنیمت بھی تھا۔

دوسری طرف مکہ مسلمانوں کے لیے بہت رعایتوں کا متقاضی تھا۔ مسلمان مہاجرین سب مکی ہی تھے۔ اور اہلِ مکہ اُن کے رشتہ داروں کی نماز کا قبلہ اور حج کی منزل مقصود تھا۔ اہل مکہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قریش کے معاشی اور تمدنی تعلقات تمام عرب سے تھے۔ اور ان کی صلاحیتیں پورے عرب میں سب سے زیادہ تھیں، کیونکہ ان میں بات کا پاس تھا۔ وہ دھن کے پکے تھے، قومی مفاد کے لیے تن من دھن سے لگ جاتے تھے طبیعت مہمات پسند تھی۔ ادبی ذوق اور انتظام مُلک کی قابلیت و ملکہ بھی عام بدویوں کے مقابلے میں ان میں کہیں بڑھا ہوا تھا۔ اور شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث اب وہ واقعی صلح پر آمادہ بھی ہو چکے تھے اور صرف لاج رکھنے کے لیے کسی اچھی شرط کے منتظر تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا۔ اور مکے والوں کی رسد کے مرکز یمامہ پر بھی مسلمانوں کا (ثمامہ بن اُثال کے اسلام لانے کے باعث) قبضہ ہو کر درآمد بند ہو گئی تھی۔[1] رسول کریمؐ نے اس بندش کا اثر محسوس کرا دینے کے بعد اپنی مرضی اور اختیار سے ممانعت اُٹھا کر[2] نیز مکے والوں سے غرباء و فقراء کی امداد کے لیے سرمایہ قحط میں اسی زمانے میں پانچ سو اشرفیاں روانہ کر[3] کے وہاں کے عوام کے دل موہ لیے تھے۔ اور مکے کے سب سے بڑے اور با اثر سردار ابوسفیان کی لڑکی بی بی ام حبیبہؓ سے جو حبشہ گئی ہوئی تھیں، اسی زمانے میں عقد غائبانہ کر لیا تھا۔ نیز مختلف سامان ضرورت (کھجور وغیرہ) ابوسفیان کو "ہدیہ" بھیج کر معاوضے میں جانوروں کی کھالیں طلب کی تھیں۔[4] غرض باوجود حالت جنگ قائم رہنے کے

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۹۷ تا ۹۹۸۔ استیعاب ابن عبدالبر، سوانح عمری نمبر ۲۷۸۔
۲۔ ایضاً
۳۔ مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص ۹۱ تا ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص ۶۹۔
۴۔ مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص ۷۔

یہ خاموش دلدہی کے کام جاری تھے۔ قریش کے حج کا زمانہ بھی آ گیا تھا جس میں وہ مسلسل تین ماہ تک لڑائی بھڑائی حرام سمجھتے تھے۔ اور اس میں اُن کا سخت ترین دشمن بلکہ قابلِ قصاص ملزم بھی اُن کے شہر میں انہیں ملتا تو اس پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی قریش ہی کے کعبے کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا۔ اور حج کعبہ کو بھی اپنے دین کا جزء بنا لیا تھا۔ جس کا نفسیاتی اثر قریش پر پڑے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔

ان حالات میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ نے یہ سوچا کہ اگر حج کے مہینوں میں مکہ جائیں، اور ارادہ طواف کعبہ اور قربانی وعمرہ کے لیے ہو اور قریش کو منہ مانگی شرطیں پیش کی جائیں تو کوئی تعجب نہیں جو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں۔ اور اتفاق سے اسی زمانے میں نینوی کے مقام پر ایران و روم کی صدیوں سے چلی آنے والی جنگ ایران کی مکمل اور قطعی شکست پر ختم ہوئی تھی۔[1] اور کچھ اور اور نہیں تو عرب میں جو "لاوارث" ایرانی صوبے مثلاً یمن، بحرین اور عمان تھے، ان کے متعلق حسب دلخواہ کارروائی کرنے کا اس بین الممالک صورت حال کے باعث ایک خداداد اور نادر موقع بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ یمامہ پر قبضے کے باعث مسلمان پہلے ہی بحرین و عمان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ قریش کا ہموار ہونا یمن کا راستہ بھی کھول دیتا تھا۔ اور رومیوں کی نینوی میں کامیابی ابھی فی الحال شمال میں کسی بڑی کارروائی میں مانع تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ مدینے میں قابلِ کار مسلمان مرد تقریباً تین ہزار تھے۔ اب ذی قعدہ کے مہینے میں رسول کریمؐ چودہ سو آدمیوں کے ساتھ مدینے سے چلتے ہیں۔ حج کا احرام بندھا ہوا ہے ساتھ قربانی کے جانور ہیں۔ اور ارادہ محض مسالمانہ ہے اس لیے ساتھ جنگی ہتھیار تک نہیں ہیں۔ (البتہ کچھ دور جانے کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورے سے احتیاطاً مدینے سے فوجی مخزن منگا لیا جاتا ہے۔[2] جو ساتھ تو رہتا ہے مگر بند حالت میں) مسلمان کافی فوج مدینے میں چھوڑ گئے تھے اور خاموشی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ایک جاسوس جو کشفِ حال کے لیے پیشگی بھیج دیا گیا تھا اُس نے آ کر اثناء راہ میں اطلاع دی کہ قریش کو پتہ چل گیا ہے۔ اور وہ مقابلے کے تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور احابش وغیرہ حلیف قبائل کو بھی جمع کر رہے ہیں۔ آنحضرت نے

۱۔ دیکھئے گرلانڈ کی جرمن کتاب قیصر ہرقل جنگی Gerland
۲۔ تاریخ طبری ص ۱۵۳۱۔ Persische Feldzuge des Kaisers Heraklius

فوراً ایک جلسۂ شوریٰ کر کے سب سے دریافت کیا کہ آیا حسب ارادہ عمرے کے لیے بڑھے چلے جانا چاہیے یا قریش کے حلیفوں کے مسکنوں پر حملہ کیا جائے جہاں صرف عورتیں بچے ہوں گے، اور مال غنیمت، جانور، لونڈی، غلام آسانی سے حاصل ہوں گے، اور ان کو اچھا سبق مل جائیگا۔ آخر حضرت ابوبکرؓ کے مشورے پر عمل کیا گیا کہ عمرے کی مسالمانہ غرض ہی سے سروکار رکھا جائے (بدایہ ابن کثیر ۳/۱۷۰، ۴/۱۷۰ بحوالۂ بخاری) آپ بڑھتے چلے گئے۔ اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے حدود حرم شروع ہوتے ہیں اور جہاں سے ساحلی میدان ختم ہو کر دشوار گزار وادیاں اور پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ مکے والوں کو اطلاع مل گئی تھی۔ اور جنگی نقطۂ نظر سے حدیبیہ کے درّے کے دہانے پر حریف کو روکنے سے بہتر اُن کے لیے کوئی اور مقام نہیں مل سکتا تھا۔ یہ جگہ مکہ سے صرف دس بارہ میل پر واقع ہے اور اپنے گھر ہی میں رہ کر دور دراز سے آئی ہوئی اور ہر طرح کی رسد اور مدد سے منقطع اسلامی فوج سے لڑ سکتے تھے۔

حدیبیہ میں آتے ہی سفارتی سرگرمی شروع ہو گئی۔ قریش کے نمائندے اور کارندے آ آ کر مقصد معلوم کرنے لگے۔ آخر رسول کریمؐ نے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا کہ مختار کل کی حیثیت سے گفت وشنید کریں۔ مکے میں عجیب بدنظمی تھی اور کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کا سب سے بااثر سردار ابوسفیان بھی کسی نامعلوم راستے سے چُھپ چُھپا اور بچ بچا کر اُن دنوں شام گیا ہوا تھا۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ نظر بند ہو گئے اور ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو مسلمانوں کو خوف ہوا کہ کہیں انہیں شہید نہ کر دیا گیا ہو۔ اب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حدیبیہ میں انہوں نے مرنے مارنے کا اقرار کیا جس کا "اذیبایعونک تحت الشجرة" کے الفاظ میں قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ قریش کو خبر ملی تو وہ گھبرائے۔ آخر صلاح کر کے انہوں نے سہیل بن عمرو کو مختار کل کر کے سفیر بنا کر حدیبیہ بھیجا اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد صلح نامہ طے کیا۔ قریش کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مطالبہ کہ:

۱۔ مسلمان اس سال مکہ آئے بغیر واپس ہو جائیں اور سال آئندہ عمرہ کرنے آئیں۔

۲۔ کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ آئے اور پناہ گزیں ہو تو اس کی تحویل عمل میں نہ آئے لیکن کوئی مکی بھاگ کر آنحضرتؐ کے پاس آئے تو مطالبے پر اس کی قریش کے ہاتھ تحویل عمل میں آ جائے۔

۳۔ دس سال تک باہم صلح رہے۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں۔ اور تجارت وغیرہ مسالمانہ ضرورتوں سے ایک دوسرے کے علاقے سے گزرنے کی اجازت ہو۔

اسے جب مسلمانوں نے منظور کر لیا اور معاہدہ کے متن میں بجائے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے خالص اسلامی فارمولے کے قریشی فارمولا "باسمک اللّٰھم" لکھا جانا اور "محمد رسول اللہ" کی جگہ محمد بن عبداللہ" لکھا جانا طے ہوا تو گویا فتح قریش ہی کی ہوئی اور انہیں دبنا پڑا۔ اور بظاہر یہ صحیح بھی تھا، اور مسلمان سپاہیوں میں عام طور پر رنج کی لہر دوڑ گئی حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے دقیقہ رس مدبر بھی اپنی بے چینی کو چھپا نہ سکے۔ لیکن مسلمانوں میں نظم وضبط اتنا پکا آ چکا تھا۔ کہ جب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ طے ہو چکا ہے اور آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں تو پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ سوائے خاموشی اور اطاعت شعاری کے کچھ اور کریں۔

حدیبیہ کی اس صلح (یا بقول قریش "شکست") کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے لیے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں حیرت ہوتی ہے کہ یہ "برعکس نہند نام زنگی کافور" کیوں؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی حکومت تو قریش کی منہ مانگی شرطیں منظور کرنے کو تیار تھی۔ صرف خیبر سے جنگ میں ان کی غیر جانبداری مطلوب تھی۔ اسے قریش نے منظور کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ رعایتیں منظور کر لی تھیں۔ "باسمک اللّٰھم" کے فارمولے میں کوئی شرک یا بت پرستی نہیں ہے۔ اور اس کو نیز "محمد بن عبداللہ" کو منظور کرنے میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اسی طرح عمرے میں رکاوٹ معمولی امر ہے۔ اور "من استطاع الیہ سبیلا" کے باعث اس وقت وہ مسلمانوں پر فرض ہی نہ تھا۔ ایک طرف تحویل ملزمین کی تو بیہ خود جناب رسالتؐ نے یہ فرمائی کہ ہمارے پاس سے بھاگ کر جانے والا کافر ہی ہوگا۔ اور ہمیں اس کی ضرورت نہیں اور قریش کے پاس سے بھاگ کر آنے والا مسلمان ہی ہوگا۔ اور اگر وہ اپنے ہم وطنوں کے مظالم پر صبر کرے گا تو خدا اُسے اجر دے گا۔ یوں بھی چند ہی دنوں میں اسلامی عملداری سے باہر نومسلموں نے قریشی کاروانوں کا کچھ اتنا ناطقہ تنگ کیا کہ خود قریش نے جناب رسالتؐ سے التجا کی کہ اس شرط کو منسوخ کر کے ان نومسلموں کو مدینہ بلا لیں۔ اور تیسری شرط تو مسلمان خود ہی چاہتے تھے کہ قریش مسلمانوں سے

صلح کر لیں اور مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں۔ اور اس میں ذرہ بھی شبہ نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے لیے سخت ترین نازک زمانے میں حدیبیہ میں قریش کا اس "صلح پر آمادہ ہو جانا اسلامی سیاستِ خارجہ کی ایک واقعی "فتح مُبین" اور "نصرِ عزیز" تھی۔ جس کے باعث اُن کے ہاتھ کھل گئے اور فوری خطرات سے نجات ملنے پر انہوں نے آزادی کے ساتھ تین ہی سال میں پُر امن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا۔ اور وہاں سے رومی اور ایرانی اثرات بالکل خارج کر کے ایک ایسی مستحکم حکومت قائم کر دی جو پندرہ ہی سال میں تین براعظموں پر پھیل گئی۔ اور جو اس سے ٹکرایا پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ اور جس نے سرِ تسلیم خم کیا وہ اسلام کی رنگ و زبان سے بالا قومیت میں برابری کے حصے کے ساتھ شریک ہو گیا۔

یہی وہ صلح حدیبیہ ہے جسے عہدِ نبوی کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار کہنا چاہیئے۔

اس معاہدے کا متن عربی ماخذوں میں کہیں تو پورا پورا، کہیں جستہ جستہ ملتا ہے۔ جس کی تفصیل میں نے الوثائق السیاسیة (مطبوعہ مصر ۱۳۶۰ھ) میں دستاویز ۱۱ کے تحت دی ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ کافی ہوگا۔

معاہدہ حدیبیہ

۱۔ تیرے نام سے اے اللہ:۔

۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور سُہیل بن عمرو میں طے ہوا۔

۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے جس دوران میں لوگ امن سے رہیں۔ اور ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔

۴۔ یہ کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لیے مکّہ آئے تو اس کی جان و مال کا امان ہوگا۔ اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام (بروایت ابوعبید عراق یا شام) جاتے ہوئے مدینے سے گزرے تو اسے جان و مال کا امان حاصل ہوگا۔[1]

۱۔ یہ دفعہ ابن اسحاق اور ابن ہشام میں نہیں ہے۔ نہ ہی تاریخ طبری میں لیکن تفسیر طبری ابوعبید کی کتاب الاموال فتوح بلاذری اور بکری وغیرہ میں ہے۔

۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی (سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا تو آپؐ اُن کے سپرد کر دیں گے اور محمدؐ کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آ جائے گا وہ اُسے آپؐ کے سپرد نہیں کریں گے۔

۶۔ یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے۔ (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلافِ عہد دغا کریں گے۔

۷۔ یہ کہ جو محمدؐ کے معاہدے اور ذمّہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔ اور جو قریش کے معاہدے اور ذمّہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔

(اس پر قبائل خزاعہ نے اُٹھ کر کہا کہ ہم محمدؐ کے معاہدے اور ذمّہ داری میں شریک ہوتے ہیں۔ اور بنی بکر نے کہا کہ ہم قریش کے معاہدے اور ذمّہ داری میں شریک ہوتے ہیں۔)

۸۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا۔ اور ہمارے ہاں مکّہ نہ آئے گا البتہ سالِ آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں (مکّے میں) داخل ہو کر تین راتیں ٹھہر سکیں گے۔ تیرے ساتھ سوار کا ہتھیار ہوگا۔ یعنی تلوار میان میں پڑی ہوئی۔ اس کے سوا کوئی اور ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آ سکے گا۔

۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے جہاں ہم نے اُن کو پایا (یعنی حدیبیہ میں) اور ان کو حلال کر دیا جائے گا۔ اور اُن کو ہمارے پاس (مکّہ قربانی کے لیے) نہیں لایا جائے گا۔ اور صراحت کہ ہمارے اور تمہارے حقوق اور واجبات برابر کے ہوں گے۔

(غالباً) مہرِ نبوی — (غالباً) مہر سہیل بن عمرو

گواہانِ اسلام: ابوبکر، عمر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن سہیل بن عمرو، سعد بن ابی وقاص، محمود بن مسلمہ، ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہ۔

گواہانِ قریش: مکرز بن حفص وغیرہ۔

کاتب: علیؓ بن ابی طالب۔

ماخذ ہائے متن

تفسیر طبری ج ۔۲۶ ص ۶۱، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۴۷ تا ۷۴۸، فارسی ترجمہ سیرۃ ابن اسحاق ورق ۱۷۰/الف (مخطوط پارس) مغازی واقدی (مخطوط برٹش میوزیم) ورق ۱۳۰/الف طبقات ابن سعد ج ۱ حصہ ۲ ص ۷۴ نیز ج ۲ حصہ ۱ ص ۷۰ تا ۱۷۔ تاریخ طبری ص ۱۵۳۶ تا ۷۴ = سیرۃ طبری بروایہ البکری (مخطوطہ آیا صوفیا) فصل حدیبیہ، تاریخ ابن کثیر ص ۱۶۸ تا ۱۶۹۔ تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۳۳، تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۵۶۔ سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۳۔

ماخذ ہائے اقتباس متن

کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۴۴۱ تا ۴۴۴۔ صحیح البخاری ۶۴/۴۳ ے، ۶۴/۱۹/۵۳ ے، ۵۳/۷/۱، ۵۳/۱ وغیرہ اعلام السائلین عن کتاب سیدالمرسلین ابن طولون ۳۱ فتوح بلاذری ص ۳۶ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص ۵۵، صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔ (۱)

جدید بحث و ترجمہ

کاتیانی کی اطالوی تاریخ اسلام حالات ۶ ہجری مفرہ ۳۳۔ ہیفیننگ کی جرمن کتاب ''اسلام کا قانون خارجہ'' ضمیمہ دوم۔ اشپرنگر کی جرمن سوانح و تعلیمات محمدیؐ ص ج ۳ ص ۴۳۶ جہاں تھی کے ایک اور متن کا ذکر ہے، نقل نہیں۔ مجید خدوری کی انگریزی کتاب ''اسلام کا قانون جنگ و امن'' ص ۸۹، مزید حوالے فنسنک کی مفتاح کنوز السنۃ میں تحت عنوان حدیبیہ ہیں۔

۱۔ بعض اور حوالے یہ ہیں: خراج لابی یوسف ص ۱۳۹۔ کنز العمال جلد ۵ ع ۵۵۳۴ ع ۵۵۳۶ عن ابن ابی شیبہ۔

فتح مکہ سے انسانیت کی فتح بہیمیت اور شیطانیت پر

۲۷ رمضان ۱۳ ق ھ کو شہر مکہ کے مضافات میں جبل نور کے غار حرا سے ایک بجلی کوندی اور سینکڑوں ہزاروں سال سے وہ حق کی تلاش میں انسان جس سرگردانی میں مبتلا تھا اُس سے اُسے نجات مل گئی۔ اپنے اور اپنے بنانے والے کے صحیح تعلقات اور اپنی زندگی کا مقصد معلوم کرنے کے سلسلے میں وہ من مانی باتوں اور من گھڑت اوہام سے جس تاریکی در تاریکی میں گھسا چلا جا رہا تھا۔ اور مختلف ادوار میں کسی روزن سے بجلی سی روشنی نظر آنے کے باوجود وہ پھر جلدی ہی جس بھول بھلیاں میں پھنس جاتا تھا اُس سے باہر آنے کا اُسے راستہ مل گیا۔ اور اُس نے یہ عجیب چیز معلوم کی کہ وہ اب تک غار کے دروازے ہی میں مگر اندر کی طرف منہ کئے کھڑا ہے۔ اُس نے منہ دُوسری طرف کیا اور توحید کے روشن میدان میں نکل آیا۔ اوّلاً یہ راستہ ایک شخص نے دیکھا اور اس نے ساتھیوں کو آواز دی کہ پیٹھ پھیرو اور سامنے بڑھو (اباوٹ ٹرن، فارورڈ مارچ) چند نے فوراً تعمیل کی چند نے اُن باہر نکلنے والوں کو روکنا بلکہ پیچھے سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ لیکن پشت کی طرف پلٹنے والے کو فوراً روشنی نظر آ جاتی تھی۔ وہ اب کسی برخود غلط کے روکے کہاں رُکتا تھا۔ برخود غلط دلسوزی سے راہ یاب کو روکتا اور کشاکش پر نوچتا کاٹتا اور پیٹتا تھا۔ اس پر رہبر اعظم اور اس کے راہ یاب ساتھیوں نے انتہائی ایثار اور بے نفسی سے ان مصیبت زدہ بلا رسیدوں اور برخود غلط حماقت پردازوں دونوں کو بزور تاریکی سے باہر نکالنے کی ٹھان لی۔ اس کوشش میں خود تکلیف اُٹھائی مگر خوشی

سے اُسے گوارا کیا۔ اور بر خود غلط کی انتہائی ظالمانہ تکلیف دہی پر اس رہبر اعظم اور کوہ ثبات کی زبان سے نکلا بھی تو یہی نکلا (خدایا! میرے لوگوں کو ہدایت دے وہ جانتے نہیں ہیں۔) غرض کسی کو پچکار کر، کسی کو دھمکا کر، اور کسی کو زبردستی دھکیل کر باہر نکالا یہاں تک کہ وہ ایک غار (عرب) پوری طرح خالی ہو گیا۔ اور اس رہبر اعظم کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اب اُس کے جانشینوں نے اپنے ناف ارض کے کھلے میدان سے دیکھ لیا کہ اطراف کتنے اور غار ہیں۔ اور محسن اعظم کے اسوۂ حسنہ میں تمام غاروں کے مصیبت زدوں کی رہائی کی ٹھان لی۔ اور یہی کام اب تک روز افزوں کامیابی سے جاری ہے۔

یہ کوئی افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ اس رہبر اعظم کی اس بے نفسانہ کشمکش کے آخر منازل ہی فتح مکہ کی صورت میں پیش آئے اور اس کی کچھ توضیح و تفصیل مطلوب ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ روحی فداہ نے غار حراء میں حقیقت و صداقت کا جو راستہ شب قدر کو دیکھا تو گھر آ کر اہل و عیال کو پھر اہل خاندان اور پھر اہل شہر کو اس کی جانب متوجہ کیا۔ اس سے سب واقف ہیں کہ توحید اور خدا پرستی اور صحیح انسانیت کی اس تعلیم و تبلیغ میں آپ کو کیا دشواریاں پیش آئیں۔ اور کس طرح دس سال کی شبانہ روز تن من دھن کوشش کے باوجود پچیس پچاس سے زیادہ لوگ ہم خیال نہ ہو سکے۔ کس طرح تبلیغ میں تکلیفیں سہنی پڑیں۔ کس طرح طائف جلا وطن ہونا پڑا۔ کس طرح چند مدینے والے ایک موقع پر اتفاقاً ملے اور اتباع قبول کی۔ کس طرح اُن کی تائید کے وعدے پر سب مسلمان ہجرت کر کے مکے سے مدینہ چلے گئے۔ اور ان کے مال و متاع پر اہل مکہ نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔

مدینے پہنچتے ہی آنحضرت صلعم نے سب سے پہلے اپنے بے خانماں ساتھیوں کی رہائش کا انتظام کیا۔ پھر ان مہاجرین اور مدنی مسلمانوں اور ہمدردوں میں تنظیم پیدا کر کے ایک شہری مملکت کی بنیاد ڈالی۔ شہر میں اب مہاجرین مکہ، مدنی مسلمان اُن کے رشتہ دار غیر مسلم عرب، اور یہودی قبائل تھے ان سب کو اپنی سرداری میں ایک مرکز پر جمع کیا۔ اور ایک وفاقی شہری مملکت قائم کی خوش قسمتی سے اس وفاق کا دستور جو ۱ھ میں مرتب ہوا تھا اور جو پچاس ایک دفعات پر مشتمل ہے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ (دیکھئے کتاب ''عہد نبوی کا نظام حکمرانی'' باب ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور عہد نبوی کی ایک اہم دستاویز'')

اس دستور کے ذریعے سے شہر کی حفاظت و مدافعت اور قریش سے مقابلے کا انتظام شروع ہوا۔ ہجرت کے دو چار مہینے ہوئے تھے کہ ان امور سے فارغ اور اندرونی حفاظت و استحکام سے مطمئن ہونے کے بعد اطراف پر توجہ شروع ہوئی۔ مدینے سے ساحل ینبوع کوئی پچھتر اسی میل ہو گا۔ اس علاقے میں بنی ضمرہ، بنی مدلج وغیرہ قبائل بستے تھے۔ ان سے آنحضرتؐ نے حلیفی کی کہ اُن پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان ان کو مدد دیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ کریں تو یہ مدد کو آئیں گے۔ یہ معاہدات بھی تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔

نقشے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ اہل مکہ جو ہر سال تجارتی کارواں شام و مصر بھیجتے اور خشکی کی راہ سفر کرتے تھے وہ بنی ضمرہ وغیرہ قبائل کے علاقے سے گزرنے پر مجبور تھے۔

اب آنحضرتؐ نے اپنے ان حلیفوں کی مدد سے قریش کا راستہ بند کر دیا۔ اور ان پر معاشی دباؤ ڈال کر بدلہ لینے اور مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ قریش نے جھنجلا کر ماہ رمضان ۲ھ بدر میں آنحضرتؐ اور آپ کے ساتھیوں کو گھیر لینے کی کوشش کی۔ مگر منہ کی کھائی۔ اور ایک بہترین فوجی نظام سے تین سو مسلمانوں نے ایک ہزار کے لشکر کو تتر بتر کر دیا۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے قریش نے سال بھر تیاری کی۔ اور ایک شوال ۳ھ میں مدینے پر چڑھ دوڑے۔ اور شہر کے باہر احد کے میدان میں مقابلہ کیا۔ اور مسلمانوں کی فوج کو اتفاقاً پسپا کر دینے کے باوجود لڑائی ملتوی کر دی اور مکے واپس ہو گئے۔ مسلمانوں نے بہت جلد اپنا وقار دوبارہ حاصل کر لیا۔ اور ساتھ ہی آنحضرتؐ نے اپنا اقتدار مدینے کے جنوب مشرق میں نجد کی طرف بڑھا لیا۔ اور قریش کے ساحلی راستے کی طرح عراق وغیرہ جانے کا صحرائی راستہ بھی بند کر دیا۔ پھر مکے کے اطراف کے قبائل سے معاہدات دوستی کیے۔ اُن کو اپنی مدد کا یقین دلایا اور قریش سے تعلقات منقطع کر لینے پر آمادہ کیا۔ پھر مدینے کے شمال کی طرف توجہ کی اور دومۃ الجندل کے اہم مقام تک (جو شام اور عراق جانے والے کارروانوں کا جنکشن تھا) اپنے اثرات پھیلا دیئے۔ اور قریش کے تجارتی تعلقات شمال میں بالکل بند کر دیئے۔ اسی اثناء میں مدینے کے یہودی مسلمانوں سے لڑ کر اپنے کیے کی سزا پا چکے تھے۔ اور مدینہ سے جلا وطن ہو کر خیبر وغیرہ میں جا آباد ہو گئے تھے ان یہودیوں کے ورغلانے اور ساتھ دینے کا یقین دلانے پر قریش

نے ایک انتہائی کوشش کی۔ اپنے تمام حلیف قبائل کو جمع کیا۔ یہودی اور یہودیانِ خیبر کے حلیف قبائل غطفان وغیرہ کو بھی لوٹ کی طمع دلائی۔ غرض دس ہزار کے جم غفیر سے مدینے پر حملہ کیا۔ خود مدینے کے باقی یہودی بھی بغلی گھونسہ بننے کی دھمکی دینے لگے۔ یہ شوال ۵ھ کا واقعہ ہے۔ اپنے تین ہزار سپاہیوں کی مدد سے آنحضرتؐ نے شہر کے غیر محفوظ رُخ پر پندرہ دن کے عرصے میں خندق کھدوائی اور عین اس وقت فارغ ہوئے جب دشمن آ پہنچا۔ محاصرہ کنندہ متحدین میں سے چند قبائل کو آنحضرتؐ نے ابتداً توڑ لینے کی کوشش کی اور مدینے کے باغات کی تہائی کھجور لے کر چلے جانے پر وہ آمادہ بھی ہو گئے۔ لیکن اہلِ مدینہ نے اس قدر کثیر معاوضہ منظور نہ کیا۔ پھر اس اثناء میں یہودیوں اور اہلِ مکہ میں باہم بے اعتمادی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے بھیجے ہوئے کارندے دعایہ کاری میں اتنے کامیاب ہوئے کہ قریش نے دل برداشتہ ہو کر محاصرہ اُٹھا لیا۔ اور مکے واپس ہو گئے۔ اور غطفان وغیرہ بھی اکیلے کیا کرتے۔ فوراً رفو چکر ہو گئے۔

اب انتہائی مشرق یمامہ تک آنحضرت کا اثر پھیل گیا۔ اور ۷ھ کے آغاز میں وہاں کے بعض سرداروں (ثمامہ بن اثال) کے اسلام لانے سے وہاں سے غلّے کی برآمد مکے کے لیے بند ہو گئی اس سال اتفاق سے عرب میں قحط بھی پڑا۔ تجارت کے بالکل رُک جانے، غلّہ وغیرہ کی منڈیوں کا راستہ بند ہو جانے اور پے در پے ناکامیوں سے قریش بے بس ہو چلے تھے گو اُن کی فوجی قوت ابھی نہ ٹوٹی تھی۔

اس وقت مسلمانانِ مدینہ کی یہ حالت تھی کہ شمال میں غطفان اور خیبری یہودی خار کھائے بیٹھے۔ اور جنوب میں اہلِ مکہ مخالفت کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جو کرنے کو تیار نہ تھے۔ مسلمانوں کی قوت اتنی نہ تھی کہ وقتِ واحد میں دونوں پر اقدامی حملہ کر کے دونوں دشمنوں سے نجات حاصل کرتے۔ کسی ایک سے مقابلہ ممکن تھا۔ لیکن جیسا پانچویں صدی ہجری کے مشہور سیاست داں فقیہ شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ اگر مدینے والے خیبر پر حملہ کرتے تو خوف تھا کہ شہر کو فوج سے خالی پا کر مکے والے نہ چڑھ دوڑیں۔ اور نہ لوٹ لیں۔ اور اگر جنوب میں مکے کی طرف جائیں تو یہی خوف شمال یعنی خیبر سے تھا کیونکہ مدینے کا محل وقوع مکے اور خیبر کے بیچ میں ہے۔ ان حالات میں ذی قعدہ ۶ھ میں آنحضرت نے یہ فیصلہ کیا

کہ مکے یا خیبر دونوں میں کسی ایک سے صلح کر لینی چاہیئے۔ اور اس غرض کے لیے آپؐ نے مکے کا انتخاب کیا۔ اور آپ کا خیال غالباً یہ تھا کہ مکے والے جو قحط و افلاس سے بے بس تھے آسانی سے صلح منظور کر لیں گے۔

اس سے پہلے آپؐ نے پانچ سو اشرفیاں مکے کے سردار ابوسفیان کو بھیجیں کہ وہاں کے قحط زدہ فقراء میں تقسیم کر دے۔ اس کی خبر مکے میں پھیلی تو ظاہر ہے کہ اہلِ مکہ آنحضرتؐ کو ایک شریف دشمن سمجھنے اور کہنے لگے۔ گو وہاں کے لیڈر جھلائے اور اسے سازش سے تعبیر کیا۔

اس کے بعد حج کے موسم میں جب کہ قریش لڑائی حرام سمجھتے تھے آنحضرتؐ اپنی نصف فوج مدینے میں چھوڑ کر پندرہ سو آدمیوں کے ساتھ حج کے نام سے روانہ ہوئے تا کہ قریش کو گھبراہٹ نہ ہو اور مزید اطمینان دلانے کے لیے لڑائی کے پورے ہتھیار بھی ساتھ نہ رکھے۔ حدیبیہ پہنچ کر (جو مکے سے دس میل پر واقع ہے۔ اور آج کل شمیسی کہلاتا اور موٹروں کی تنقیح کا اسٹیشن ہے) آپؐ نے قریش سے گفت و شنید کی۔ اور قریش کی منہ مانگی شرطیں منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ ایک زبردست دشمن جسے بارہا انتہائی کوشش کے باوجود زیر نہیں کیا جا سکا تھا، وہ خود منہ مانگی شرطیں منظور کر رہا تھا قریش نے خیال کیا کہ اور کیا چاہیئے۔ صلح منظور کی۔ اور یہ طے کیا کہ آئندہ دس سال تک قریش اور اُن کے حلیف آنحضرتؐ اور آپ کے حلیفوں سے نہیں لڑیں گے۔ اور ہر ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہے گا۔ یہ کہ آنحضرتؐ قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے۔ اور یہ کہ کوئی مسلمان مکے آئے تو وہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن کوئی مکے والا مدینے آئے تو اہلِ مکہ کی خواہش پر اس کی تحویل عمل میں آئے گی۔

یہ آخری شرط قریش نے اپنا بڑا پن دکھانے کے لیے منظور کرائی جس سے انہیں فائدہ نہ ہوا۔ لیکن مسلمانوں کی لڑائیوں میں غیر جانبداری منظور کر کے انہوں نے آنحضرتؐ کو اس کا موقع دیا کہ آپ خیبر کی قوت توڑ دیں۔ اور یہ عظیم الشان غلطی کی کہ یہود سے تعلقات نہ رکھ کر آئندہ اس قوی حلیف کی مدد سے محروم ہو جائیں اور مسلمانوں کے واحد ہدف بنیں۔

حدیبیہ میں قریش کو یہودیوں کے متعلق غیر جانبدار رہنے پر آمادہ کر دینا وہ زبردست سیاسی اور سفارتی (ڈپلومیٹک) کامیابی کہ اُس کے متعلق قرآن مجید کا دیا ہوا نام "فتح مبین" ذرا

بھی مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ حدیبیہ سے فارغ ہو کر مدینے آ کر دو ہی ہفتوں کے بعد خیبر کی طرف کوچ بول دیا گیا اور ایسی چالیں چلی گئیں کہ خیبر والوں کی مدد کو کوئی نہیں آیا۔ یہاں تک کہ غطفان کے حلیف بھی اپنے گھروں میں بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ اور حسب توقع بہ آسانی اس خطرے کا ہمیشہ کے لیے ازالہ کر دیا گیا۔

اس کامیابی سے اس بات کا موقع ملا کہ مزید دوستیاں بڑھائی جائیں۔ چنانچہ اس زمانے میں بحرین اور عمان کی ایرانی نو آبادیاں زیادہ تر سفارتی کوششوں سے اپنے مرکز سے ٹوٹ کر مدینے سے جڑ گئیں۔ اور قریش کا سوائے ان کے اپنے چند ہزار افراد کے کوئی مددگار نہیں رہا۔ اور جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے ہوئے معاہدے کی کچھ خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلے کے خلاف چھپ کر کچھ مدد دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سزا دہی کا مقابلہ کرنے کی ان میں کوئی طاقت نہ تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر خون بہائے مکّے پر قبضہ کر لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ نگار عرصے سے مکّے میں تھے اور دشمن کی ہر نقل و حرکت کی بروقت اطلاع دے دیا کرتے تھے۔ ان پیشگی اطلاعوں سے احد اور خاص کر خندق کی جنگ میں بڑی مدد ملی تھی ورنہ خندق کے معرکے کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے انتہائی شمال میں گئے ہوئے تھے اور بروقت اطلاع کے باعث آدھے راستے سے مدینے واپس آ کر پورے دو ہفتے خندق کی تیاری اور دیگر حفاظتی کارروائیوں میں صرف کرنے کے قابل ہوئے تھے۔

اس کے ساتھ اپنی نقل و حرکت کی خبر پر پورا قابو تھا۔ چنانچہ مکّے کی طرف دس ہزار کا لشکر کوچ کرتا ہے اور قریش کو ابن ہشام کے الفاظ میں "حبس الطرق" یعنی راستوں کی بندش کے باعث اس وقت تک خبر نہ ہو سکی جب تک کہ مکّہ کے پہاڑوں کے عین نیچے پڑاؤ نہ لگ گیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّے کو اطلاع دی کہ جو شخص اپنے گھروں میں رہے یا کعبے کی مسجد میں چلا جائے یا ہتھیار پیش کر دے تو اسے اسلامی فوج بالکل نہیں چھیڑے گی۔ اس کے بعد فوج کے تین حصے کئے اور شہر میں جانے کے تینوں راستوں سے داخلہ شروع کیا اور تاکید کی کہ کوئی خونریزی نہ ہو شہر پر پوری طرح قبضہ ہونے اور کعبے کے اندر اور اطراف

کے بتوں کو توڑ پھوڑ کر ان کے لائق مقام پر پہنچانے کے بعد شہریوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ پھر ان کو ان کی کارستانیاں بتا کر پوچھا کہ تمہیں اب مجھ سے کیا توقع ہے؟ انہوں نے کہا کہ جو ایک شریف اور شریف زادے سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اس پر رحمۃ اللعالمین کی زبان سے نکلا "ہاں اب تم سے کوئی مواخذہ نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔" اب اس اعلان کی صدا کیا گونج رہی تھی کہ پورا مکّہ "لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا کلمہ پڑھ کر اپنی قلب ماہیت کا ثبوت دے رہا اور اپنی مکمل اور غیر مشروط اطاعت کا یقین دلا رہا تھا۔

حبشہ اور عرب

قبل اسلام اور ابتدائے اسلام میں

قدیم زمانے میں حبش نامی ایک قبیلہ ہمیں یمن میں ملتا ہے۔ اسی بنا پر نیز علم کا سے سر کے تحقیقاتی نتائج کے طور پر اب یہ خیال روز افزوں مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے کہ حبشی اصل میں یمن سے آئے ہوئے نو آبادکار ہیں۔ حبشہ (یا ابی سینیا) میں ایک صوبہ ''امہرہ'' بھی ہے۔ اس کا اب ''مہرہ'' سے تعلق قائم کیا جا رہا ہے، جو جنوبی عرب میں حضر موت کے مشرق میں ایک بڑے علاقہ ہے۔ لسانیاتی تحقیقات نے بھی مہرہ اور امہرہ کی بولیوں میں بڑی قربت ثابت کر دی ہے۔ اور میں نے ۱۹۳۳ء میں دیکھا تھا کہ جامعۂ پاریس کے مدرسۃ السنۂ مشرقیہ میں اس مسئلے پر خاص طور سے توجہ کی جا رہی تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً ایک سو سال پہلے یمن میں ذوانواس نامی ایک یہودی بادشاہ گزرا ہے۔ اس کے زمانے میں نجران میں عیسائیت بہت عام ہو گئی تھی۔ طبری نے دو روایتیں بیان کی ہیں۔ ذونو اس نے یہودیت میں غلو کے باعث نجرانیوں کو عیسائیت چھوڑنے اور یہودیت قبول کرنے کا حکم دیا۔[1] یا یہ کہ ایک یہودی کے دو بچے نجران میں مارے گئے تھے۔ اور ان کے باپ کی شکایت پر اس نے نجرانیوں کو نہائیہ (الٹی میٹم) بھیجا۔[2] اور جب نجرانیوں نے عیسائیت کو چھوڑنے سے انکار کیا تو بڑی فوج لے کر ان کے صوبے میں پہنچا اور عیسائیوں کا بڑی بے رحمی سے قتل عام کیا۔ چنانچہ بڑے بڑے کھڈے یا

۱۔ تاریخ طبری (صفحہ ۹۲۵) ۲۔ تاریخ طبری (صفحہ ۹۲۰)

گڑھے کھدائے ان میں آگ جلا دی اور عیسائیت سے انکار نہ کرنے والوں کو ان میں زندہ جھونک دیا۔[1] مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن مجید (۸۵: ص ۴ تا ۷) میں آیت (قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ) میں اس واقعے کی جانب اشارہ ہے۔

بچے کچھے آدمیوں میں سے ایک حبشہ پہنچنے میں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو گیا۔ اس نے جلی ہوئی انجیل نجاشی[2] کو دکھائی اور فریاد وزاری کر کے انتقام پر توجہ دلائی۔ نجاشی نے جلی ہوئی انجیل بیزنطینی شہنشاہ کے پاس قسطنطنیہ بھیج دی اور کشتیاں مہیا کرنے کی استدعا کی۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ نجران کا فریادی براہ راست قیصر ہی کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے کہا کہ میرا ملک بہت دور ہے میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ نجاشی کو میں خط لکھتا ہوں۔ وہ بھی عیسائی ہے اور اس کا ملک تمہارے ملک کے قریب ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہارا انتقام لے گا۔ قیصر کی مہیا کردہ کشتیاں حبشی بندرگاہوں میں پہنچ گئیں اور خود نجاشی نے سات سو (۷۰۰) کشتیاں تیار کرائیں اور مقامی بندرگاہوں میں تجارت کی غرض سے آئی ہوئی ایرانی اور دیگر تاجروں کی بھی بہت سی کشتیاں بیگاری کے لیے روک لی گئیں۔ ان سب پر عرب کے مقامی روایتوں کے مطابق ستر ہزار اور یونانی مورخوں کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی سوار کئے گئے اور آبنائے باب المندب کو عبور کر کے، جس اثناء میں بہت سی کشتیاں طوفان میں ڈوب گئیں۔ یمن کے ساحل پر جا اترے۔ ابن الکلبی کا بیان ہے کہ پہلے کچھ فوج بھیجی گئی جو بذات خود اتنی کافی تھی کہ ذونو اس کو مقابلے کی تاب نہ رہی۔ اس نے بہت بڑی رقم پیش کرنے کے وعدے پر امان چاہا۔ اور جب حبشی افسر رقم وصول کرنے آئے تو دھوکے سے انہیں قتل کرا دیا۔ پھر بے سری فوج کا صفایا آسان کام تھا۔ اس شکست کا انتقام لینے کے لیے نجاشی نے ستر ہزار حبشی فوج بھیجی۔ لاطینی مورخوں کے مطابق پندرہ ہزار کا مقدمۃ الجیش پیاس اور تھکن کے باعث تباہ ہو گیا۔

۱۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے حیرہ کے حکمران کو بھی ترغیب دلائی کہ وہ بھی اپنے علاقے میں عیسائیت کو ختم کر دے جیسا کہ سریانی و دیگر حوالوں سے دیولاوے نے اپنی فرانسیسی کتاب ''عرب'' (صفحہ ۲۷) عمود دوم وصفحہ (۸۳) عمود اول وتعلیق نمبر ۱ میں بیان کیا ہے۔

۲۔ لفظ عربی میں غیر مشدد جیم کے ساتھ مستعمل ہے۔ اس معرب لفظ کا حبشی اصل نگوس (Ngos) ہے۔ جس کے لفظی معنے بادشاہ کے ہیں اس سے مراد کوئی اور نہیں بلکہ حبشہ کا بادشاہ ہوتا ہے۔

لڑائی کا انجام یہ ہوا کہ ذونواس کو شکست ہوئی اور اس نے خودکشی کر لی۔ اس کے بعد یمن پر حبشی قبضہ ہو گیا اور یہ علاقہ نجاشی کے قبضہ میں آ گیا۔[1]

ابرہہ کی گورنری

کچھ دن بعد دو بڑے حبشی افسروں ارباط اور ابرہہ میں اَن بَن ہو گئی۔ اور ارباط کو قتل کر کے ابرہہ یمن کا گورنر بن گیا۔ نجاشی کو بھی امر واقعہ کا گوارا کرنا اور ابرہہ کی گورنری کو تسلیم کرنا ہی بہتر معلوم ہوا تا کہ ملک میں مزید خونریزی نہ ہو۔

ابرہہ بڑا دیندار عیسائی تھا۔ اس نے ملک میں عیسائیت پھیلانے کی بڑی سرگرم کوشش کی اور یمن کے پایۂ تخت صنعا میں ایک بہت بڑا کلیسا تعمیر کرایا، جس کا نام قلیس (یعنی کلیسا) رکھا۔ اس کی تعمیر میں بیزنطینی قیصر نے قسطنطنیہ سے بہت سے کاریگر، سنگ رخام اور چینی کی منقش اینٹیں بھیجیں۔ جب کلیسا تعمیر ہو گیا تو اسکندریہ کے بطریق نے ایک اطالوی پادری گرے جن تیوس (Gregentius) کو وہاں روانہ کیا۔[2] نجران میں بھی ایک گرجا اور شہداء کا قبرستان تعمیر کیا گیا۔

مارب کا کتبہ

ابرہہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک رعایا پرور حکمران ثابت ہوا۔ اس نے مقامی تالابوں وغیرہ پر توجہ کی۔ اس کے کتبے اب بھی یمن میں دستیاب ہوتے ہیں۔ اور ان سے بہت سی تاریخی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

مارب کے تالاب کا کتبہ دلچسپی کی خاطر (ارض القرآن مؤلفہ سید سلیمان ندوی ۱/۳۱۹ تا ۲۰ سے) نقل کیا جاتا ہے:

۱۔ تفصیلات کے لیے سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۳ مابعد طبقات ابن سعد جلد ۱/۱ صفحہ ۵۵ تا ۵۶ تاریخ طبری صفحہ ۹۲۵ مابعد معارف ابن قتیبہ صفحہ ۳۱۱۔ اور اخبار الطوال للد ینوری صفحہ ۶۳۔ دیورشے کی فرانسیسی کتاب ''عرب'' صفحہ ۰۷۔

۲۔ چنانچہ (۲۳) دفعات کا ایک دستور العمل اس ملک میں نافذ کرایا جس کی یونانی اصل اب بھی ویانا کے کتب خانے کے مخطوطوں میں محفوظ ہے۔ (دیکھئے دیورشے کی فرانسیسی کتاب ''عرب'' صفحہ ۱۷ کالم دوم۔ تعلیق)

''مہربان رحم والے (رحمان رحیم)، اس کے مسیح اور روح القدس کی مہربانی سے ابرہہ اکسومی حبشیوں کا رئیس ارامیس، ذیبان شاہ حبش کا محکوم سبا، ذوریدان و حضرموت یمنات تہامہ و نجد کا بادشاہ یہ یادگار قائم کرتا ہے کہ اس نے اپنے عامل یزید بن کبشہ پر فتح پائی جس کو اس نے کندہ اور ردی پر حاکم بنایا تھا اور سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ اور رؤسائے سبا میں سے مرہ، ثمامہ، حبش، مرثد اور ضف ذو (یعنی قلعہ دار) خلیل اور آل یزن، رؤسائے (اقیال) معدی کرب بن سمیفع اور ہفان اور اس کے ہم برادر (رشتہ دار) فرزندان اسلم اس کے ساتھ تھے۔

بادشاہ نے اس کے مقابلے میں جراح قلعہ دار ز ہور کو بھیجا۔ یزید نے اس کو مار ڈالا۔ اور قصر کدار کو ڈھا دیا۔ اور کندہ حریب اور حضرموت کے قبائل سے اس نے جمعیت اکٹھا کی۔

''بادشاہ کو خبر ملی تو اپنی حمیری اور حبشی فوج ہزاروں کی تعداد میں ماہ ذوالقیاط...... ۶۵۷ (یعنی مطابق ۵۴۳ء) میں لے کر چلا۔ جب مارب کی وادیوں میں پہنچا تو یزید خود آیا اور تمام سرداروں کے سامنے اس کی اطاعت قبول کر لی ...... اس اثنا میں مارب کے تالاب کی دیوار، حوض اور دروازے کے ٹوٹنے کی خبر ماہ ذوالمدرح ۶۵۷ (یعنی مطابق ۵۴۳ء) میں آئی۔ قبائل کو فرمان بھیجا کہ پتھر، لکڑی اور سیسہ بند کے درست کرنے کے لیے مہیا کریں۔ بادشاہ پہلے مارب گیا اور وہاں کے کنیسے میں نماز ادا کی۔ پھر موقع پر گیا۔ نیو کھودی اور تعمیر شروع ہوئی۔

''بادشاہ ان رئیسوں سے معاہدہ کر کے واپس آیا یعنی شہزادۂ اکسوم، قلعہ دار معاہر یعنی فرزند بادشاہ مرجزف قلعہ دار ذرناج، عادل قلعہ دار قالش اور قلعہ داران شولمان شعبان، رعین، ہمدان وغیرہ''......

''مہربان (رحمان) کی عنایت سے نجاشی، قیصر روم، منذر (یعنی حیرہ کے بادشاہ) اور حارث بن جبلہ (غسان کے بادشاہ) اور دوسرے بادشاہوں کی طرف سے دوستی اور محبت کے اظہار کے لیے ماہ دوان ۶۵۷ (یعنی مطابق ۵۴۳ء) میں سفیر آئے ......''

اَصْحَابُ الْفِیْل

مارب ساگر کی اس مرمت کے ستائیس سال بعد ۵۷۰ء میں اس ابرہہ نے مکہ معظمہ پر حملہ کر دیا۔ عرب مورخ اسے "اصحاب الفیل" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جدید یورپی مؤلفوں کا خیال ہے کہ ابرہہ حقیقت میں خشکی کی راہ سفر کر کے شام جانا اور بیزنطینی شہنشاہ کو ایران کے خلاف مدد دینا چاہتا ہوگا۔

مگر عرب مورخ[1] اس کا باعث اپنے بعض ہم وطنوں کی شرارت بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ قلیس (کلیسائے صنعا) کی تعمیر سے بت پرست عربوں کو سخت غصہ آیا اور ان میں سے ایک من چلے کو جو سوجھی تو وہاں پہنچ کر چپکے سے ایک رات غلاظت کی اور بھاگ آیا۔ دریافت اور تحقیقات پر یہ قیاس کیا گیا کہ کسی مکے والے کی شرارت ہے۔ اور کعبے کی خاطر قلیس کی تذلیل کی گئی ہے۔ غرض ابرہہ بہت سی فوج اور ایک ہاتھی[2] لے کر روانہ ہوا۔ جب مکے کے قریب پہنچے تو قرآن مجید کے مطابق پرندوں کے جھنڈ (طیراً ابابیل) آئے اور پڑاؤ پر کنکریاں گرائیں۔ نہ معلوم یہ کنکریاں کن جراثیم سے متاثر تھیں کہ فوج میں وبا پھیل گئی۔[3] بہت سے لوگ مر گئے کچھ ابرہہ کے ساتھ یمن واپس آ گئے۔ اور کچھ بیمار ہو کر وہیں رہ گئے۔ یہ لوگ سپاہی تھے۔ اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ بعد میں یہ مکے والوں کے ان محافظ دستوں میں کام کرنے لگے ہوں جو کاروانوں کی حفاظت کے لیے قافلے کے ساتھ آیا جایا کرتے تھے۔ اس ہاتھی کے واقعے ہی کے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

یورپی مورخوں کا بیان ہے کہ چونکہ حبشہ بیزنطینی حکومت کے ماتحت نہیں تو زیر اثر

۱۔ ابن ہشام صفحہ ۲۹ و مابعد۔

۲۔ اکثر مورخ یہی کہتے ہیں اور قرآن مجید میں "اصحاب الفیل" میں "فیل" کا لفظ واحد ہی آیا ہے۔ گو بعض مورخ کہتے ہیں کہ متعدد ہاتھی تھے۔ ابن ہشام اور طبری (صفحہ ۹۳۵) نے ہاتھی کا نام "محمود" لکھا ہے ایک حبشی ہاتھی کا نام خالص عربی ہونا قرین قیاس نہیں۔ ممکن ہے یہ لفظ (Mammoth) کا معرب ہو اور یہ ہاتھی ماموت نسل کا ہو۔ طبری کے مطابق یہ ہاتھی جو غیر معمولی قد و قامت کا تھا، ابرہہ کی درخواست پر نجاشی نے حبش سے یمن بھیجا تھا۔

۳۔ عرب مورخ بیان کرتے ہیں کہ حجاز میں چیچک وغیرہ وبائیں پہلی مرتبہ اسی وقت آئیں اس سے پہلے یہ لوگ ان سے واقف نہ تھے۔ (طبری صفحہ ۹۳۵)

ضرور تھا، اس لیے بیزنطینی حکومت کو توقع تھی کہ یمن پر حبشی قبضے سے اسے معاشی مدد ملے گی۔ اور ہندوستان سے ریشم کی خریداری یمن کے ذریعے سے آسان ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں کئی بیزنطینی سفارتیں بھی یمن آئیں۔ لیکن ایرانی تاجر اپنے وسیع کاروبار کے باعث منڈیوں پر چھائے رہے بلکہ خود عدن اور دیگر یمنی منڈیوں میں ایرانی اثر روز افزوں ہی ہوتا گیا۔ چنانچہ مرزوقی[1] نے بیان کیا ہے کہ عدن میں عطر بنتا تھا جو اپنی لاجواب خوبیوں کے باعث ہند اور سندھ اور فارس و روم تک دساور ہوتا تھا۔

ابھی ابرہہ کے انتقال کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایرانیوں نے یمن پر حملہ کیا اور حبشیوں کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔[2]

حجازی عربوں کے تعلقات

حجازی عربوں کے تعلقات حبشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت قدیم رہے ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد حبشی الفاظ کا پایا جانا اس سلسلے میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم زمانے میں چین اور ہندوستان کا تجارتی سامان یمن آتا اور خشکی کے راستے حجاز اور شام سے گزر کر یورپ جاتا تھا۔ جب رومیوں اور بیزنطینیوں نے بحر احمر میں حمل و نقل شروع کر دی تو حجازیوں کے روزگار پر خاص کر بہت اثر پڑا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم نے سخت جدوجہد کی اور ہمسایہ ممالک سے تجارتی کاروانوں کے لانے کی اجازت حاصل کر لی ابن سعد[3] اور امام ابن حنبل[4] وغیرہ[5] کا بیان ہے کہ قیصر روم نے ہاشم کو شام آنے کا پروانہ عطا کیا اور اپنے زیر اثر فرمانروائے حبش کے نام بھی ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ ہاشم نے اپنے بھائی کو حبشہ بھیجا اور ان کو نجاشی نے قیصر کی سفارش کی بنا پر اس بات کا منشور عطا کیا کہ ان کا تجارتی کارواں حبشہ آیا کرے۔ وادیٔ غیر ذی زرع (مکہ) کے تجارت پیشہ اپنے اور آس پاس کے علاقے سے عموماً چمڑے، گوند، لوبان وغیرہ بیچنے کے لیے لے جاتے تھے۔ قریبی میلوں میں گھی وغیرہ بھی بیچتے تھے۔ اونی کپڑے اور قبائیں بھی عرب کی مقامی

۱۔ الازمنہ والامکنہ۔ باب اسواق العرب۔

۲۔ تاریخ طبری صفحہ ۹۵۲ و مابعد

۳۔ طبقات ج ۱/۱ صفحہ ۴۳۔۴۰

۴۔ مسند جلد ۱ صفحہ ۳۶۱۔

۵۔ تاریخ طبری صفحہ ۵۸۹ و مابعد۔

پیداوار میں شامل تھیں۔ ان چیزوں کے بدلے میں وہ زیادہ تر غلہ حاصل کیا کرتے تھے۔ حکومت شام نے ہتھیار کی برآمد بند کر دی تھی۔ موقع ملتا تو یہ لوگ اس کو بھی چوری چھپے درآمد کرلیا کرتے تھے۔ (۱)

حبشہ جانے کے دو راستے تھے حجاز سے خشکی کی راہ فلسطین اور مصر ہوتے ہوئے جائیں یا بندرگاہ جدہ سے کشتیوں پر سوار ہوکر باب المندب سے ہوتے ہوئے کسی حبشی بندرگاہ میں جا اُتریں۔ قرآن مجید میں سمندر کا نہایت مدققانہ تذکرہ اور کشتیوں کے چلنے، طوفان اور خراب موسم سے دوچار ہونے اور سمندری مسافروں کے پریشان ہونے کا نفسیاتی منظر اور سب سے بڑی کر بحری اصطلاحات وغیرہ کے طور پر بعض حبشی الفاظ کا استعمال۔ یہ تمام امور بتاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مکی وحجازی مخاطب بحری سفر اور حبشی سمندر سے کتنی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اگر عربی مورخوں پر اعتماد کیا جائے تو مکی تاجر خود نجاشی سے شخصی تعارف رکھتے تھے اور اس کے دربار میں باریاب ہوا کرتے تھے۔ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کبھی نبوت سے پہلے اس کا موقع پیش آیا ہو۔ اگرچہ سیرت نگار اور سوانح نویس اس بارے میں خاموش ہیں۔ لیکن جو شخصیت زیادہ تر اپنے تجارتی معاملات میں راست بازی کے باعث ''الامین'' کے قومی خطاب سے مخاطب ہوئی ہو، جس نے نہ صرف یمن اور شام کا بلکہ بروایت امام حنبل بحرین وعمان جیسے دور دراز ممالک کا خاصا تفصیلی سفر کیا ہو، اس سے یہ بات اس زمانے میں عقلاً بعید نہیں معلوم ہوتی کہ حبشہ بھی گئی ہو جہاں اس کے ہم وطن ہر سال نہیں تو اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے چچازاد بھائی کو حبشہ ہجرت کر جاتے وقت جو تعارفی خط عطا فرمایا تھا اور جس میں نجاشی کو واقفانہ انداز میں لکھا تھا کہ ''ان نوآمدوں کا مہمان نوازانہ استقبال کرے'' وہ بھی اس گمان کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔

۱۔ تاریخ یعقوبی، جلد ا صفحہ ۲۸۰۔ لسان العرب تحت کلمہ ایلاف۔ نیز سورۂ ایلاف کی تفسیریں ایلاف کے معنے بھی امن نامے کے ہیں دیکھئے کتاب المحبر لابن حبیب صفحہ ۱۹۲۔ لامنس کی فرانسیسی کتاب ''مکہ بوقت ہجرت'' صفحہ ۱۲۹۔۳۰ بحوالہ جرمن کتاب گوتز یوک۔ نیز ہیفننگ کی جرمن کتاب ''اسلامی قانون خارجہ'' صفحہ ۱۰۷۔ مجموعہ قوانین جسٹی نین (کتاب کوڈ حصہ چہارم باب نمبر ۴۱ ف ا ف ۲ میں تلوار و دیگر ہتھیار تیل وشراب وغیرہ کی برآمد ''وحشی علاقے میں'' ہونے دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور قدیم رومی حکمرانوں کے احکام کا بھی ان دفعات میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان طویل لاطینی دفعات کا ترجمہ کرنے کی جگہ یہاں خلاصہ دیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت

۶۱۰ء میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں اس بات کا اعلان فرمایا کہ آپ کو خدا نے اپنا پیغام رساں بنا کر بغرض ہدایت بھیجا ہے۔ بت پرست یا بے مذہب ہم شہریوں کو جب خدائے واحد پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا تو بتوں کی بے سودی کا بڑی شدومد سے ذکر ہوا تو نامعقول جوش وخروش سے اس کی مخالفت ہوئی اور اکا دکا جو بھی اس تحریک سے متاثر ہوا اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

چار پانچ سال کی ان تھک اور بے لوث تبلیغ کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند درجن مکی مسلمان ہو گئے۔ شہر میں ہم وطنوں کے ہاتھوں جس فتنہ وفساد سے سابقہ پڑا تھا، اس کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ ترک وطن کر کے حبش چلے جائیں ''جہاں ایک منصف مزاج بادشاہ حکمران ہے اور جس کے ملک میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔''(۱)

ان مہاجرین میں جو حبش گئے آنحضرت کے چچازاد بھائی حضرت جعفر طیار بھی شامل تھے۔

مکتوبات نبویؐ

تاریخ نے ایسے کوئی دو ڈھائی سو خط محفوظ کئے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائلی شیوخ، صوبہ جاتی افسروں اور ہمسایہ حکمرانوں کے نام تحریر فرمائے تھے۔ جو شخص پورے جزیرہ نمائے عرب کا حکمران بن چکا ہو، اس کے لیے یہ تعداد کچھ بڑی نہیں۔ اور انہیں خطوں میں سے ایک جسے طبری ابن القیم، قسطلانی، اور قلقشندی نے اپنی کتابوں میں محفوظ کیا ہے۔ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول اللہؐ کی طرف سے نجاشی اصحم بادشاہ حبشہ کے نام میں اس خدا کی تعریف تمہیں لکھتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو بادشاہ، مقدس، سلامتی والا، امان دہندہ اور سلامت رکھنے والا ہے۔ اور میں اقرار کرتا

۱۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۰۸۔

ہوں کہ مریم کے بیٹے عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جن کو پاک اور برائی سے محفوظ مریم بتول کی طرف ڈالا گیا تو وہ خدا کی روح اور پھونک سے حاملہ ہوئیں جیسا کہ خدا نے حضرت آدمؑ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا تھا۔ میں تجھے خدائے واحد لاشریک کی طرف بلاتا ہوں تا کہ تو میری اتباع کرے اور مجھ پر نازل شدہ چیز پر ایمان لائے۔ کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں میں تجھے اور تیرے لشکروں کو خدائے عزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے پیام پہنچا دیا اور بہی خواہی کی ہے۔ اب میری بھی خواہانہ نصیحت کو قبول کرو۔ اور میں نے تمہارے پاس اپنے چچازاد بھائی جعفر کو بھیجا ہے، جس کے ہمراہ چند مسلمان بھی ہیں۔ جب وہ تیرے پاس آئے تو ان کی مہمانداری کر اور تکبر چھوڑ دے۔ سلام اس پر جو راہ ہدایت پر چلے۔

عام طور سے اسلامی مورخ اس خط کو ۶ ھ کے اواخر کے واقعات میں بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ہمسایہ ممالک کے فرماں رواؤں کو دعوت اسلام کی تبلیغ کی مگر اوپر نقل کئے ہوئے خط کا آخری فقرہ غور طلب ہے کہ:

''میں نے تمہارے پاس اپنے چچازاد بھائی جعفر کو بھیجا ہے جس کے ہمراہ چند مسلمان بھی ہیں۔ جب وہ تیرے پاس آئے تو ان کی مہمان داری کر..........''

کیا یہ عبارت ۶ ھ میں لکھی جا سکتی ہے۔ جبکہ ان مہاجرین کو حبشہ پہنچے ہوئے پندرہ سال ہونے کو آئے تھے؟ بظاہر یہ خط تعارف کی غرض سے حضرت جعفر طیار کو دیا گیا تھا جب وہ حبشہ جا رہے تھے۔ اگر سیرت نگاروں کی خاموشی کو کوئی مانع نہ قرار دیا جائے تو خط کے واقف کارانہ انداز سے یہ گمان ہوتا ہے کہ نبوت سے پہلے آنحضرت خود حبشہ تشریف لے گئے۔ اور مثل بعض دیگر ملکی تاجروں کے نجاشی سے شخصی تعارف حاصل کیا تھا۔ آپ کا مہاجرین سے چلتے وقت واقفانہ انداز میں فرمانا کہ ''حبش میں ایک ایسے بادشاہ کی حکمرانی ہے جس کے دور میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔'' اور اس کی مزید تائید کر سکتا ہے۔ احادیث میں بعض وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے چند حبشی الفاظ بھی مروی ہیں۔

اتفاق سے ۱۹۳۹ء میں جب میں آکسفورڈ میں ''کتابات مدینہ'' پر لیکچر دینے لگا تو

پروفیسر مارگولیوتھ نے وہاں میری توجہ اس جانب منعطف کرائی کہ اسکاٹ لینڈ کے ایک مستشرق کو حال میں یہ خط ملا ہے اور میری مراسلت موصوف کو بھیج دی۔ اس کے جواب میں مستشرق مذکور (ڈی۔ ایم۔ ڈنلاپ ساکن برائڈ کرک، اسکاٹ لینڈ) کا جواب ملک شام سے ۲ جون ۱۹۳۹ء کا چلا ہوا مجھے حیدرآباد میں ملا، جس میں لکھا تھا کہ بعض خاص حالتوں میں نجاشی کا یہ خط فلسطین کے ایک پادری کے پاس سے حال میں خریدا گیا ہے۔ اور یہ کہ وہ اسے جلد لندن کے رسالۂ جے۔ آر۔ اے۔ ایس میں ایک مضمون کے ساتھ شائع کرانے والا ہے۔ مزید مہربانی سے اس نے خط کی ایک دستی نقل فوراً بھیج دی۔ فوٹو وطن واپسی پر بھیجنے کا وعدہ تھا، لیکن جنگ چھڑ جانے کے بعد سے پھر کوئی پتہ نہ ملا۔[1]

کفار مکہ کا وفد حبشہ میں

بہر حال جب متعدد جماعتیں مہاجرین کی حبشہ پہنچیں تو مکے والے اس کی روک تھام کے لیے تدبیریں سوچنے لگے۔ آخر انہوں نے ایک وفد بھیجا[2] جو نجاشی سے ان ''ملزمین'' کی حوالگی کا مطالبہ کرے۔ نجاشی نے مسلمانوں کو جواب دہی کا موقع دیا۔

انہوں نے کہا کہ ہم نے مکے میں کوئی جرم یا فعل ناجائز نہیں کیا ہے۔ ہم پہلے گمراہ تھے۔ اب خدا نے ہمارے پاس ایک نبی بھیج کر ہماری ہدایت کا سامان کیا ہے۔ اور ہم وطنوں کے ظلم اور بے دردی سے مجبور ہو کر یہاں پناہ لینے آئے ہیں۔ قریشی وفد کا سردار عمرو بن العاص جیسا زبردست موقع شناس سیاستدان تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً پہلو بدل کر نجاشی کے نازک اور حساس ترین جذبات پر وار کیا اور پوچھا مگر مسلمان یہ تو بتائیں کہ وہ حضرت عیسیٰ کے متعلق کیا عقائد رکھتے ہیں؟ مسلمانوں کے نمائندے حضرت جعفر طیار نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں[3] جن میں حضرت عیسیٰ کی روح اللہ، کلمۃ اللہ، ابن مریم اور بن باپ کے پیدا ہونے والا کہا گیا ہے اور ان کے ابن اللہ ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔ نجاشی فرقۂ طبیعت واحد کا (یعنی مانوفزائٹ) عیسائی تھا۔ اور ان دنوں اس فرقے اور یونان کے عیسائیوں میں بڑے سخت

۱۔ اس کے بعد مضمون بھی چھپا۔ فوٹو بھی وصول ہوا۔ اور اس پر ایک مستقل مضمون لکھا گیا جو الگ درج ہے۔

۲۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۱۷ و مابعد۔

۳۔ سورۂ مریم کی آیتیں۔

اختلافات تھے۔ آخر الذکر اس بات کے قائل تھے کہ حضرت عیسیٰ میں بوقت واحد دو طبیعتیں تھیں۔ انسانی بھی اور خدائی بھی۔

حضرت عیسیٰ کے متعلق سب عیسائی قائل ہیں کہ وہ روح اللہ، کلمۃ اللہ، ابن مریم اور بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ نجاشی اور اس کے درباری پادریوں نے مسلمانوں کو بھی عیسائی خیال کیا ہو۔ اور اس بنا پر بت پرست مکیوں کے حوالے کرنے سے انکار کیا ہو۔ مسلمان حضرت عیسیٰ کے متعلق ابن اللہ ہونے سے یک لخت انکار کرتے ہیں۔ ممکن ہے نجاشی، جو فرقہ طبیعت واحد کا پیرو تھا، مسلمانوں کے نقطۂ خیال کی طرف مائل ہو گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہ خیال کرتا ہو کہ مسلمان دراصل عیسائیوں کا ایک نیا فرقہ[1] ہوں۔ اور رفتہ رفتہ حبشی ماحول میں وہ فرقہ طبیعت واحد میں شامل ہو جائیں۔ اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ان مسلمانوں میں سے جو اپنے مرکز اور ہادیؐ سے دور جا پڑے تھے کم از کم دو نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ (دیکھئے ابن ہشام صفحہ ۷۸۱ تا ۷۸۴ تاریخ طبری صفحہ ۱۷۹۷، وغیرہ)

نجاشی کا اسلام

مسلمان مؤلف بہرحال اس کے قائل ہیں کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا اور یہ کہ اس کے مرنے کی اطلاع ملی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ مگر یہ ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے۔

مکے میں بعض عجیب حالات میں عارضی طور سے چند دن کے لیے یہ مشہور ہوا کہ قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اب کوئی پرخاش نہیں رہی تو فوراً حبشہ سے بہت سے مہاجر وطن واپس آ گئے اس عرصے میں جب حالات کی توضیح ہو گئی تو یہ لوگ اور بعض دیگر مکی مسلمان پھر حبشہ واپس چلے گئے۔

ا۔ اسلام کو شروع ہو کر اس وقت تک بہ مشکل پانچ سال گزرے تھے اور بجز عقائد کے بہت کم احکام نازل ہوئے تھے مسلمان نماز میں بھی غالباً بیت المقدس ہی کی طرف رُخ کرتے تھے جو عیسائیوں کا مقدس ترین مقام ہے ان حالات میں ان پر اجنبی کے لیے عیسائیت کا گمان کرنا تعجب کے قابل نہ ہو گا۔ بدقسمتی سے حبشہ کی ہمعصر تاریخیں محفوظ نہیں رہیں ورنہ ہمیں اسلامی مورخوں کے بیانات کا مقابلہ کرنے کا موقع ملتا۔

ہجرت نبویؐ

اس کے بعد کئی سال تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقامی سلوک سے دل برداشتہ ہو کر مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں۔ اور مقامی اور مضافاتی قبائل سے سمجھوتہ کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کرتے ہیں۔ اور پھر قریش پر جن کے تجارتی کاروان مسلمانوں کے زیر اثر علاقے سے گزر کر شام جاتے تھے، معاشی دباؤ ڈالتے ہیں۔ اور نتیجۃً بدر وغیرہ کی جنگ ہوتی ہے۔ جس میں عموماً قریش کو سخت شکست ہوتی ہے تو قریش کی ایک اور سفارت حبشہ جاتی ہے اور موقع دیکھ کر چاہتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف غصہ مہاجرین حبشہ پر اُتاریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے تو عمرو بن میہ ضمری ایک غیر مسلم کو سفیر بنا کر حبشہ بھیجتے ہیں۔ (سیرۃ شامی ۹۷/۱ الف) نجاشی نے فتح بدر پر اپنی مسرت ہی کا اظہار کیا (ابن کثیر ۳/۳۰۷)..... اور قریش کو اس دفعہ بھی ناکامی ہوئی ہے۔[1] مملکت اسلامیہ کی عام ترقی کے دیکھتے اب اس بات کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ مسلمان غیر ممالک میں پناہ لیتے ہیں اس لیے کچھ دن بعد یعنی ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفیر حبشہ بھیجا کہ ان مہاجرین کو مدینہ لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پر نجاشی نے مہاجرین میں سے ایک نوجوان بیوہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غائبانہ عقد بھی کرا دیا تھا۔ ان بی بی کو ساتھ لے جانا بھی مقصود تھا۔ نجاشی نے دھوم دھام سے مسلمانوں کو رخصت کیا اور انہیں تحفے تحائف دے کر اپنے جہازوں میں مدینہ روانہ کیا۔[2] مورخ لکھتے ہیں کہ نجاشی نے کئی کشتیاں اور بھی ساتھ کیں جن میں اس کا بیٹا اور بہت سے حبشی تھے۔ اور منشا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوستانہ سلام پہنچانا تھا۔

نجاشی کا خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

طبری اور ابن اسحٰق نے نجاشی کا خط بھی محفوظ کیا ہے جس میں نجاشی نے اپنے پوشیدہ اسلام لانے اور اپنے بیٹے کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے جو یہ ہے:

ا۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۶۰۲ و مابعد۔

ا۔ طبقات ابن سعد ج ۲/۱ص ۱۵ طبری صفحہ ۱۵۷۰۔ ابن ہشام صفحہ ۱۰۰۲۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت محمد رسول اللہ از طرف نجاشی اصحم بن ابجر۔ تجھ پر اے اللہ کے نبی سلام اور اللہ کی رحمت اور برکتیں۔

اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے مجھے اسلام کی ہدایت دی۔ یا رسول اللہؐ آپ کا خط مجھے ملا جس میں حضرت عیسیٰ کا ذکر تھا۔ زمین اور آسمان کے مالک کی قسم کہ آپ کی بیان کردہ چیز سے حضرت عیسیٰ رتی بھر بھی زیادہ نہیں ہیں وہ ویسے ہی تھے جیسے آپ نے فرمایا ہے۔ ہم نے آپ کے فرستادوں سے تعارف حاصل کیا اور آپ کے چچازاد بھائی اور اس کے ساتھیوں کی مہمانداری کی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے اور تصدیق یاب رسول ہیں۔ میں نے آپ کے چچازاد بھائی اور اس کے ساتھیوں کی بیعت اور اس کے ہاتھوں خدائے رب العالمین کے سامنے سر اطاعت تسلیم کیا۔ میں نے آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے ارہابن اصحم بن ابجر کو بھیجا ہے، کیونکہ میں اپنی ذات کے سوا کسی کا مالک نہیں اگر آپ چاہیں کہ میں آپ کے پاس آ جاؤں تو آ جاؤں گا کیونکہ میں اقرار کرتا ہوں کہ جو آپ فرماتے ہیں وہ حق ہے۔ (۲)

والسلام علیک یا رسول اللہ

یہ وفد حبشہ سے چلا۔ لیکن بعض مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ کشتیاں جن میں حبشی تھے سب ڈوب گئیں اور بعض مورخ بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے چند سلامت رہیں۔ جب یہ سفارت مدینہ آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفور اخلاق سے ان کی خود خدمت کرتے رہے۔ یہ حبشی سپاہی بعض جنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک بھی رہے۔ سموزدی نے تاریخ

۲۔ حوالے۔ طبری صفحہ ۱۵۶۹ تا ۱۵۷۰ من ابن اسحٰق صبح الاعشیٰ جلد ۶ صفحہ ۳۶۶ تا ۳۶۷ "من ابن اسحٰق تاریخ ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۸۳ زاد المعاد لابن القیم جلد ۳ صفحہ ۶۰ تا ۶۱ اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین لابن طولون خط نمبر ۳۔ زیلعی تخریج احادیث الہدیہ کا ضمیمہ مکتوب نمبر ۲/۱ سواطع الانوار (تاریخ حبشہ) بر موقع۔

مدینہ میں یہاں تک لکھا ہے کہ نجاشی کے بیٹے نے حضرت علی سے موالات یا بھائی چارہ اختیار کر لیا۔ اور حبشہ واپس جا کر تخت نشین ہونے سے انکار کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط نجاشی کے نام

اس سفارت کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نجاشی کو کچھ تحفے بھیجے۔ مگر اس عرصے میں اس نجاشی کا انتقال ہو گیا۔ امام مسلم لکھتے ہیں کہ اس کے جانشین کو آنحضرت نے ایک تبلیغی خط لکھا۔ مگر اس کا انجام معلوم نہیں۔ (۱) یہ خط بیہقی نے ابن اسحاق کی کتاب سے نقل کر کے محفوظ کیا ہے اور وہ یہ ہے:

یہ خط پیغمبر محمد کا حبشیوں کے سردار نجاشی اصحم کے نام ہے سلامتی اس شخص کے لیے ہے جو راہ ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے نہ بیوی ہے نہ بچہ اور یہ بھی کہ محمد اسی (خدا) کا بندہ اور رسول ہے میں تجھے اسلام کے بلاوے کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ میں اسی کا رسول ہوں۔ اسلام لا تو سلامت رہے گا۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات پر آ جمع ہو جاؤ جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے یہ کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ شرک کریں۔ اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں اپنوں ہی کو رب بنائیں۔ اگر وہ پلٹ جائیں تو کہدو کہ ہم تو (خدا کے) فرمانبردار ہیں۔ اگر تو انکار کرے تو تیری قوم کے نصرانیوں کا وبال تجھی پر پڑیگا۔ مہر محمد رسول اللہ

ابھی حال میں حبشی اطالوی جنگ کی ابتداء میں اخباروں نے (ہمدم نے مصر کے اخبار البلاغ سے اور اس نے ادیس بابا کے اخبار برہان اسلام سے نقل کر کے) یہ خبر شائع کی تھی کہ نجاشی نے اپنے خزانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط جواب تک محفوظ ہے، نکال کر مسلمانوں کے ایک وفد کو دکھایا۔ اس خط کی جو عبارت نقل کی گئی یہ وہ وہی ہے جو اوپر نقل کی گئی

۱۔ میں نے بدایہ ابن کثیر میں بیہقی کا یہ حوالہ پایا ہے۔

ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ بیان کس حد تک صحیح ہے۔ اس سے پہلے حبشہ کے اس اثری خزانے کی خبر کبھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ موجودہ خبر کے بموجب حبشی اس سے اکثر مشکل اوقات میں کام لیتے رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اور اصلی خطوط گزشتہ صدی عیسوی کے ربع سوم میں دستیاب ہوئے ہیں اور ان کے فوٹو بھی مشرق اور مغرب کے علمی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان دونوں کے متن بھی بالکل وہی ہیں جیسا کہ قدیم عربی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ اگر نجاشی کے اس مزعومہ خط کا بھی فوٹو حاصل ہو سکے تو ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ اگر نجاشی بایلا سلاسی یا اس کے تبرک خانے کے مہتمم نے اپنی جلاوطنی کے زمانے میں مجبوراً فلسطین میں ان یادگاروں کو فروخت کر دیا تھا، جیسا کہ اوپر مسٹر ڈنلاپ کے خط سے اس خط کی اصلی کو پانے کے واقعے سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو پھر شہادت زیادہ قابل قبول ہو جاتی ہے۔ مگر خدا معلوم اس عالمگیر جنگ نے ان متبرک یادگاروں کا کیا حشر کیا ہے اور وہ اب کہاں ہیں۔

حبش کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کے تعلقات حبشہ کے ساتھ بے حد دوستانہ رہے۔ اور ایسی متعدد حدیثیں ملتی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشیوں سے اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی ہے۔ ابتدائی دور اسلام میں بعض فرزندان حبش نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جس جوش و صداقت کے ساتھ ساتھ دیا اسے مسلمان اب بھی ادب کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اور پہلے مؤذن حضرت بلال حبشیؓ کے نام میں وہ کشش ہے کہ جاوی زبان میں بلال کے معنی خود مؤذن کے ہیں۔ اور لندن کی مسجد کیں (جو محلہ پٹنی میں ہے) سب سے پہلے انگریز مؤذن کا نام بھی بلال رکھا گیا ہے۔ اور اب بہت کم لوگ جانتے یا جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان مسٹر بلال کا اصلی نام کیا تھا۔ اور یہ گورے بلال خود بھی کالے بلال کے ہمنام ہونے پر فخر کیا کرتے ہیں۔ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ ابرہہ کے حملے کے سلسلے میں بہت سے حبشی بیمار ہو کر مکے ہی میں رہ گئے۔ کچھ عرصہ ہوا مشہور شرقیاتی پادری لامنس نے ۱۹۱۶ء کے ژورنال آزیاتیک (پاریس) میں ایک عجیب اور قابل غور مضمون لکھا ہے۔

Lammenr, Les Ahabis et lorganisation militaire de la Mecque au siecle de I Hegite.

یعنی ''حبشی اور قرن ہجرت کا فوجی نظام مکے میں'' اس میں وہ متعدد عربی حوالوں کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قریش نے ایک مستقل فوج دائمہ (Standing army) تیار کی تھی جس میں ان کے حبشی غلام اور بہت سے تنخواہ یاب حبشی سپاہی کام کرتے تھے۔ اور قریش ان کو نہ صرف اپنے تجارتی کاروانوں کے سفر کے وقت بطور محافظ دستہ ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ بلکہ اپنی جنگوں میں بھی ان سے مدد لیتے تھے۔ مسلمانوں سے جنگوں کے سلسلے میں اکثر ''قریش واحابیشہا'' کا ذکر تاریخوں میں آیا ہے۔

مصر کے جنوبی علاقے میں اسلام کی اشاعت

عہد نبوی کے بعد مسلمان جب تیزی سے چاروں طرف پھیلنے لگے تو مصر کا جنوبی علاقہ بھی نور اسلام سے منور ہونے لگا۔ معلوم نہیں وہاں اسلام کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ چونکہ مصر سے اس علاقے کے تجارتی تعلقات قدیم اور کثیر تھے اس لیے مصر کی فتح کے بعد ہی عرب مسلم تاجروں نے اسلام یہاں پہنچا دیا ہوگا۔ بہر حال عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں نوبیہ کے علاقے میں مسجدوں کا پتہ چلتا ہے۔ مقریزی نے خطط مصر (باب البقط) میں لکھا ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عمرؓ کے زمانے میں مصر میں فاتحانہ آئے تو انہوں نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں بیس ہزار فوج دے کر مصر کے جنوب میں نوبیہ روانہ کیا۔ اور جب بہت دن ہو گئے تو عمرو بن العاصؓ نے ان کو واپسی کا حکم دیا۔

نوبیہ پر مسلمانوں کی چڑھائی اور معاہدہ

جب عمرو بن العاصؓ کی وفات ہو گئی تو نوبیوں نے اس صلح کو توڑ دیا۔ جو ان میں اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح میں ہوئی تھی۔ اور وہ جنوبی مصر پر بکثرت لوٹ مار کرنے لگے۔ اس پر عبداللہ بن سعد نے مکرر نوبیہ پر چڑھائی کی۔ اب یہ خود مصر کے گورنر ہو گئے تھے اور یہ حضرت عثمانؓ کا زمانہ ہے۔ چنانچہ نوبیہ کے پایۂ تخت دنقلہ (دونگولہ) کا محاصرہ کر کے منجنیق سے پتھر برسائے جس سے ان کا گرجا منہدم ہو گیا۔ اس پر ان کا بادشاہ قلیدروث گھبرا گیا اور بڑی

عاجزی سے صلح کی درخواست کی اور معذرت کی کہ کھانے پینے کی تنگی سے لوٹ مار ہوتی ہے۔ چنانچہ مکرر صلح ہوئی، جس میں نوبیوں نے سالانہ تین سو ساٹھ غلام کا پیشکش کیا اور مسلمانوں نے ان کو غلہ ہدیہ کرنا منظور کیا اور ایک معاہدہ لکھا گیا ہے بقط (Pact) کہلاتا ہے۔ اس کی نقل جس میں دنقلہ کی جامع مسجد کا بھی ذکر ہے یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ امیر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا معاہدہ نوبہ کے حکمراں اور اس کے جملہ اہل ملک کے لیے۔

۲۔ معاہدہ جو نوبہ کے بڑے چھوٹے سبھوں کے لیے اسوان سے علوہ تک کے علاقے کے لیے کیا گیا ہے۔

۳۔ عبداللہ بن سعد نے ان کو ایک امن عطا کیا اور ایک صلح منظور کی ہے جو ان کے اور ہمسایہ جنوبی مصر وغیرہ کے مسلمانوں اور ذمیوں کے مابین جاری ہوگی۔

۴۔ اے نوبہ والو! تمہیں خدا اور رسول کا امان دیا جاتا ہے کہ ہم تم سے نہ جنگ کریں گے نہ لڑائی جب تک تم ہماری باہمی شرطوں پر قائم رہو۔

۵۔ یہ کہ تم ہمارے ملک میں آ کر گزر سکو گے بس نہ سکو گے اور ہم تمہارے ملک میں آ کر گزر سکیں گے مقیم نہیں ہو جائیں گے۔

۶۔ جو مسلمان یا ذمی تمہارے ملک میں آئے یا اس میں گزرے تو تمہارے علاقے سے واپسی تک اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔

۷۔ اور مسلمانوں کا کوئی بھگوڑا غلام تمہارے پاس آئے تو تم اسے اسلامی سرزمین میں واپس کر دو گے اس پر قبضہ نہ کر لو گے اور نہ اس سے کوئی مسلمان ملنا اور بات کرنی چاہے تو تم ممانعت و تعرض کرو گے تا آنکہ کہ وہ مسلمان واپس چلا جائے۔

۸۔ تمہارے شہر میں مسلمانوں نے جو مسجد بنائی ہے اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے وہاں کسی نمازی کو جانے سے تم نہ روکو گے وہاں جھاڑو صفائی اور روشنی تمہارا فرض ہے۔

۹۔ تم سالانہ تین سو ساٹھ غلام مسلمانوں کے حکمران کو خراج دو گے جو اوسط قسم کے

تمہارے ملک کے ہوں۔ ان میں عیب نہ ہوں، کچھ مرد اور عورتیں۔ مگر یہ بہت بوڑھے بوڑھیاں اور نہ نابالغ بچے۔ یہ اسوان کے والی کے سپرد کیے جائیں گے۔

۱۰۔ علوہ اور اسوان کے مابین تم پر کوئی حملہ آور ہو تو اس کا روکنا مسلمانوں کا فرض نہیں۔

۱۱۔ اگر تم مسلمانوں کے کسی (بھگوڑے) غلام کو پناہ دو یا کسی مسلمان یا ذمی کو قتل کرو یا اس مسجد سے تعرض کرو جو مسلمانوں نے تمہارے شہر میں تعمیر کی ہے اور اس کو منہدم کر دو یا تین سو ساٹھ غلاموں کے پیشکش میں کمی کرو تو یہ صلح و امان ختم ہو جائے گا۔ اور ہم حالت برابری پر عود کر آئیں گے تا آنکہ خدا ہم میں فیصلہ نہ کرے۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

۱۲۔ ہم پر اس سلسلے میں خدا اور رسول کا ذمہ اور واسطہ ہے اور تمہارے لیے تم پر تمہاری دین کی سب سے بڑی اعتقاد کی چیز یعنی حضرت مسیح اور حواریوں اور اپنے دین و ملت کے دیگر بزرگ اشخاص کی ذمہ داری ہے اللہ ہم میں اور تم میں اس پر گواہ ہے۔

۱۳۔ اسے ۳۱ھ میں رمضان میں عمرو بن شرجیل نے تحریر کیا۔

مقریزی نے تفصیل کے ساتھ اس معاہدے کی تعمیل کی رسمیں بیان کی ہیں کہ ہر سال غلاموں کی حوالگی کے وقت کیا طریقہ انجام پاتا تھا اور کس طرح رواج نے گورنر مصر اور افسران متعلقہ کے لیے بھی کچھ حقوق مستقرہ پیدا کر دیے تھے اور کس طرح اور کس مقدار میں انہیں غلہ عطا کیا جاتا تھا اور یہ کہ رواج نے کس طرح غلے کے علاوہ کپڑے وغیرہ کو بھی اس میں شامل کرا دیا تھا۔ چونکہ نوبی قوم عیسائی تھی اس لیے سالانہ سفارت کے موقع پر ایک زمانے میں شراب کے پیپے بھی تحفہ دیے جانے لگے تھے تو علماء نے اس میں مداخلت کی تھی۔

حبش کے بعض ساحلی علاقے اور ان کا یکساں نظم

حبشہ اور نوبہ سے متصل بجہ کا علاقہ ہے جو دریائے نیل اور بحر احمر کے مابین بندر عیذاب (حالیہ پورٹ سوڈان) سے جنوبی تپین تک پھیلا ہوا ہے۔ مقریزی نے (باب "ذکر البجہ" میں) لکھا ہے کہ ان میں بھی جنوبی ہند کے بعض ساحلی علاقوں کی طرح مادرانہ معاشرہ رائج تھا یعنی کسی کا وارث بیٹا نہیں بلکہ بھانجا اور نواسہ ہوتا تھا اور یہ کہ ان میں کوئی سیاسی

تنظیم اور کوئی مذہب نہ تھا۔ جب عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے نوبہ پر حملہ کیا تھا تو اس علاقہ پر بھی توجہ کی تھی لیکن جب یہاں کی حالت سے آگاہی ہوئی کہ کوئی حکومت ہی نہیں ہے جو مقابلہ کر سکے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا حتیٰ کہ کوئی معاہدہ تک نہیں طے ہوا۔ اور یہ کہ سب سے پہلی مرتبہ ان سے معاہدہ عبیداللہ بن الحجاب السلولی (زمانہ گورنری ۱۰۲ھ تا ۱۱۶ھ) نے کیا تھا جس میں مذکور تھا کہ "سالانہ ان لوگوں کو تین سو اونٹ دیئے جایا کریں گے۔ یہ تجارت کے لیے اسلامی سرزمین سے گزر سکیں گے۔ لیکن وہاں بس جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ کہ ان کے علاقے میں مسلمان اور ذمی رعایا کو جان و مال کا امن حاصل رہے گا۔ ورنہ ان سے معاہدہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کے غلام بھاگ کر ان کے علاقے میں آئیں تو وہ واپس کر دیئے جائیں گے۔ معاہدے کی تعمیل کے لیے ان کا ایک وکیل بطور یرغمال مصر میں رہتا تھا اور خلاف ورزی پر سزائیں مقرر تھیں۔ چنانچہ ایک بکری کی لوٹ پر چار دینار اور ایک گائے کی لوٹ پر دس دینار جرمانہ ہوتا اور بھگوڑے غلاموں کی عدم واپسی پر بھی ان سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے علاقے میں مسلمان جا کر بسے۔ وہاں کے شاہی خاندان میں شادی بیاہ کرنے اور ان کی کانوں کو کھود کر استفادہ کرنے لگے، جس کے باعث ان لوگوں کا وحشی پن بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا لیکن خلیفہ مامون کے زمانے میں ان لوگوں نے لوٹ مار بہت شروع کی تو سپہ سالار عبداللہ بن جہم کو بھیجا گیا اور مختلف معرکہ آرائیوں کے بعد بجہ کے حاکم کنون بن عبدالعزیز نے صلح چاہی جس کا طویل متن مقریزی نے نقل کیا ہے جس کے اہم فقرات یہ ہیں:

"تو اور تیری رعایا سب خلیفہ مامون کے غلام سمجھے جائیں گے البتہ اپنے علاقے میں تو حسب حال بادشاہ رہے گا اور تو حسب سابق سو اونٹ یا تین سو دینار کا سالانہ خرچ ادا کرے گا...... اسلام، قرآن یا جناب رسالت کی شان میں کوئی گستاخی کرے تو معاہدہ منسوخ سمجھا جائے گا...... دشمنان اسلام کو مدد بھی نہ دو گے...... کسی مسلمان ذمی یا آزاد کو قتل کرو تو دس خوں بہا اور غلام تو قیمت کا دس گنا۔ اور اسی طرح اسلامی رعایا کا مال لٹے تو دس گنا جرمانہ وصول کیا جائے گا...... اسلامی رعایا کو تیرے علاقے سے گزرنے میں کوئی ممانعت نہ ہوگی اور نہ رہزنی کی جائے گی...... مسلمانوں کی بنائی ہوئی مسجدوں کو نہ ڈھاؤ گے...... یہ کہ کنون بن عبدالعزیز بطور یرغمال مصر میں مقیم رہے گا، تاکہ معاہدے کی تعمیل کا اطمینان حاصل ہو...... یہ کہ اسلامی افسر مسلمان بجہ سے زکوٰۃ وصول کرنے علاقہ بجہ میں آسکیں گے...... اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا گیا اور اس پر گواہیاں بھی ثبت کرائی گئیں۔"

اس کی تعمیل خلیفہ متوکل کے زمانے تک ہوتی رہی۔ پھر لوٹ مار بڑھ گئی تو ایک مہم بھیجی گئی۔ جس نے فن حرب کی مہارت سے باوجود تعداد کی کمی کے دشمن کو فاش شکست دی اور ان کے حکمرانوں کو بغداد جا کر خلیفہ کے قدموں پر گرنے پر مجبور کیا۔ یہ ۲۴۱ھ کا واقعہ ہے اور بعض مزید حقوق مسلمانوں کے لیے حاصل کر کے مکرر صلح کی گئی۔

حبشی علاقوں کے بہت سے حالات مقریزی نے الالمام نامی ایک مستقل کتاب میں بھی لکھے ہیں۔ لیکن ہمارا موضوع قبل اسلام اور ابتدائے اسلام کے تعلقات کا تذکرہ ہے اور بعد کے حالات محض تکملہ ہیں۔

اصل مکتوب نبویؐ بنام نجاشی
کی نئی دستیابی

مجلّہ عثمانیہ جلد (۹) شمارہ (۳۔۴) ۱۳۵۵ھ تا ۱۹۳۶ء میں مضمون مکتوبات نبویؐ کے دو اصول کے آخر میں ایک اخباری اطلاع کا ذکر کیا گیا تھا کہ موجودہ نجاشی حبشہ نے مکتوب نبویؐ کی جو اپنی زمانے کے نجاشی کے نام آیا تھا۔ لوگوں کو زیارت کرائی۔ مگر کوئی تفصیلی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اس کے بعد سے بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے۔ نجاشی کو لندن میں جا پناہ گزین ہونا پڑا اور حبشہ پر اطالوی قبضہ ہو گیا پھر موجودہ جنگ چھڑی۔ مگر خوش قسمتی سے اس اہم اور مبارک دستاویز کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں جو باعث دلچسپی ہوں گے۔

۱۱ مئی ۱۹۳۹ء کو جب میں نے آکسفورڈ میں ابتدائے سنہ ہجری کے چند عربی کتبات مدینہ پر ایک قانونی لیکچر دیا اور ان کتبات کے خط کا مقابلہ سابق میں دستیاب شدہ مکتوبات نبویؐ (بنام مقوقس و منذر) سے کیا تو پروفیسر مارگولیوث نے جلسے میں بیان کیا تھا کہ ایک مکتوب نبویؐ جو نجاشی حبشہ کے نام بھیجا گیا تھا دستیاب ہو گیا ہے اور اسکاٹ لینڈ کے ایک شخص کے پاس ہے۔ جلسے کے بعد میں نے پروفیسر مارگولیوث کے توسط سے اس شخص کو ایک خط بھیجا۔ کئی ماہ بعد مجھے اس کا جواب حیدرآباد میں ملا۔ خط نویسندہ مسٹر ڈنلاپ کا قیام ان دنوں شام میں تھا۔ جواب میں مکتوب مبارک کی ایک نقل جو ہاتھ سے کی گئی تھی۔ منسلک تھی اور وعدہ تھا کہ اسکاٹ

لینڈ واپسی پر مجھے فوٹو بھی بھیجا جائے گا نیز یہ کہ اس پر ایک مضمون جلد لندن کے رسالہ جے۔ آر۔ اے۔ ایس میں بھی چھپے گا۔ اتنے میں جنگ شروع ہو گئی لیکن اتنے حالات میں نے اسلامک کلچر حیدرآباد (اکتوبر ۱۹۳۹ء ص ۴۲۹ کی تعلیق نمبر ۱۱ اور مصر میں شائع شدہ کتاب الوثائق السیاسیہ (ص ۲۴ تا ۲۵ کی تعلیق) میں شائع کرا دیئے۔

موجودہ مضمون جے۔ آر۔ اے۔ ایس کے شمارۂ جنوری ۱۹۴۰ء میں چھپا۔ لیکن یہ پرچہ وقت سے بہت دنوں بعد ہندوستان پہنچا۔ اس میں یہ مضمون ص ۵۴ تا ۶۰ میں چھپا ہے اور مکتوب مبارک کے فوٹو کا بلاک بھی وہیں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے ضروری اقتباسات کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

یہ خط ایک جھلی پر لکھا ہوا ہے جو کوئی نو انچ چوڑی اور ساڑھے تیرہ انچ لمبی ہے۔ حروف مدور ہیں اور بڑے ہونے کے باعث پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔ سیاہی جو استعمال کی گئی ہے۔ وہ خاکی (براؤن) ہے خط کا مضمون سترہ سطروں میں ہے۔ جس کے آخر میں ایک گول مہر کا نشان ہے جس کا قطر ایک انچ کا ہے۔ اس کی عبارت نیچے سے یوں ہے۔

''محمد رسول اللہ'' اور ہر لفظ علیحدہ علیحدہ سطر میں ہے۔

یہ دستاویز اکتوبر ۱۹۳۸ء میں دمشق میں حاصل ہوئی۔ میں اسے انگلستان لے گیا۔ برٹش میوزیم میں مسٹر بل اور مسٹر فلٹن نے اسے دیکھا...... پروفیسر مارگولیوث اور گلاسگو کے مسٹر رابسن وغیرہ عربی دانوں کے دیکھنے کے بعد میں نے اسے واپس لے جا کر دمشق میں اس کے مالک کو پہنچا دیا جو وہاں ایک خانگی شخص ہے۔ اصل تو نہیں البتہ اس کے فوٹو کو مختلف اوقات میں جامعہ بون (جرمنی) میں پروفیسر کالے اور پروفیسر ہیفننگ نے بھی دیکھا سابق میں دستیاب شدہ مکتوب نبوی (بنام مقوقس) سے مقابلے پر عام مشابہت نظر آئی۔ خاص کر مہر دونوں پر یکساں معلوم ہوئی۔ خط مختلف تھا اور ظاہر ہے کہ یہ کاتب کے مختلف ہونے کا نتیجہ ہوگا۔ اس خط کا متن جو عربی تاریخوں میں ملتا ہے ان میں باہم خفیف سا فرق ہے۔ چنانچہ تاریخ طبری میں خط کی سطر نمبر ۳ میں النجاشی الاصحم ملک الحبشۃ ہے یعنی نام زائد ہے اور "عظیم" کی جگہ ملک کا لفظ ہے نیز سلام علی من اتبع الھدیٰ کی جگہ "سلم انت" ہے اور "اما بعد" نہیں ہے اور خاص کر آخر میں طبری میں "وقد بعثت الیک ابن عمی جعفر اور نفراً معہ من

المسلمين فاذاجائک فاقرهم ودع التجبر" کا جملہ زائد ہے باقی خط تقریباً یکساں ہے۔ طبری کے برخلاف سیرۃ حلبیہ میں جو متن ہے وہ ہو بہو یکساں معلوم ہوتا ہے حتیٰ کہ اس میں "توقن بالذی جاء فی" بھی ہے ورنہ عام طور سے طبری اور دیگر مؤلف اس کی جگہ توٴمن بالذی جاء فی کی روایت کرتے ہیں علم خطوط قدیمہ کے نقطۂ نظر سے برٹش میوزیم کے ماہروں کی رائے تھے کہ وہ اتنا قدیم نہیں معلوم ہوتا جتنا بیان کیا جاتا ہے جن جن لوگوں نے اصلی جھلی کو دیکھا ہے ان میں سے متعدد کی یہ رائے کہ اس جھلی کا جدید کے مقابل قدیم ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ مسٹر حمید اللہ مؤلف کتاب فرانسیسی "بر سیاست خارجہ اسلام بزمانۂ نبوی" کا خیال ہے کہ مکتوب نبوی کی اصل موجودہ نجاشی کے کتب خانے میں ہوگی۔[1] موجودہ مالک کا بیان ہے کہ اس نے چند سال قبل یہ دستاویز حبش کے ایک پادری کے پاس سے حاصل کی۔ اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ سابق میں وہ شہنشاہ حبشہ کے کتب خانہ میں رہی ہو۔ اور حالیہ (حبشی اطالوی) جنگ کے دوران میں وہ کسی طرح ایک پادری کے قبضے میں آئی جس نے بعد میں شام کا سفر کیا......"

اس قدر حالات دینے کے بعد مسٹرڈ نلاپ نے اس مکتوب کے جعلی ہونے کی رائے ظاہر کی ہے۔ اور اس کی دلیلیں مختصراً یہ ہیں:۔

۱۔ پیغمبرؐ اسلام نے خطوط بھیجے ہی نہیں۔ آپؐ اپنے کو عالمگیر نبی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ صرف عرب کی اصلاح چاہتے تھے۔ اصل میں بعد کے زمانے میں جب عیسائی مسلمان ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ حضرت عیسیٰ نے تمام دنیا میں اپنے حواری تبلیغ کے لیے بھیجے تھے تو مسلمانوں نے بھی اپنے نبی کی عزت کسی سے گھٹی ہوئی نظر نہ آنے کے لیے یہ قصہ گھڑ لیا ہے۔

۲۔ سابق میں مقوقس اور منذر بن ساوی کے نام جو اصل مکتوبات نبویؐ دستیاب ہوئے تھے ان کے متعلق نولدکے اوشوالی نے اور شلاکٹر نے جعلی ہونے کی رائے دی تھی۔

۱۔ میں نے یوں نہیں لکھا تھا بلکہ خط میں رائے ظاہر کی تھی کہ اصل کا حبش کے کسی شخص سے حاصل کیا جانا بیان کیا جاتا ہے۔ تو ممکن ہے کہ جلاوطنی کے زمانے میں خود نجاشی یا اس کے ساتھی یہ مکتوب اپنے ساتھ حبش سے لائے ہوں۔ کیونکہ چند دن قبل اس کے حبش میں ہونے اور عام زیارت کرائے جانے کی خبر آئی تھی۔ (م۔ح۔ا)

۳۔ برٹش میوزیم کے ماہرین نے موجودہ جھلی کو جعلی قرار دیا۔

۴۔ سیرۃ ابن ہشام میں جہاں مکتوبات نبویہ کے بھیجے جانے کا ذکر ہے وہاں شروع میں ابن اسحاق کا نام نہیں ہے..... (گویا یہ روایت ابن ہشام کی یا ان کے زمانے کی پیداوار ہے)

۵۔ قرآن مجید کے جو پرانے نسخے ملتے ہیں ان کے خط سے اس مکتوب کا خط کافی مختلف ہے۔

۶۔ آج کل بہت سی چیزیں پرانی کہہ کر بیچی جا رہی ہے مگر وہ جعلی چیزیں ہیں۔

۷۔ اس خط کا متن جو عربی تاریخوں میں ہے اس میں اور جھلی کی عبارت میں خاصا فرق ہے۔

یہ سات دلیلیں جن میں سے زیادہ تر صرف پرانی پادریانہ باتیں دہرائی گئی ہیں، کسی سنجیدہ التفات کے قابل نہیں تھیں۔ صرف نوجوان ناظرین کے معلومات کے لیے ان کے کچھ تحلیل کر دی جاتی ہے۔

پہلی دلیل: محض ایک بے تکا اعتراض ہے۔ ماارسلنک الارحمة للعالمين. ماارسلنک الاكافة للناس. هوالذی ارسل رسوله بالهدی ودين الحق ليظهره علی الدين كله. وغیرہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں بتاتی ہیں کہ رسول عربی عالمگیر نبی تھے یہ اور بات ہے کہ انسان ہونے کی وجہ سے اس عالم اسباب میں آپ نے اپنی تبلیغی زندگی صرف حجاز میں گزاری ہو۔

اس کے برخلاف حضرت عیسیٰ کے متعلق خود انجیل میں، کئی جگہ مذکور ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے نبی ہیں حتیٰ کہ اپنی مبلغوں کو بھی ہدایت کی کہ غیر یہودیوں میں تبلیغ نہ کریں اور فرمایا کہ میں صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ اور امریکی پادریوں کی جدید تحقیقات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا حواریوں کو دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجنا ایک من گھڑت قصہ ہے انہوں نے خود نہیں بھیجا تھا۔ بہر کیف یہ اعتراض اور الزامی جواب اس بحث سے کم متعلق ہیں۔ اگر ڈ نلاپ صاحب خود اسے نہ چھیڑتے تو ہم بھی اس بحث میں نہ پڑتے۔ عہد نبویؐ میں موتہ (فلسطین) پر حملہ کیا اس دعوے کا جواب نہیں ہے کہ آپ صرف عرب کی نبیؐ تھے؟

دوسری دلیل: اس کا تفصیلی جواب اپنے سابقہ مضمونوں میں دے چکا ہوں۔ دیکھئے مجلّہ عثمانیہ (جلد ۹ شمارہ ۳۔۴ مکتوبات نبوی کے دو اصول) اور اسلامک کلچر (اکتوبر ۱۹۳۹ء ابتدائے سنہ ہجری کے چند عربی کتبات مدینہ۔ آخر الذکر زیادہ مفصل ہے۔ اب انہیں اعتراضات کو دہرا کر جوابات دینا تحصیل حاصل ہے۔ مختصراً وہ اعتراضات ناواقف اور جاہل لوگوں کے ہیں یوں بھی دیگر خطوط جعلی ہوں تو یہ کیا ضروری ہے کہ موجودہ خط بھی جعلی ہی ہو۔

تیسری دلیل: برٹش میوزیم کے دو ماہرین نے صرف اتنا کہا کہ جھلی اتنی پرانی نہیں معلوم ہوتی کہ عہدِ نبوی کی ہو۔ اس قسم کی تخمینی معاملات میں "ماہرین" میں جتنا کثیر اور مضحکہ خیز اختلاف ہوتا ہے وہ علم آثار قدیمہ سے ادنیٰ مس رکھنے والے بھی جانتے ہیں۔ ہم نے اصلی جھلی کے دیکھنے کا موقع نہیں پایا ممکن ہے۔ بعض دوسرے ماہر دیکھیں تو اس جھلی اور اس کی تحریر کو اتنا ہی قدیم قرار دیں جتنا اس کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

چوتھی دلیل: اس ناواقفانہ اعتراض کا تفصیلی جواب میں نے رسالہ معارف اعظم گڑھ (جون ۱۹۳۵ء) "آنحضرت کا خط قیصر روم کے نام" میں دیا ہے۔ مختصر یہ کہ عبارت کے شروع میں "قال ابن اسحاق" نہ کہنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ایک تو دوران عبارت میں کئی جگہ ابن اسحاق کا ذکر ہے اور دوسرے ابن ہشام نے آخر میں بیان کیا ہے کہ فلاں فلاں مکتوبات نبویہ کا ذکر خاص میرا ہے۔ جس کے معنے صاف یہ ہیں کہ باقی خطوط کا ذکر ابن اسحاق ہی کے حوالے سے ہے۔

پانچویں دلیل: سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اول تو قرآن مجید کا خط خاص آرائش سے لکھا جانا چاہیئے اور معمولی سرکاری مراسلے الگ دفتری خط میں۔ دوسرے مقابلہ تو ایسی تحریروں سے ہو جو مسلمہ طور سے عہد نبوی یا اس کے قریبی زمانے کی ہوں نہ کہ کئی صدی بعد کی تحریروں سے۔

چھٹی دلیل: کو بچکانی اعتراض کہنا چاہیئے۔ بازار میں تاجر بھاؤ بڑھانے کو کوئی چیز پرانی بتائے تو ہمیشہ اور سو فیصد صورتوں میں اس کا جھوٹ کہنا کیا ضروری ہے؟ ہم کو

اپنی ذاتی رائے قائم کرنے چاہیئے نہ کہ دودھ سے جل چکے ہوں تو چھاچھ بھی پھونک پھونک کر ہی پئیں۔

ساتویں دلیل: ہی البتہ ایک ایسی چیز ہے جو سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جب میں نے اپنا فرانسیسی مقالہ پیش کیا تھا تو اس میں (ص ۱۴ ص ۳۸ تعلیق نمبر ۵ میں نے مکتوب نبوی بنام نجاشی کے اس متن پر جو طبری میں ہے) یہ رائے ظاہر کی تھی۔

تمام اسلامی مورخ متفق ہیں کہ یہ خط ۶ ھ میں بھیجا گیا۔ مگر اس کے بعض جملے مثلاً "میں تیرے پاس اپنے چچازاد بھائی جعفر کو بھیج رہا ہوں جس کے ہمراہ چند مسلمان بھی ہیں جب وہ تیرے پاس آئے تو ان کی مہمانداری کر......" ایسے ہیں جن سے اس گمان کی تائید ہوتی ہے کہ یہ خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد بھائی کو ان کے ہجرت کر کے حبش جاتے وقت بغرض تعارف (تقریباً ۵ نبوی ۸ قبل ہجرت میں دیا) ہوگا۔ بنا براں جو متن ہمارے سامنے ہے وہ اصل میں دو الگ الگ خطوں کی عبارتوں کا مرکب ہوگا۔ مکتوب ثانی بے شک ۶ ھ میں بھیجا جا سکتا ہے۔ تاکہ نجاشی کو اسلام لانے کی دعوت کی تبلیغ کرے۔ رہا وہ خط جس میں مہاجرین کے پہنچنے پر ان کی مہمانداری کرنے کی خواہش کی گئی ہے۔ ۶ ھ کے اواخر میں کسی طرح نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ مہاجرین کو حبشہ پہنچ کر تب کوئی چودہ سال گزر چکے تھے۔ اور اس وقت تو وہ وہاں سے مدینہ واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔

یہی خیال میں نے انجمن ترقی اُردو کی شائع کردہ کتاب "حبش اور اطالیہ" کے باب "عرب اور حبشہ" میں ظاہر کیا تھا۔ موجودہ جھلی کی دریافت سے اس خیال کی پوری تائید ہوگئی اور اس میں حضرت جعفر طیار کے تعارف وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ خالص تبلیغی خط ہے۔

رہا تاریخوں میں مندرج متن سے اختلاف اس کی وجہ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ "روایت باللفظ کی طرح روایت بالمعنیٰ" کا بھی عربوں میں رواج رہا اور جتنا بھی اختلاف تاریخوں کے متن اور جھلی کے متن میں ملتا ہے وہ صرف ایک ہی مفہوم کو دوسرے مترادف الفاظ میں ظاہر کرنے پر مشتمل ہے اور بس۔ خاص چیز یہ قابل ذکر ہے کہ ایک تاریخ میں ایک جملہ

روایت بالمعنی کے باعث بدلا ہے تو دوسرے میں دوسرا۔ بہ حیثیت مجموعی پورے خط کی اصلی عبارت تاریخوں میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ سیرۃ حلبیہ کا متن بہت زیادہ مطابق اصل ہے اور خود مسٹرڈ نلاپ نے تسلیم کیا ہے کہ اگر ابن الاثیر نے اپنی تاریخ میں ایک جگہ جو نامکمل اقتباس دیا ہے اس کی جگہ پورا متن دیا ہوتا تو جعلی کی عبارت سے سو فیصد متفق ہوتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تاریخوں کے متن کا دستاویز کے مندرجات سے مختلف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی جعلساز نے کسی تاریخ کی عبارت نقل کر کے فرضی دستاویز نہیں تیار کی ہے۔

یہ تو مسٹرڈ نلاپ کی اعتراضی دلیلوں کے جواب تھے۔ مسٹرڈ نلاپ نے بعض اہم چیزوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ موجودہ خط کی مہر سابق میں دستیاب شدہ مکتوبات پر کی مہر کے بالکل مطابق ہے اس کی اہمیت پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔ چونکہ سابقہ مکتوب اور موجودہ مکتوب کی تحریر مختلف ہے اس لیے اس کا بھی اب امکان نہ رہا کہ دونوں کو ایک ہی شخص کا جعل قرار دیا جائے۔ ان دونوں کی دستیابی کے مقامات بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

۲۔ جعلی کی عبارت کا رسم الخط خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ "فاقبلوا" کی جگہ بغیر الف کے "فاقبلو" لکھا گیا ہے۔ نیز "اتبع" کی جگہ (ت) کے دو شوشے "اتتبع" ہیں۔ اگر مسٹرڈ نلاپ کے رائے کے مطابق اسے صرف ستر اسی سال قبل کی جعل سمجھیں تو ان خصوصیات کی توجیہ ناممکن ہے۔ اس طرح کے لکھنے کا رواج عہد نبوی میں رہا ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے اور حالیہ زمانے میں کوئی اسی طرح لکھے تو اسے غلطی سمجھا جاتا ہے۔ "فاقبلو" کی مماثل نظریں قرآن مجید میں بکثرت ملیں گی اور "اتتبع" کی بھی ایک۔ چنانچہ سورہ نمبر ۵۱ آیت نمبر ۴۷ میں "والسماء بنینھا باییدٍ" اب تک لکھا جاتا ہے حالانکہ "باید" بالکل کافی تھا (فلسطین کے ایک قدیم کتبے میں جو حال میں دستیاب ہوا ہے "آمین" کا لفظ دو شوشوں کے ساتھ "آمیین" لکھا گیا ہے۔ دیکھیے کاں تی نو کی فرانسیسی کتاب "فہرست کتبات پالمیرا" مطبوعہ بیروت ۱۹۳۳ء ص ۵۱) اور مکتوب نبویؐ بنام منذر کی اصل میں بھی "عمیرہ" کا لفظ دو شوشوں سے "عمیر" لکھا گیا ہے۔

۳۔ خط میں نقطے اور اعراب بالکل نہیں ہیں حالانکہ نقطوں وغیرہ کا رواج پہلی صدی ہجری ہی سے شروع ہو گیا تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ جعلی نقطوں اور اعراب کی ایجاد سے قبل کی ہے۔

۴۔ الفاظ کے ٹکڑے کر کے آدھا لفظ ایک سطر میں اور باقی دوسری سطر میں لکھنا مثلاً ر/سول ال/مک، ر/او، جنو/ دک وغیرہ بھی صرف قدیم زمانے میں اور آج کل اس کا رواج نہیں ہے۔ مصر میں کچھ عرصہ قبل جو ۳۱ (یعنی حضرت عثمانؓ کے زمانے) کا کتبہ دستیاب ہوا تھا، اس میں بھی یہی حال ہے اور مقوقس اور منذر کے نام کے اصل مکتوبات نبویؐ میں بھی یہی چیز ملتی ہے۔ حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب مدینہ منورہ کے قرآن کے ایک صفحے کا جو فوٹو ترکی حکومت نے شائع کیا ہے اس میں بھی یہی کیفیت ہے۔

۵۔ "م" اور "ھ" کے لکھنے کے طریقے بھی نہایت قدیم ہیں۔ میم سطر کے نیچے نہیں بلکہ اوپر ہے مثلاً محمدؐ (محمدؐ) اور "ھ" کو ہم آج کل کی "ع" سے مشابہ پاتے ہیں مثلاً (اشھد) کو منذر کے خطبے میں (سعد) لکھا ہے اور موجودہ نجاشی کے خط میں (سعد) اور مقوقس کے خط میں (الھدیٰ) کو (سعد) جو مختلف کاتبوں کی کشش کے فرق کا ظاہر کرتا ہے۔

۶۔ خط جس جگہ سے اور جن حالات میں دستیاب ہوا ہے وہ بھی ہر طرح کے شبہے سے بالا معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کو وہیں ہونا بھی چاہیئے تھا اور حبشی اطالوی جنگ کے مفلس مفروروں کا اسے لا کر کسی کے ہاتھ بیچ دینا ہر طرح معقول سمجھا جا سکتا ہے۔

غرض ہمارے خیال میں یہ وجود مکتوب زیر نظر کی اصلیت کی مخالفت سے زیادہ تائید میں ہماری رائے قائم کراتے ہیں۔

مسٹرڈ نلاپ کا آج کل قیام گلاسگو میں ہے۔ میں نے خط لکھ کر دریافت کیا ہے کہ دمشق کے مالک کا نام اور حیثیت کیا ہے۔ خدا معلوم موجودہ یا جوجی ماجوجی جنگ میں اس یادگار کا کیا حال ہوا ہے۔ کیونکہ دمشق بھی اس کے نرغے میں آ چکا ہے۔

مکتوباتِ نبویؐ کے دو اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں یا قبائل کے سرداروں کے نام جو خطوط روانہ فرمائے تھے ان کی تعداد اب سوا دو سو تک ہو گئی[1] ہے اس کا سب سے پہلا مجموعہ جو کوئی بیس ایک نامہ ہائے مبارک پر مشتمل ہے حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ گورنر یمن کی تالیف[2] تھی مجھے سعادت حاصل ہوئی کہ چند ماہ قبل اس موضوع پر ایک ضخیم تالیف شائع کر سکوں۔[3] مگر اصل خط عرصے سے ناپید ہو چلے ہیں۔ کچھ خطوط اس سرکاری ریکارڈ آفس میں تلف ہو گئے ہوں گے جو یوم الجماجم کے موقع پر حجاج بن یوسف کے عہد میں عوام کے ہاتھوں جل کر برباد ہو گئی۔[4] بڑا حصہ مرسل الیہم کی بے پروائی کے نذر ہوا ہوگا۔ لیکن پھر بھی تاریخ میں ابھی حال حال تک متعدد خطوط کی اصل کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ ایک خط اسپین کے عیسائی بادشاہوں کے قبضے میں تھا جس کی چشم دید کیفیت چھٹی صدی ہجری تک کے مؤلفین کی کتابوں میں ملتی ہے (اس بارے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے میری کتاب دو کیوماں جلد اول صفحہ نمبر ۳۵، نیز کتانی کی کتاب التراتیب الاداریہ مطبوعہ رباط ۱۳۴۶ھ جلد اول صفحہ

۱۔ دیکھیے میری فرانسیسی تالیف "دو کیوماں سیور لا دپلوماسی مسلمان" مطبوعہ پیرس ۱۹۳۵ء حصہ دوم صفحہ نمبر ۹ تا ۹۷ نیز بعض خطوط کے لیے دیکھیے منشات السلاطین مؤلفہ احمد فریدون مطبوعہ استانبول ۱۲۷۴ھ صفحہ ۲۰ تا ۵۳۔

۲۔ دو کیوماں جلد اول صفحہ ۱۰ جلد دوم صفحہ ۱۳۱ یہ رسالہ "اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین" مؤلفہ ابن طولون میں بطور ضمیمہ محفوظ ہے جو کہ حال میں دمشق میں چھپی ہے۔

۳۔ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ۔ طبع مصر

۴۔ کتاب الخراج ابو یوسف صفحہ ۳۲۔ نیز بلاذری یحییٰ بن آدم و ماوردی۔

۱۵۶ تا ۱۶۵) ایک اور فرمان عطائے جاگیر کے لیے تمیم داری رضی اللہ عنہ کو سرفراز ہونا امام ابو یوسف جیسے قدیم مؤلف (کتاب الخراج صفحہ ۱۳۲ میں) بیان کرتے ہیں۔ اس خط کی چشم دید کیفیت بڑی تفصیل سے ابن فضل اللہ العمری نے (کتاب مسالک الابصار جلد اول صفحہ ۱۷۴ الخ) بیان کی ہے (مزید حالات کے لیے دیکھیے دو کیوماں صفحہ ۶۱ تا ۶۳)

مگر آج کی صحبت میں ان دو خطوط پر کچھ معلومات جمع کیے جائیں گے جو حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اور اس عکس اور فوٹو لے سکنے کا خوش نصیب موقع فراہم ہو گیا ہے۔ ایک مقوقس مصر کے قبطی صدر پادری کے نام ہے جس کا فوٹو عرصے سے ہندوستان میں معروف ہے۔ دوسرا خط بحرین کے مسلمان گورنر منذر بن ساوی کے نام ہے جس کا فوٹو ۱۸۶۳ء میں جرمن رسالے ZDMG میں چھپا ہے۔ ان دونوں انمول نوادر پر عملی حیثیت سے یورپ میں بہت کم بحث کی گئی ہے اور اُردو میں بالکل نہیں ہم ہر خط پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔

پہلا خط

پہلے خط کے سلسلے میں یہ بیان کرنے سے پہلے کہ وہ کب اور کہاں دستیاب ہوا، اولاً اس کے کچھ تاریخی حالات بیان کیے جاتے ہیں کہ وہ کب اور کن حالات میں لکھا گیا تھا۔

جب تحریک اسلامی کی مخالفت ہونے لگی اور مسلمانوں کو ناقابلِ برداشت تکلیفیں گہوارۂ اسلام (مکہ معظمہ) میں پہنچیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً وطن کو خیر باد کہا اور مدینے میں آ بسے۔ مسلمانوں کی تعداد یہاں تیزی سے بڑھنے لگی اور پانچ ہی برس میں عرب کے خاصے بڑے حصے پر ان کا اثر پھیل گیا۔ اور مکہ والوں کو بھی سوائے اس کے چارہ نہ رہا کہ مسلمانوں سے دوستی پیدا کریں۔ خاص کر اس لیے کہ ہجرت کے بعد ہی ۲ھ میں ان کو بدر میں مسلمانوں نے بڑی سخت شکست دی اور گو ۳ھ میں ان کے حملے سے احد میں مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے مگر وہ اس فتح سے فائدہ اُٹھائے بغیر مکہ چلے گئے اور ۵ھ میں مدینے کا ناکام محاصرہ کر کے وہ مایوس واپس ہو گئے تھے اور ان کے تجارتی راستوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانے سے وہ بے بس ہو چکے تھے۔ خیبر میں یہودیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکہ والوں سے صلح مناسب خیال کی چنانچہ اواخر ۶ھ میں

حدیبیہ میں (جو جدہ اور مکۂ معظمہ کے مابین ہے) ایک عہد نامہ صلح و غیر جانبداری پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔

اس زمانے میں خارجہ ممالک کی سیاسی حالت بڑی پراگندہ ہو گئی تھی۔ عرب کے ہمسایوں میں دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ ایران اور روم (یا بیزنطینی حکومت) ایران میں نہ صرف عراق شامل تھا بلکہ خود اندرون عرب، بحرین عمان اور یمن پر بھی انہیں حکمرانی تھی۔ بیزنطینیوں کا اثر مصر و حبشہ کے علاوہ عرب کے شمالی حصے پر تھا جو بیزنطینی صوبۂ فلسطین سے متصل تھا۔ ایرانیوں اور بیزنطینیوں میں جو جنگ چلی آ رہی تھی، اس کا خاتمہ یوں ہوا کہ ۶ھ کے وسط میں نینوا کے مقام پر ایرانیوں کو اتنی فاش اور قطعی شکست ہوئی کہ وہ پھر سنبھل نہ سکے۔ اگرچہ بیزنطینیوں کو فتح ہوئی مگر یہ فتح بڑی مہنگی تھی اور ان کو اپنی حالت سدھارنے کے لیے بہت کچھ کرنا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا تھا کہ ان ہمسایہ سلطنتوں کے حکمرانوں کو براہ راست مذہب اسلام کی جانب مدعو کریں اور ان کے انکار کی صورت میں ان کے مختلف والیان صوبہ کو تبلیغ کریں۔

چنانچہ حدیبیہ سے واپس آ کر ۶ھ ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد تبلیغی خط روانہ کیے جن میں سے ایک بیزنطینی حکمران قیصر ہرقل کے نام تھا۔[1] اور ایرانی تاجدار خسرو پرویز کے نام۔ نامہ بر کو ایک اور خط بھی دیا گیا کہ راستے میں بحرین کے صوبہ دار منذر بن ساوی کو دیا جائے۔ ان کے علاوہ ایک خط مصر کے صوبہ دار اور صدر پادری مقوقس کو بھی بھیجا گیا۔

آخر الذکر دو خطوں کے اصول، جیسا کہ عرض کیا گیا حال میں دستیاب ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مقوقس کے خط کے سلسلے میں مشہور فرانسیسی شرقیاتی موسیو رے نو (Reinaud) نے پیرس کے سہ ماہی رسالے ژورنال آزیاتیک بابتہ ۱۹۵۴ء (سلسلہ پنجم جلد چہارم) میں ایک خط شائع کرایا جو اس کے نام قاہرہ سے موسیو بے لین (Belin) نے ۱۰ مارچ ۱۸۵۲ء کو لکھا تھا۔

۱۔ خاص اس خط پر میرا ایک مضمون رسالہ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۳۵ء میں چھپا ہے۔ یہ اس کتاب میں بھی درج ہے۔

یہ خط رسالۂ مذکورہ کے کوئی پندرہ بیس صفحوں میں آیا ہے۔ اس کے ضروری اقتباسات کا یہاں لفظی ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۲۸۲)[1] ...... ایک قلمی دستاویز جو میں نے حال میں دیکھی اور جس کے متعلق مجلس شرقیات فرانس (سوسی اے تے آزیاتیک) کو بھی اس کے اجلاس منعقدہ ۱۱ دسمبر ۱۸۵۱ میں اطلاع ملی ہے یہ دستاویز جس کے متعلق میں یہاں کچھ کہنا چاہتا ہوں، موسیو اے۔ تی۔ این بار تل می (Etienne Batthelemy) نے دریافت کی ہے۔

''موسیو بارتل می قاہرہ میں ایک نوجوان فرانسیسی شرقیاتی ہیں۔ وہ عربی کے جتنے بڑے ماہر ہیں اتنے ہی زیادہ منکسر المزاج بھی ہیں۔ وہ کچھ عرصے سے مصر کی قدیم زبان کا مطالعہ کرنے لگے ہیں اور خاص کر قبطی زبان کے مخطوطات تلاش کر رہے ہیں جو مصر کے تنہائی پسند راہبوں کے قبضے میں موجود ہیں اور عہد سلف کے متعلق قیمتی آثار پر مشتمل ہیں۔

(۲۸۳)[1] ...... گذشتہ سال کے ایک سفر میں موسیو بارتل می نے بہت سی رقم خرچ دی اور مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ پھر بھی بہت کم چیزیں دستیاب ہوئیں۔ آخر ایک دن جب وہ تھکن سے چور چور ہو چکے تھے۔ اخمیم کے قریب ایک راہب خانے کو پہنچے۔ اس راہب خانے میں ایک عربی مخطوط دستیاب ہوا جو صورت سے بہت معمولی نظر آتا تھا۔ اس کی جلد سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اصل میں کسی ایسی کتاب کے لیے تیار کی گئی تھی جو نا سے بڑے حجم کی ہو گی۔ یہ جلد کناروں پر خراب ہو گئی تھی اور اس کے اندر سے کچھ قبطی ... دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارے سیاح نے کوشش کی کہ اس پہلے ورق کو الگ کرے جو متعدد لکھے ہوئے اوراق کو لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ جب احتیاط کے ساتھ اسے علیحدہ کیا گیا تو فی الحقیقت اندر سے کوئی دس اور اوراق برآمد ہوئے جن پر قدیم خط میں قبطی زبان میں انجیل لکھی ہوئی تھی۔ ان اوراق کو اس غرض سے جوڑ دیا گیا تھا کہ ایک مضبوط مقوے کا پٹھا بن جائے۔

اس کتاب کی جلد جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں تین حصوں پر مشتمل تھی۔ رو پشت اور دو پہلو دونوں پہلوؤں پر چمڑا جڑا ہوا تھا اور ان پہلوؤں پر جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، دس قبطی اوراق لگے ہوئے تھے۔ (۲۸۴) ...... ان اوراق کو ایک موٹے کاغذ میں لپیٹا گیا تھا اور سب کو

۱۔ یہ ہندسے جو دائروں کے اندر ہیں رسالہ ژورنال آزیاتیک کے صفحے ہیں۔

جوڑ دیا گیا تھا۔ وسطی حصہ جو باہر سے دونوں پہلوؤں کو ملاتا تھا، سیاہ چمڑے کے ایک ٹکڑے سے بنا ہوا تھا۔

''میں ان توضیحات پر معافی کا خواستگار ہوں۔ اگرچہ وہ شائد ضرورت سے زیادہ تفصیلی سمجھے جائیں لیکن وہ ہمارے دستاویز کی اصلی حالت کو واضح کریں گے۔''

''چنانچہ موسیو بارتیلمی نے دونوں پہلوؤں سے ان قبطی اوراق کو یکے بعد دیگرے جدا کیا جو کتاب کی جلد کی داخلی حصے (Parozs) پر مشتمل تھے۔ اس پر انہیں ان اوراق کے اندر بیچ میں دونوں پہلوؤں پر چپٹا ہوا کھال یا جھلی (Parchemin) کا ایک ٹکڑا نظر آیا جسے کیڑوں نے دو جگہ سے چاٹ دیا تھا موسیو بارتیلمی کو اس پر کوفی خط میں کچھ عربی حروف سے نظر آئے۔ ہزار کوشش کے بعد انہوں نے لفظ محمدؐ کو پڑھ لینے میں کامیابی حاصل کی۔ اب اس میں کوئی شبہ نہ رہا کہ یہ دستاویز خاص دلچسپی کی حامل ہے۔ اس لیے انہوں نے جتنی احتیاط ممکن تھی برت کر اس کھال کو پوری طرح علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ چاہے وہ کتنی ہی کوشش کرتے، وہ اسے بھگونے اور نرم کرنے پر مجبور تھے۔ اس کارروائی میں چند الفاظ جو پہلے ہی سے مٹ چلے تھے پوری طرح غائب ہو گئے..........

''اس کے بعد متعدد لوگوں کی مدد سے اس تحریر کو پڑھنے اور عربی تاریخوں سے اس متن کو برآمد کرنے کا ذکر ہے)

''(نوٹ) موسیو بارتیلمی سے بعض قبطیوں نے بیان کیا کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مصر میں مقوقس کے نام اپنے خط کی چار نقلیں بھیجی تھیں۔ مورخ اس ادعا کی مطلق تائید نہیں کرتے پھر یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کارروائی سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اگر (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سفیر اس خط کو کھو دیتے جسے وہ لے جا رہے تھے تو ایسی صورت میں ان کا کام بہت آسان تھا اور وہ پیام کو زبانی پہنچا سکتے تھے۔ قبطیوں کا دعویٰ ہے کہ ان نقلوں میں سے ایک اب تک قاہرہ میں ان کے بطریق کے گرجا (کنیسہ انبار مارقوس) میں محفوظ ہے۔ میں اس واقعے کی توثیق نہ کرا سکا۔ قبطی یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے

پاس (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک اور خط بھی ہے جو مقوقس کے جواب کے جواب میں آیا......

۴۹۶...... ''مجھے شروع ہی سے اس کا کم امکان نظر آتا ہے کہ یہ دستاویز کسی جعلسازی کا نتیجہ ہو کیونکہ اس فریب سے کوئی بھی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس دستاویز میں قبطی قوم کے لیے کسی قسم کی بھی رعایت کا کوئی حکم نہیں ہے۔ اس دستاویز سے اس طرح کا کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا تھا جس طرح مثلاً غیر متحدہ ارمنی عیسائیوں کی دستاویز ہے۔ ان ارمنوں کا ادعا ہے کہ ۴۹۷...... ایشیائے کوچک میں ان کے ایک راہب خانے کے کتب خانے میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک عہد محفوظ ہے۔ اس دستاویز کو انہوں نے ایک یا دو سال ہوئے خدیو مصر کی حکومت کے پاس پیش کیا تا کہ ان حقوق و مراعات کا مطالبہ کریں جو جناب رسالت مآبؐ نے اس ''عہد'' کے ذریعے سے انہیں عطا کیے تھے......''

یہ اس خط کی دریافت کے حالات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس کے نام بھیجا تھا۔ دریافت شدہ اصل پر مہر موجود ہے۔ اسی لیے اس نقل قرار دے سکنے کا امکان باقی نہیں رہتا کیونکہ نقل میں الفاظ لکھے جاتے۔ مہر کا نشان نہیں بنایا جاتا۔ اصلی خط کچھ دنوں بعد موسیو بارتیلمی نے سلطان عبدالمجید خاں اول کے ہاتھ تین سو اشرفی میں فروخت کر دیا۔ پھر یہ خط تبرکات نبویؐ کے ساتھ قصر شاہی کے خزانے میں داخل ہو گیا موسیو بے لیں نے ژورنال آزیاتیک میں اپنے مضمون کے ساتھ اس خط کا ایک چربہ (traced copy) شائع کرایا پھر ۱۹۰۴ء میں جرجی زیدان نے اپنے ماہوار عربی رسالے ''الہلال'' (قاہرہ) میں اس کی استنبول سے حاصل کردہ نقل کا فوٹو شائع کیا۔ غالباً اسی کی نقلیں ہندوستان میں آئیں اور ۱۹۱۷ء میں رسالہ اسلامک رویو (ووکنگ) میں بھی اس کا فوٹو چھپا مگر یہ نقل بھی اصل خط کا فوٹو نہیں بلکہ مرمت شدہ نقل (restored copy) کا فوٹو ہے۔ موسیو بے لیں کی نقل اور جرجی زیدان کی نقل کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اگر فوٹو کی جگہ ٹریس لیا جائے تو مختلف ہاتھوں کی نقلوں میں کتنا بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اصل خط اب تقریباً لاپتہ ہو چکا ہے اور ۱۹۳۲ء میں قیام استنبول کے زمانے میں باوجود کوشش اور تلاش کے مجھے اس کا سراغ نہ چل سکا۔

جیسا کہ ابھی عرض ہوا، اس خط کی دریافت بعض فرانسیسوں نے کی اور اس کا ذکر ۱۸۵۴ء میں رسالۂ ژورنال آزیاتیک میں کیا لیکن جرجی زیدان کے رسالۂ الہلال (مصر) نے نومبر ۱۹۰۴ء کے پرچے میں (ص ۱۰۴ پر) اس واقعے سے ہی انکار کر دیا اور لکھا:

مزید براں اس دریافت کا علمی (یورپی) کتابوں میں مطلق کوئی ذکر نہیں حالاں کہ مستشرقین اس کو بڑی اہمیت دیتے۔

البتہ دوسرے مہینے آکسفورڈ کے پروفیسر مارگولیوث کے توجہ دلانے پر مجبوراً اس کو ماننا پڑا (الہلال دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۶۰ الخ) یہ رسالہ مجھے حیدر آباد میں مل نہ سکتا تھا۔ میں اپنے دوست راحت اللہ خاں صاحب (ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ) کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے قیام مصر کے زمانے میں ازراہِ عنایت یہ مضمون مجھے نقل کر کے بھیج دیا۔

اس خط کی اصلیت پر جو اعتراض ہو سکتے یا ہوئے ہیں ان کا یہاں ذکر بے محل نہ ہوگا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لفظ مقوقس) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خط پر مختصر بحثیں کارابا چک اور آرے لینونے کی ہیں۔ بدقسمتی سے ان کی کتابیں باوجود کوشش کے حیدر آباد میں دستیاب نہ ہو سکیں مگر جہاں تک انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اشارے سے واضح ہوتا ہے ان مولفوں کے شبے کا واحد باعث یہ ہے کہ اس خط کی تحریر اتنی قدیم نہیں معلوم ہوتی بلکہ کافی عرصہ بعد کی ہے۔

ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ اس خط کا ایک چربہ ۱۸۵۴ء میں موسیو بے لیں نے ژورنال آزیاتیک میں شائع کیا اور دوسرا چربہ ایک مرمت شدہ نقل تھی جو غالباً استنبول سے حاصل کر کے رسالہ الہلال (مصر) نے شائع کی اور اسی ماخذ سے ہندوستان وغیرہ بھی نقلیں آئیں۔ ہمارے سامنے مضمون کے ساتھ یہ دونوں نقلیں بھی موجود ہیں۔ ان کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں اور بظاہر کوئی شخص یہ ماننے پر مشکل سے آمادہ ہوگا کہ یہ دونوں ایک ہی اصل کے چربے ہیں۔ جب دو مختلف ہاتھوں میں ایک ہی چیز کے چربے اتنے مختلف ہو جاتے ہیں تو پھر ان نقلوں کی بنا پر کسی صحیح رائے کا قائم کرنا ستم ظریفی ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے اصل مکتوب کا کوئی مستند عکس فوٹو کے ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچا ہے، اور نہ ہی موسیو بے لیں کے سوائے اصل پر رائے زنی کرنے والوں میں سے کسی نے بھی اس خط کو دیکھا ہے۔ موسیو بے

لیں نے اس خط کی تحریر پر کوئی رائے زنی اپنے مضمون میں نہیں کی ہے۔ غالباً اسے اس فن کی مہارت بھی نہ تھی۔ ان حالات میں اس اعتراض کی کوئی بڑی اہمیت نہیں رہتی۔

جرمنی کے مشہور شرقیاتی پروفیسر ڈاکٹر بکر (C.H. Backer) فوت ۱۹۳۳ء نے بھی اپنی کتاب (Papyti Schott-Reinhardt) جلد اول صفحہ (۳)

(نوٹ) (۳) میں اس مکتوب نبوی کو جعلی قرار دیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ''غالباً وہ حدیث کی کسی یادداشت (یا کتاب) کا ورق (Troadition-szettel) ہوگا؟

جرمنی کے اس سابق وزیراعظم کی قابلیت اور علم کا پورا اعتراف کرتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ شاید اس نے اس خط کے شائع شدہ فوٹو کو دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں نہیں سمجھتا کہ حدیث کی کتابوں یا بیاضوں میں جہاں یہ خط نقل ہو سکتا ہے، نقل نویس خط کے آخر مہر کی بھی ہو بہو نقل اتارنے کی کوشش کرے گا۔ مہر کی جگہ یا تو توضیح ہوگی کہ مہر میں فلاں الفاظ تھے یا زیادہ سے زیادہ ایک سادہ دائرہ بنا کر مہر کے الفاظ کی نقل اس میں لکھی جائے گی اس کے برخلاف شائع شدہ خط کے متعلق بیانات سے اور خود ہر دو فوٹوؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مہر کچھ اس طرح کی ہے کہ اسے صرف نقل نویس یا کاتب کے قلم سے بنی ہوئی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کائتانی (فوت کرمس ۱۹۳۵ء) نے اپنی کتاب (Annali detl, Islam) (دیکھیے حالات ۶ھ فقرہ ۴۹) میں اس خط کے بے اصل ہونے کی اور ہی دلیلیں پیش کی ہیں۔ خط کے فوٹو سے کوئی خاص بحث کیے بغیر اس نے اعتراضات کیے ہیں جو یہ ہیں۔

۱۔ اسلامی تاریخی بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مقوقس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں دو عیسائی لونڈیاں بھیجیں۔ مقوقس اسکندریہ کا بطریق یعنی بڑا پادری تھا اور یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کا کوئی بطریق ''عرب کے کسی بے دین'' کو دو عیسائی لونڈیاں تحفہ دے۔

۲۔ مقوقس کا نام بعد کے اسلامی مورخ کچھ اور بیان کرتے ہیں اور عہد نبویؐ کے مقوقس کا نام حقیقت میں کچھ اور تھا۔

مگر پہلے اعتراض کے سلسلے میں اس کے زمانے کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ٦ھ ٦٢٨ء میں عیسائیوں میں جس کثرت سے فرقے پیدا ہو رہے اور ایک دوسرے کو ملحد اور بے دین قرار دے رہے تھے۔ وہ سب جانتے ہیں اور تاریخ عیسائیت پر ہر کسی کتاب میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے اس وقت اسکندریہ کے بطریق کو اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہ تھا جتنا مکتوب نبویؐ میں اسے لکھا ہوا۔ ملا یا جو مسلمان سفیر نے اسے بیان کیا ہوگا۔ اسلام کو بھی اصلی زندگی یعنی مدنی دور شروع کر کے بہ مشکل چھے سال گزرے تھے اور عرب سے باہر اس سے کوئی واقف نہ تھا۔ موتہ اور تبوک کی لڑائیاں بھی پیش نہ آئی تھیں اور اسلام ابھی تک صرف اندرون عرب بدوی قبائل میں پھیل سکا تھا۔ اس کے ساتھ مقوقس مانوفزائٹ فرقے کا عیسائی تھا اور باور کرتا تھا کہ حضرت عیسیٰ میں دو نہیں صرف ایک طبیعت تھی۔ ان حالات میں وحدانیت کی تعلیم دینے والے عربی نبی کو اگر مقوقس ایک نئے عیسائی فرقے ہی کا بانی خیال کرتا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ماریہ[1] اور شیریں (یا سیرین) عیسائی تھیں تو اس کا منشاء شائد سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا کہ نبیؐ عربی کو فرقہ طبیعت واحد کا راسخ العقیدہ عیسائی بنا لینے میں ان لونڈیوں سے کام لے۔ زمانہ حال کے اس سب سے بڑے یورپی مورخ اسلام عیسائی عورتوں کا غیر عیسائیوں میں سیاسی اغراض اور تبلیغ عیسائیت کے لیے بھیجا جانا نہ صرف ایک عام روزمرہ کا واقعہ ہے بلکہ نہایت قدیم بھی۔ صلیبی لڑائیوں کے دوران میں تو یہ ایک مقدس اور بڑے ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا اور کہتے ہیں کہ خود پوپوں نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ یورپ کی خوبصورت عورتیں مسلمان مجاہدوں کو اپنے پر فریفتہ کرنے کی کوشش کریں اور مسلمانوں میں رہ کر عیسائیت کی ہر ممکنہ طریقے سے خدمت کریں۔

دوسرا اعتراض بھی کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ یہ صحیح ہے کہ عہد نبویؐ (۷ھ) کے مقوقس کا نام بنیامین تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ فتح مصر کے وقت قیروس (Cyrus) وغیرہ متعدد مختلف لوگ

۱۔ اٹلی کی مستشرقہ درجینیا واکانے جو غالبًا ایک یہودن ہے اس مسئلے سے بھی سطحی بحث کی ہے مگر وہ اس نام کو بجائے "ماریہ" کے "مریم" لکھتی ہے جو غلط ہے اس کے مضمون "آنحضرتؐ کے سفیر بادشاہوں کے پاس" اٹلی کے شرقیاتی رسالے (Rivists degli srudi Orientah) جلد نمبر ۱۰۔ ۱۹۲۳ء صفحہ ۸۷ تا ۱۰۹ میں چھپا ہے۔

تھے اگر ابتدائی عرب فاتحوں نے کسی غلط فہمی سے یہ سمجھ لیا کہ قیروس صرف سپہ سالار گورنر تھا (قیصر روم نے اسے آگسٹالس یعنی صدر پادری و گورنر دونوں اختیارات عطا کئے تھے) اور صدر پادری حقیقت میں بنیامین ہی تھا جس نے عرب فاتحوں کو مدد بھی دی تھی، تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کیونکہ بنیامین کو خسرو پرویز نے فتح مصر کے بعد اسکندریہ کا پادری بنایا تھا اور یہ قبطی شخص تھا۔ دس سال بعد جب قیصر روم نے مصر سے ایرانیوں کو نکال باہر کیا تو قبطی صدر پادری بھی مارے ڈر کے بھاگ گیا تھا کیونکہ اس نے مقامی بزنطینیوں (رومیوں) پر اختلاف عقائد کی بنا پر اپنی بطریقی کے زمانے میں بڑی سختیاں کی تھیں[1] یہ ظاہر ہے کہ مصر کے پادریوں اور عیسائیوں کے مذہبی معاملات میں ابتدائی مسلمان فاتحوں نے کوئی علمی دلچسپی بہت کم لی۔ ان کی معلومات کا واحد ذریعہ مقامی عیسائیوں کے بیانات تھے۔ کوئی تعجب نہیں کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری نیز بعد کے مسلمان مورخ ان چیزوں اور ناموں میں غلطی یا خلط ملط کریں اور بالکل ممکن ہے کہ یہ بعد کے مورخ کسی صوبے کے پادری کو پورے ملک کا پادری لکھ دیں یا ایک زمانے کے پادری کو دوسرے زمانے میں بیان کر دیں۔ اس سے مسلمان مورخوں کے ان بیانات کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے، مکتوب نبویؐ کی ارسال کو فرضی قرار دینا کسی بہتر استدلال کا محتاج رہے گا۔

موسیو ویٹ (Wiet) ایک یہودی النسل شرقیاتی جو پیرس کے مدرسۃ السنۂ مشرقیہ میں عربی کے مدرس ہیں اور قاہرہ کے "عربی عجائب خانہ" کے مہتمم بھی۔ انہوں نے مصری حکومت کے صرفے پر خطط مقریزی کا ایک نہایت خرچیلا اڈیشن بھی شائع کرنا شروع کیا ہے اس کی جلد اول صفحہ (۱۱۹) پر اس مکتوب نبوی بنام مقوقس کا بھی ذکر ہے۔ ایک طویل فرانسیسی نوٹ میں جو کئی صفحوں میں آیا ہے۔ موسیو ویٹ نے اس خط کے متعلق کئی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اس شائع شدہ خط کے فوٹو کے متعلق ان کے دو اعتراض قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مکتوب نبویؐ بنام مقوقس کی عبارت، مکتوب الیہ کے نام کو چھوڑ کر لفظ بہ لفظ وہی ہے

۱۔ مذکورہ بالا تفصیلات کے مکمل حوالے میری فرانسیسی تالیف "رو کیو ماں سیلو رلا دیلو ماسی مسلمان" جلد اول صفحہ (۸۳ تا ۶۵) میں ملیں گے۔ میرے معلومات کا ماخذ زیادہ تر Dict de Hist et de Geog Eles اور Dict de theol, Cath دو مستند فرانسیسی کتابیں رہی ہیں

جو مکتوبات نبویؐ بنام نجاشی وقیصر روم کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں خط فرضی ہیں۔

۲۔ اگرچہ بیان کیا جاتا ہے کہ مقوقس کا یہ خط سلطان عبدالمجید خاں اوّل کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا اور وہ استنبول میں آثار نبویہ کے ساتھ رکھا گیا ہے، لیکن مصر میں آج بھی ایک صاحب کے ہاں کہتے ہیں کہ یہ خط موجود ہے۔

پہلے اعتراض کے متعلق کسی حیرت کی ضرورت نہیں۔ یہ تینوں خط عرب مورخوں کے بیان کے مطابق ایک ہی دن لکھے گئے تھے۔ تینوں کا مقصد بھی ایک ہی تھا اور تینوں عیسائی حکمرانوں کے نام تھے۔ کوئی تعجب نہیں جو کاتب بھی ایک ہی رہا ہو۔ ان حالات میں یہ بالکل معمولی بات ہے کہ تینوں کی عبارت ایک ہی سی رہی ہو۔

افسوس ہے کہ موسیو ویت نے دوسرے اعتراض کی زیادہ تفصیل نہیں دی ہے۔ اور غالباً صرف وہ ایک سنی سنائی بات ہے اور اس خط کو دیکھنے کا انہیں موقع نہیں ملا جو ان کے بیان کے مطابق اب بھی مصر میں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس موضوع پر ریسرچ کرنے کے بعد واپسی میں دوبارہ مصر ٹھہرنے کا موقع نہ ملا ورنہ میری تلاش شائد اس اعتراض کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات فراہم کرنے میں کامیاب ہوسکتی اور ہمارے پاس کی دو فوٹوؤں سے اس کا مقابلہ بھی کیا جاسکتا۔

جیسا کہ دیکھا گیا، اعتراضات زیادہ تر خارجی اور قیاسی ہیں۔ خود خط پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ خط عہد نبویؐ کے رواج کے مطابق کھال پر ہے کاغذ پر نہیں۔ اگرچہ یہ ۱۸۵۴ء میں دستیاب ہوا، لیکن اس کا جو متن تیسری صدی ہجری کی عربی تالیفوں سے نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے وہ لفظ بہ لفظ وہی ہے جو اس اصل خط میں ملتا ہے۔ آخر میں مہر لگی ہوئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے متعلق جو عام روایت موجود ہے (کہ وہ تین سطری تھی سب سے نیچے "محمد" اس سے اوپر "رسول" اور سب سے اوپر "اللہ" کا لفظ لکھا ہوا تھا) یہ مہر اس کے بالکل مطابق ہے۔ (دیکھئے فتوح بلاذری باب "ختم")

جرمنی کے ایک اور یہودی النسل شرقیاتی نولڈکے (Noldeke) نے جو اعتراضات اس خط کے صحیح ہونے کے خلاف کئے ہیں دیکھئے Geschicte des Qorans 2nd ed

p 190.n3 ان میں سے پہلا تو یہی ہے کہ "اس زمانے میں دستاویزیں لکھنے کا خط غالباً اتنا زیادہ کوئی نہ تھا۔" اعتراض کے الفاظ خود ایسے ہیں کہ ہمیں اس پر کچھ زیادہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی ہم اس اعتراض کا جواب اوپر دے چکے ہیں کہ اس مکتوب نبوی کا صحیح فوٹو ہمیں نہیں ملا ہے اور یہ کہ عہد نبویؐ کی کوئی اور مسلمہ تحریر ہمارے پاس نہیں ہے کہ اس سے طرز تحریر کا مقابلہ کرسکیں اور یہ بھی ظاہر ہے قرآن مجید لکھنے کا خط اور عام سیاسی یا کاروباری دستاویزیں لکھنے کا خط مختلف ہوگا۔

نولڈکے کا دوسرا اعتراض اسی سلسلے میں یہ ہے کہ "اسی طرح اس زمانے میں لوگ دستخط کے لیے سیاہی سے مہر نہیں کرتے تھے بلکہ (Tonsiegel) یا "طین خاتم" یعنی ایک طرح کی چکنی چمٹنے والی مٹی پر مہر دباتے تھے۔"

نولڈکے نے اپنے دعوے کی تائید میں کوئی ثبوت یا حوالہ نہیں دیا ہے بے شبہ "طین خاتم" کا ذکر عربی ادبیات میں خاصا قدیم ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ یہ خط کے اوپر لپٹے ہوئے کاغذ یعنی لفافے پر لگائی جاتی تھی جیسے آج کل لاکھ کا برت ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے مستند استاذ ادبیات عربی مولانا سید ابراہیم صاحب کے ریمارک سے میں بھی متفق ہوں کہ "مٹی پر مہر" لفافے کے اوپر لگائی جانی چاہیئے تاکہ لفافہ کوئی کھول نہ لے۔ اصل خط پر تحریر کے آخر میں جو مہر کی جاتی ہے اس کا سیاہی سے ہونا ہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ بہرحال مجھے باوجود ذاتی تلاش اور دیگر اساتذہ سے دریافت کے اب تک اس بارے میں کوئی بیان کسی کتاب میں نہ مل سکا کہ عہد نبویؐ میں مہر کس طرح کی جاتی تھی۔ جو کچھ بیان اب تک مجھے مل سکا ہے وہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسایہ حکمرانوں کو خط لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ بیرونی ممالک میں جب تک خط پر مہر نہ ہو اس پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چاندی کی مہر بنائی جس پر تین سطروں میں محمد رسول اللہ" کے الفاظ کندہ تھے اور لفظ "محمد" سب سے نیچے تھا۔ اس کے اوپر "رسول" اور سب سے اوپر "اللہ" دیکھئے طبقات ابن سعد جلد اوّل حصہ دوم باب مکتوبات نبویؐ میں لفافوں کا رواج ہوگا جیسا کہ عبداللہ بن جحش کی مہم میں پتہ چلتا ہے کہ خط دے کر کہا کہ تین دن سفر کے بعد کھولنا۔

ان سب کے علاوہ ایک اور امر بھی قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ جو خط کسی حکمران وغیرہ کے نام کسی عارضی اور خاص ضرورت کے لیے بھیجا جائے اس پر اگر ''مٹی کی مہر'' بھی لگائی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو نوشتہ کسی شخص کو کسی مستقل ضرورت کے لیے دیا جائے اور ثبوت میں اس کو اکثر دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہو، اس پر مہر اس قسم کی ہونی چاہیے جو رفتہ رفتہ یا جلدی ہی معدوم نہ ہو جائے جیسا کہ مٹی وغیرہ کی صورت میں ممکن ہے، مکتوباتِ نبویؐ کے سلسلے میں چھ کے متعلق مورخ صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ ان پر مہر لگائی گئی (دیکھئے میری الوثائق السیاسیہ ۴۹، ۵۶، ۵۷، ۷۶، ۱۴۱، ۱۹۰) اگر کہیں مٹی کی اور کہیں سیاہی کی مہر ہوتی تو مورخ ضرور بیان کر دیتے حالانکہ ان میں سے بعض ایسے خط ہیں جو سند اور ہمیشہ کام آنے والے منشور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مورخوں کی خاموشی سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سب ہی طرح کی مہریں تھیں۔ اس قیاس کی تائید اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ دستاویز ۱۹۰ (اکیدر) میں ایک خاص قسم سے مہر کی گئی تھی تو اس کا ذکر کر دیا گیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "خَتَمَهُ بظفره" یعنی اس پر ناخن سے مہر لگائی گئی۔ ناخن سے ہلال کی وضع کا نشان کر دینا بابلی تمدن میں قدیم سے رائج تھا۔ دیکھئے:

Olut Kiuckmann Neue babylonischb Recht-und Vewaltungstexte, Text 37. Tatel 28.B M issner Babylomen und Assyrien 1.179. Hamidullah. Doeumente sur la Diplomatie Musulmane 1. 98.

اور اکیدر حاکم دومۃ الجندل کا (جس کے معاہدے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناخن کی مہر کی تھی) خاندان حیرہ ہی میں رہتا تھا اور ثابت ہوتا ہے کہ بابل کے قدیم رواج تب تک حیرہ میں رائج تھے (حیرہ موجودہ کوفے کے پاس تھا اور بابل موجودہ بغداد کے پاس)

نولڈکے کا تیسرا اور آخری اعتراض یہ ہے کہ ''اس قسم کی سرکاری تحریروں میں نہ صرف کاتب کا نام ہونا چاہیئے بلکہ خود خط لے جانے والے سفیر کا بھی نام صراحت سے ذکر ہونا چاہیئے۔'' جیسا کہ ابھی ہم نے بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ خط و کتابت کا انتظام کریں اور ۶ ھ میں حکومت اسلامیہ کا دارالانشاء جتنا سادہ ہو گا ظاہر ہے

ہمارے خیال کی تائید میں ابن عبدالبر (استیعاب جلد نمبر ا صفحہ ۲۶، سطر ۲۰۷) کا بیان قابلِ غور ہے وہ کہتے ہیں عہد نبویؐ میں ابتداً خط کے آخر میں کاتب کا نام نہیں ہوتا تھا۔ کچھ دنوں بعد حضرت ابی بن کعب نے جب ان سے مراسلات لکھائے جانے لگے تو آخر میں لکھنا شروع کیا کہ ''بقلم فلاں'' یہی حال نولڈکے، کے اعتراض کے دوسرے جز کا بھی سمجھنا چاہیئے کہ مکتوب کے لے جانے والے کا نام کیوں نہیں بیان ہوا۔ جب ہزار ڈیڑھ ہزار برس سے تمام اسلامی مؤلف بیان کرتے آرہے ہیں کہ مکتوب نبویؐ کی پوری عبارت کیا تھی اور اب اس کی حرف بحرف تائید دستیاب شدہ خط سے ہوتی ہے تو پھر اس قسم کے فرضی اعتراض کتنی وقعت رکھ سکتے ہیں؟ (تتمہ مضمون کے آخر میں ملاحظہ ہو)

دوسرا خط

دوسرا خط جیسا کہ بیان کیا گیا، منذر بن مساوی کے نام ہے۔ بلاذری (فتوح البلدان صفحہ ۷۹) اور ابن الاثیر (الکامل جلد ۲ صفحہ ۱۷۵) نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ ھ میں منذر کے نام ایک خط لکھا اور معلوم ہوتا ہے کہ پایۂ تخت ایران کی کمزوری اور دیگر وجوہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کامیاب رہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارت نے واپس آ کر جب حالات بیان کیے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منذر کو ایک اور خط بھیجا جس میں اسے بحرین کی گورنری پر بحال رکھا گیا اور غیر مسلم باشندوں سے سلوک کے متعلق چند ہدایتیں دیں۔ یہی خط ہے جو حال میں دوبارہ دستیاب ہوا۔ چونکہ یہ خط مقوقس کے خط سے کم از کم چند ماہ بعد کا ہے اس لیے یہ ضروری نہیں کہ دونوں کا کاتب بھی ایک ہی رہا ہو۔

اس خط کا ذکر پہلی مرتبہ جرمن مجلس شرقیات کے رسالے (ZDMG) جلد ۱۷، ۱۸۶۳ء، صفحہ ۳۸۶ تا ۳۸۶) میں ہوا اور وہیں اس خط کا چربہ بھی چھپا۔

''جرمن سفیر قسطنطنیہ کے اتاچی (مددگار) ڈاکٹر بوش (Busch) نے ۱۸۶۳ء میں رسالہ (ZDMG) کے نام یہ خط لکھا:

''بالآخر میں اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ ایک عجیب چیز کا ذکر کروں۔ خواہ وہ

مصنوعی ہو یا نہ ہو بہر حال ایک خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ موسیو بے لیس نے مصر میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جو خط بنام مقوقس دریافت کیا تھا اور جس کو اصلی مان لیا گیا تھا وہ ترکی حکومت کے ہاتھ ایک بڑی رقم پر بیچ دیا گیا۔

''اب گزشتہ موسم خزاں میں میری ملاقات ایک اطالوی شخص سے ہوئی جس کے پاس (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک اور مکتوب تھا اور وہ مدعی تھا کہ وہ اصلی ہے اور یہ کہ اس نے یہ مکتوب نیز کوفی خط میں لکھے ہوئے قرآن کے چند سورے (یعنی سورہ نمبر ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۱۱، ۱۱۳) گزشتہ موسم گرما میں دمشق میں (جہاں وہ مسلمانوں کے بھیس میں اور اپنے آپ کو مسلمان بتاتے ہوئے گیا تھا) خریدے۔

''اس نے مجھے یہ مزعومہ اصلی خط دکھایا۔ یہ خط نیز قرآن کے مذکورہ سورے ایک نہایت مہین اور سیاہی مائل بھوری (Dunkelbraun) جھلی کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے تھے۔ اس کے ہمراہی ملفوفہ فوٹو (جو ایک ٹریس کی ہوئی نقل سے لی گئی ہے) اصل سے صرف اسی حد تک مختلف ہے کہ اس میں مہر کا قابل غور نشان زیادہ واضح آیا ہے دیر تک مشاہدے کے بعد میں نے یہ یقین کیا کہ اصل کی مہر میں بہر حال یہی الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جب آدمی کو معلوم ہو جائے کہ کیا پڑھنا چاہیئے تو اس کی آنکھوں کا دھوکا دینا آسان ہے۔

''اس خط کو ترکی حکومت کے ہاں ایک مناسب قیمت پر بیچنے کی کوشش سنا ہے کہ ناکام رہی اگرچہ مذہبی طبقے نے اس میں بڑی دلچسپی لی تھی۔'' اس خط پر رسالے کے اڈیٹر فلائشر (H.L.Fleischer) نے بطور فٹ نوٹ جو تنقید[1] کی اور اپنی رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔

''چونکہ اس معاملے میں خود مغرب میں بھی معلوم ہوتا ہے خاص سنسنی پھیل گئی ہے اور اب تک ہر جگہ یقین کے ساتھ اس کا جعلی ہونا تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا فوٹو کا

۱۔ نولدکے شوالی نے اپنی Geschichte des Qorans ص ۱۹۰ ن ۳ میں اس تنقید کو پاش پاش کرنے والی تنقید (vernichtende kritik) کہہ کر سراہا ہے۔ فلائشر کا یہی مضمون اس کی تالیف Kleine Schriften (جلد ۳ ص ۴۰۰ الخ) میں جو مجموعہ مقالات ہے، نقل کر دیا گیا ہے وہ کوئی نئی یا زائد چیز نہیں۔

ایک نقل چھپ کر (لیتھوگرافی) شائع کر دیں۔ جس کو دیکھ لینے کے بعد کسی کو اس مزعومہ دریافت کے غیر اصلی ہونے کے متعلق مزید دلائل کی خواہش نہیں رہے گی۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ یہاں اس چیز کو دہراؤں جو میں نے اس فوٹو کے متعلق اپنے عزیز دوست پروفیسر بروک ہاؤس (Brockhaus) کو لکھا:''

(میں ذریعہ ہذا آپ کو وہ قیمتی دستاویز واپس کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ وہ اطالوی جس نے اس کو بنایا یا لے اڑا ہے، واقعی ایک نہایت مسعود ستارے کے تحت پیدا شدہ سمجھا جائے، اگر وہ اس بات میں کامیاب ہو کر حقیقی قابل مسلمانوں کو (جیسا کہ ترکی کے موجودہ وزیر تعلیم کمال آفندی ہیں) اپنی ہمنوا بنا لے۔ اس اطالوی آدمی نے یہ دیکھنا چاہا ہے کہ وہ مرغی ابھی تک زندہ ہے جس نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مکتوب بنام مقوقس کے دریافت کرنے والے کے لیے اتنا عمدہ سونے کا انڈا دیا تھا۔ یہ خط بے لیس نے نہیں بلکہ بارتیلمی نے مصر میں دریافت کیا تھا اور مصر کے یونانی گورنر کے نام لکھا گیا تھا۔ دیکھئے ژورنال آزیاتیک بابتہ دسمبر ۱۸۵۴ء ص (۴۸۱ و مابعد) اسی لیے اس شخص نے اتفاقاً ایک دوسرے خط کو جو (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بحرین کے ایرانی گورنر المنذر بن ساویٰ کے نام تبلیغ اسلام کے لیے تحریر فرمایا تھا اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنانا چاہا ہے۔ اس خط کا ذکر ابن ہشام ص: ۹۴۵ س ۱۳۔۱۴ نیز Gaussin de Peroevdl, Essai Sur P Htoloire des Arabes Vol-3, P-256 lines 6-15 میں بھی ملے گا۔ مگر جہاں تک مجھے علم ہے اس خط کا متن کہیں بھی نہیں ملتا۔ اسی لیے اس نامعلوم (اطالوی) شخص نے اس خط کو پیدا کیا اور اسے خوف نہ تھا کہ کوئی آسانی سے اس کی تردید کرے گا۔ چنانچہ اس نے ہوشیاری سے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ چند افسوس ناک طور سے خراب اور ناقابل فہم اشکال حروف کے باوجود خط کے ابتدائی حروف (جو اسے سب سے زیادہ پسند آئے) حیرت انگیز طور سے اچھی حالت میں باقی رکھے جائیں خاص کر ''اللہ'' اور ''محمدؐ'' کے مقدس الفاظ پر زمانے نے بھی ادب کے خیال سے دست درازی کی جرأت نہ کی۔

''اُس کے خرید لینے کی خواہش کے دل میں پیدا ہونے کے لیے اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں۔ اور ایک ہوشیار آدمی بہت زیادہ کی جسارت بھی نہیں کر سکتا خط کی باقی عبارت ایسی ہے کہ اسے صرف وہی لوگ حل کر سکتے ہیں جو اپنی ذہانت کے ذریعے سے عدم محض سے بھی کچھ نہ کچھ پیدا کر لینا جانتے ہیں۔ البتہ اس خیال سے کہ اسلام بہر حال خالی نہ چلا جائے خط کی بے پایاں تحریری ابتری میں "للمسلمین ما اسلموا" کا فقرہ اچھی حالت میں آ کر تبدیلی پیدا کرتا ہے۔

مگر اتنی نفیس اور اچھی حالت میں محفوظ۔ ابتدا کے بعد (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کاتب کو ایک سے زائد مرتبہ عجیب بدقسمتی سے سابقہ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے ترکی یا ترکیائے ہوئے لفظ کے مطابق ''المنذر'' کے عوض ''المنزر'' لکھ دیا ہے اور ''غیرۃ'' کی جگہ ''ظہیر ۃ'' اس کے علاوہ (شائد کسی دیہاتی بولی کی بنا پر غلطی سی بجائے ''اشہد'' کے ''اشعد'' لکھ دیا ہے اور ایک درجہ اول کی عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ ''قاما'' کو ''فعما'' لکھا ہے۔

''میں سمجھتا ہوں کہ اتنا آپ کے لیے کافی ہوگا۔'' (فلائشر)

ناظرین نے دیکھ لیا کہ ''مہذب'' ممالک کی علمی تحریروں کا طرز بیان کیسا ہوتا ہے۔ اس کو نظر انداز کر کے اعتراضوں کی تحلیل کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس فاضل ایڈیٹر کی رائے میں یہ خط جعلی ہے کیونکہ:

(۱) المنذر بن ساوی کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خط بھیجنے کا ذکر تو ملتا ہے۔ لیکن خط کی عبارت کہیں نہیں ملتی۔

(۲) پیش نظر فوٹو میں مرسل و مرسل الیہ کا نام تو صاف ملتا ہے لیکن اس سے آگے جعلساز نے عربی نما شکلیں بنا دی ہیں۔ کہ کسی عرب کاتب کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتیں۔

(۳) اب بے معنی شکلوں میں کہیں کہیں عربی الفاظ پڑھے جاتے ہیں لیکن ان میں املاء کی ایسی غلطیاں ہیں کہ کسی عرب کاتب کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتیں۔

پہلا اعتراض محض لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ منذر کے نام ایک نہیں میرے حد علم تک نصف

درجن سے بھی زائد خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھے تھے۔ (دیکھیے میری فرانسیسی تالیف (Corpus) دستاویزات نمبر (۴۴ تا ۵۱) وجہ ظاہر ہے کہ منذر مسلمان ہو چکے تھے اور ایک اہم اسلامی صوبے کے راسخ العقیدہ، اطاعت شعار اور مخلص گورنر تھے۔ ان کے اسلام کے بعد کوئی چار سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے۔ ان خطوط میں جو مجھے مختلف قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی ورق گردانی پر منتشر حالت میں ملے، ایک وہ خط بھی ہے جس کی عبارت زیر بحث خط سے متفق ہے۔ یہ خط مجھے حسب ذیل کتابوں میں ملا ہے:

۱۔ اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین مؤلفہ ابن طولون۔ تیسرا خط

۲۔ صبح الاعشیٰ مؤلفہ القلقشندی جلد ششم صفحہ ۳۶۸ بحوالہ کلبی۔

۳۔ زاد المعاد مؤلفہ ابن القیم جلد سوم ص ۶۱ تا ۶۲۔

۴۔ المواہب اللدنیہ مؤلفہ القسطلانی جلد دوم صفحہ ۲۹۴۔

۵۔ رسالات نبویہ مؤلفہ عبد المنعم خاں خط نمبر (۱۰۱)

نیز بعض اور کتابوں میں بھی یہ خط کاملاً یا جزاً ملتا ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب دینا فضول ہے۔ جب خود سے نہ پڑھا گیا تو ناقابل فہم قرار دے دینا شان علمیت سے بعید تھا۔

تیسرے اعتراض کے متعلق بھی کسی کاوش کی ضرورت نہیں۔ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے لکھا ہوا خط ہے۔ اگر کہیں کہیں سے سیاہی اڑ گئی ہے یا اس کے دھبے پھیل گئے ہیں یا خود ٹریس کر کے نقل لینے والے کے قصور سے شکلیں بگڑ گئی ہیں تو اس میں عہد نبویؐ کے کاتب کا کیا قصور۔

عہد نبویؐ میں نقطے اور اعراب نہیں تھے۔ ان سے ہمارا یہ مکتوب بھی خالی ہے اور ''غیرۃ'' کی جگہ ''ظہیرۃ'' نظر آنا ''یار'' کا ''ذ'' ہو جانا بلا شبہ امتداد زمانہ کا اثر ہے کہ سیاہی پھیل گئی یا اڑ گئی یا کسی خارجی اثر سے شوشے کی شکل کا دھبہ آ گیا۔[1]

۱۔ غیرۃ کی جگہ ظہرہ ہونا تردید کی جگہ توثیق ہی کرتا ہے۔ قرآن مجید میں والسماء بنیناھا بائید دو شوشوں سے ہے۔ بعض قدیم کتبوں میں آمین کو امن لکھا گیا ہے۔ یہ سب اصل میں قدیم طرز کتابت ہے اور ہماری دستاویز کی قدامت ہی کی دلیل۔

''اشھد'' کی جگہ فلائشر کو ''اشعد'' نظر آنا محض ستم ظریفی ہے یا ناواقفیت۔ اس زمانہ میں ھ کو اس طرح لکھتے تھے جس طرح کہ علامت ''ز''۔

تعجب ہے کہ فلائشر جب اشھد میں ھ کو ع پڑھا تو فعھا کہ جگہ فعما پڑھا ہے حالانکہ اس لفظ میں یا تو دونوں ع ہوتے یا دونوں ''م'' یہ اصل میں ٹریس کنندہ کا ''سہو ہے'' کہ ''رسولہ'' کے ٹکرے ''لہ'' کو ''امابعد'' میں ناقص طور سے ملا کر فہما کر دیا ہے۔

میرے علم میں فلائشر کے علاوہ کسی اور نے اس خط پر کچھ نہیں لکھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ فلائشر کے مطابق اس مکتوب کو ۱۸۶۳ء میں دمشق سے ایک اطالوی نے اُڑایا تھا مگر ۱۹۱۷ء میں خواجہ کمال الدین نے دمشق میں یہ خط اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا (ملاحظہ ہو اسلامک ریویو (Woking) بابتہ ۱۹۱۷ء میں دمشق میں ۱۹۳۲ء میں میری ذاتی تحقیقات پر اتنا پتہ چلا تھا کہ اس طرح کا خط سلطان صلاح الدین کے رشتہ داروں کے ہاں موجود ہے گو عام طور سے اہل شہر اس سے ناواقف ہیں۔ میری پہلی کوشش اس کے دیکھ سکنے کی متعلق اس لیے ناکام رہی کہ جس وقت میں وہاں گیا مکان پر کوئی آدمی نہ تھا۔ اس کے بعد میرا قیام دمشق میں نہ رہ سکا اب میرے ایک سابق فرانسیسی ہم جماعت موسیو رائش نے اس کا پتہ لگایا ہے اور دمشق سے ایک ابتدائی اطلاع بھی بھیجی ہے۔ لیکن تادم تحریر ان کے موعودہ مفصل خط کا انتظار ہے ممکن ہے کہ چور سے مالکوں نے خط بعد میں واپس کر لیا ہو، اس سلسلے میں ایک بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ مکتوب مقوقس اور مکتوب منذر دونوں کی مہر باوجود نقل کرنے والوں کے فرق کے یکساں ہے۔ جو کافی اہم شہادت ہے۔

آخر میں ایک بات یہ عرض کی جا سکتی ہے کہ کچھ دنوں پہلے عربی اخباروں کے حوالے سے ہندوستانی اخباروں نے یہ خبر شائع کی تھی کہ موجودہ نجاشی حبشہ کے پاس اب تک مکتوب نبوی بنام نجاشی اصحمہ محفوظ ہے۔ اس بارے میں مستند معلومات حاصل کرنے کے متعلق میری کوششیں اب تک ناکام رہیں۔

یہ چند سرسری باتیں ہیں جو عزیزم نائب مدیر صاحب مجلۂ عثمانیہ کی خواہش پر عجلت میں قلم بند کی گئیں۔

تتمہ

اوپر مضمون کی ابتدا میں نیز وسط میں دو جگہ نولدکے کا ذکر آیا ہے مضمون لکھتے وقت صرف اس کا جدید تر یعنی طبع دوم کا نسخہ پیش نظر تھا جو مؤلف کی وفات کے بعد شوالی نے من مانے حذف و اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مضمون چھپنے کے بعد طبع اول دیکھنے کا موقع ملا تو نظر آیا کہ غریب نولدکے نے تو مکتوب مقوقس کے اصلی ہونے کی صراحت سے رائے لکھی تھی۔ اس مضمون میں جتنی اعتراضی باتیں نولدکے کی طرف مکتوب نبویؐ کے سلسلے میں درج ہیں وہ سب اصل میں شوالی کے قلم سے نکلی ہیں۔ ختمیہ ۱۲

آنحضرت صلعم کا خط (قیصر روم کے نام)

آغاز اسلام کے وقت شام کا زرخیز علاقہ بیزنطینی سلطنت کے ماتحت تھا۔ اس کے جنوب میں جزیرہ نمائے عرب کی سرحد پر بہت سے بدوی قبائل بستے تھے، جو آزاد تو تھے لیکن بیزنطینی اثرات ان پر کارفرما تھے۔ انہیں قیصر روم کی جانب سے معقول معاش مقرر تھی۔ اس کے معاوضے میں وہ عاجز کا کام دیتے اور خانہ بدوش عربوں کو بیزنطینی علاقے پر چھاپہ مارنے سے روکتے تھے۔

عرب بہت قدیم زمانے سے شام کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے اور ہر سال گرمی کے موسم میں ان کے کاروان اور قافلے شام پہنچتے تھے۔

ایرانی اور بیزنطینی سلطنتوں میں نسل بانسل سے برابر جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اور آنحضرت صلعم کی بعثت کے وقت تو اس میں اور تیزی پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے متحاربین میں سے کسی کو بھی کیا فائدہ پہنچتا دونوں روز بروز کمزور ہی ہوتے چلے گئے۔ ہجرت نبوی سے کچھ پہلے ۶۱۳ تا ۶۱۷ء میں ایرانی فوجوں نے دمشق بیت المقدس اور اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ مگر ہجرت کے پانچویں سال ۶۲۷ء نینوی کے مقام پر ایرانیوں کو کچھ ایسی زبردست اور مکمل شکست ہوئی کہ لڑائی کا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ اور بیزنطینیوں نے نہ صرف اپنا کھویا ہوا سب علاقہ واپس لے لیا بلکہ حریف سے من مانی شرطیں بھی منوالیں۔

مسلمان مورخ بیان کرتے ہیں کہ ۶ ھ کے اواخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''بیزنطینیوں کے سردار'' (عظیم الروم) کے نام ایک نامہ بھیجا۔ اور سفیر کو حکم دیا کہ شہر بصری (علاقہ حوران) کے حاکم کے حوالے وہ خط کر دے۔ گورنر بصریٰ نے اس کا انتظام خود کیا کہ وہ

خط قیصر ہرقل کے پاس جو اُن دنوں ایشیائے کوچک میں مقیم تھا بھیج دے۔

اگرچہ گولٹ سی ہر جیسے مولفوں کو اس واقعے کی صداقت کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں لیکن ہم یہاں ان اعتراضات کی چھان بین کریں گے جو مختلف یورپی فضلاء کی طرف سے اُٹھائے گئے ہیں۔

چنانچہ سویڈن کے مشہور مولف بول[1] نے آنحضرت صلعم کی سیرت لکھتے ہوئے ان خطوط کا بھی ذکر کیا ہے جو ہمسایہ فرماں رواؤں کے نام تبلیغ اسلام کی غرض سے بھیجے گئے تھے مگر اسے اس واقعے کی صحت میں شبہ ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ مسلمان مورخوں کی روایت کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ سفیر معجزانہ طور سے ان ممالک کی زبانیں بولنے لگ گئے جہاں انہیں بھیجا گیا تھا۔ یہ قصہ اصل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں دنیا کے مختلف حصوں میں جانے کے لیے نامزد کیا گیا اور ان کے عذر پر کہ انہیں ان ملکوں کی زبانیں نہیں آتیں حضرت عیسیٰ نے دعا کی اور ہر حواری خود بخود اس ملک کی زبان بولنے لگ گیا جہاں اسے بھیجا جا رہا تھا۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ ممالک میں سفیروں کے بھیجنے اور ان سفیروں کی نئی زبانوں کے خود بخود دیکھ جانے کے قصے کو محض اس لیے گھڑ لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم نظر نہیں آئیں۔

لیکن بول کو غلط فہمی ہوئی ہے اگرچہ اس سلسلے میں اُس نے اپنے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ لیکن کوئی تعجب نہیں جو خدا بخشے واقدی کی کسی افسانہ نگاری سے اسے سابقہ پڑا ہو، چنانچہ ابن سعد نے بھی طبقات (جلد اول، حصہ دوم صفحہ ۱۹) میں واقدی کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں واقعے کے بعض اہم جزئیات کو نظر انداز کر دینے سے مطلب خبط ہو گیا۔ یہ واقعہ پوری تفصیلوں کے ساتھ ہمیں ابن ہشام کی سیرۃ رسول اللہ (صفحہ ۹۷۱) میں اور طبری کی تاریخ (سلسلہ اول صفحہ، ۱۵۶) میں ملتا ہے[2]۔ وہاں تو کچھ اور ہی ذکر ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ صلح

۱۔ مثلاً تاریخ طبری صفحہ (۱۵۵۹)

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مکتوب کا متن حسب ذیل کتابوں میں ملتا ہے۔

حاشیہ کا بقیہ اگلے صفحے پر

حدیبیہ کے بعد ایک دن آنحضرتؐ نے یہ طے فرمایا کہ متعدد ہمسایہ فرماں رواؤں کے پاس تبلیغ اسلام کے لیے سفارتیں بھیجی جائیں۔ سفیروں کو نامزد کرنے سے پہلے آپ نے احتیاطاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے اور فرستادہ حواریوں کا قصہ بیان فرمایا اور ارشاد کیا کہ اگر میں بھی کچھ سفیر بھیجنا چاہوں تو تم لوگوں کو ان حواریوں کی طرح ہچکچاہٹ اور پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اعلان فرمایا کہ فلاں شخص فلاں حکمران کے پاس خط لے جائے اور فلاں شخص فلاں کے پاس۔

اس روایت میں نہ تو کوئی فارق العادۃ واقعہ ہے اور نہ کوئی خلاف عقل یا غیر قرین قیاس امر حواریوں کا قصہ بیان کئے جانے کی ضرورت بھی واضح ہے کہ کسی صحابی کو ذرا بھی تردد نہ پیدا ہو۔

اس واقعے سے شائد ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمسایہ ممالک میں تبلیغ کرنے کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ وہ کون شارع مذہب ہوگا جو حضرت عیسیٰ کی بیان کردہ فرستادگی حوارین کی اقتدا کا خیال نہ کرے فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ[1] تو خود قرآنی حکم ہے۔

اب کچھ کائتانی کے اعتراضات بھی سنئے۔[2]

۱۔ مسلمان مورخ سفرا کے بھیجے کا واقعہ ٦ ھ کے اواخر کا قرار دیتے ہیں اور پھر یہی مورخین (کائتانی نے واقدی، ابن ہشام، یعقوبی، طبری جیسے متقدمین کے نام اس

حاشیہ کا بقیہ پچھلے صفحہ کا

صحیح بخاری کتاب نمبر ا باب نمبر ٦۔ ٧، کتاب نمبر ٥٦ باب نمبر ٢۔ ا، کتاب نمبر ٦٥ باب نمبر ٣، حدیث نمبر ٤۔ تاریخ طبری صفحہ ١٥٦٥، مسند احمد بن حنبل جلد نمبر (١) صفحہ ٢٦٣، جلد نمبر ٣ صفحہ ٣٣١۔ تاریخ یعقوبی جلد دوم صفحہ ٨٣، صبح (الاعشیٰ مولفہ قلقشندی) جلد نمبر ٧، صفحہ نمبر ٣٧٦ تا ٣٧٧، مفید العلوم ومبید الہموم مؤلفہ قزوینی باب ہشتم نمبر ا۔ زاد المعاد مؤلفہ ابن القیم جلد نمبر ٣ صفحہ ٦٠، رسالت نبویہ مؤلفہ عبد المعظم خاں۔ مکتوب نمبر ١١٦ وغیرہ وغیرہ۔

۱۔ صحیح بخاری کتاب نمبر ا باب نمبر ٣ نیز کتاب نمبر ٥٦ باب نمبر ١٠٣۔

۲۔ Goldziher Die Religion des Islams (Kultur der Gegenwart 1906 p.245)

تذکرے کے آخر میں بطور ماخذ واقعہ گناتے ہیں) کہتے ہیں کہ حضرت دحیہؓ کے مال و متاع پر قیصر کی سفارت سے واپسی پر جو ڈاکہ پڑا وہ ٦ ھ کے وسط میں پیش آیا ٦ ھ کے اواخر میں روانگی اور اس سال کے وسط میں واپسی بدیہی طور پر ناممکن ہے۔

۲۔ حضرت دحیہؓ کا قیصر کے پاس جانا بیان کیا جاتا ہے اور وہ خیبر کی مہم میں بھی شریک رہتے ہیں۔ یہ مہم سفارت کی روانگی کے بعد ہی پیش آئی اور یہ غیر قرین قیاس ہے کہ حضرت دحیہ سفارت کو سرانجام دے کر اس قدر جلد واپس ہو گئے ہوں۔

۳۔ مسلمان مورخ بیان کرتے ہیں کہ اسلامی سفیر نے قیصر سے بیت المقدس میں ملاقات کی جب کہ وہ (قیصر) صلیب مقدس کے ایرانیوں سے واپس مل جانے کی خوشی میں وہاں آیا ہوا تھا۔ قیصر کی آمد ٦٢٩ء کی ابتداء یعنی ٧ ھ کے اواخر میں ہوئی نہ کہ ٧ ھ کے اوائل میں جیسا کہ مسلمان مورخین کے بیان سے مترشح ہوتا ہے۔

۴۔ سیرت ابن ہشام حقیقت میں سیرت اسحاق کی تہذیب یافتہ صورت ہے۔ مگر ان سفارتوں کی روانگی کا واقعہ ابن اسحاق کی اصل کتاب میں نہیں ہے کیونکہ روایت کی ابتدا میں ابن ہشام نے ابن اسحاق کا نام نہیں لیا ہے۔ (یعنی یہ واقعہ ابن ہشام نے خود گھڑ لیا ہے)

۵۔ سفیروں کی روانگی اگرچہ اتنا اہم واقعہ ہے لیکن عربی تاریخوں اور حدیث کی کتابوں میں جملہ (رایتیں صرف ایک ابن عباس ہی سے منقول ہیں دیگر صحابہ کے بیانات بالکل مفقود ہیں۔ لیکن:۔

کائتانی کا پہلا اعتراض

کچھ ٹھیک نہیں سیرۃ ابن ہشام (صفحہ ٩٧٦) اور تاریخ یعقوبی (جلد دوم صفحہ ٤٧) میں جہاں حضرت دحیہؓ کا مال لٹنے وغیرہ کی مہم کا ذکر ہے، بلا تعین تاریخ واقعہ بیان کیا گیا ہے جیسے اور بہت سے واقعات کا ان میں تذکرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ طبری میں (صفحہ ١٥٥٥ پر) بے شبہ ٦ ھ کے وسط کا ذکر ہے مگر یہ واقدی کی روایت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ طبری نے خود اس کو قبول نہیں کیا ہے کیونکہ تھوڑی دور آگے چل کر طبری نے

(صفحہ ۱۴۱۷ پر) اپنی تاریخ میں مکرر اس مہم کا اس موقع پر ذکر کیا ہے اگرچہ اس جگہ طبری نے تاریخ نہیں بیان کی ہے۔ لیکن واقعات اپنی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ طبری کا واقدی کی روایتوں کے متعلق جو رجحان ہے وہ معروف ہے ان روایتوں کے ساتھ اکثر ''زعم الواقدی'' کا ایک حد تک طنزیہ فقرہ ضرور ہوتا ہے۔ اب رہی یہ ایک واقدی کی روایت سو واقدی کی حیثیت ایک تاریخی افسانہ نگار سے بڑھ کر نہیں اس بیان کو بے پس و پیش رد کر دیا جا سکتا[1] ہے۔ واقدی کی توقیتی غلطی کو مصری مورخ زینی دحلان نے محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ سیرت نبویؐ لکھتے ہوئے اس واقعے کے تذکرے میں واقدی کی روایت کو اس بنا پر رد کر دیا ہے کہ سفیروں کی روانگی سے پہلے واپسی ناممکن ہے۔[2]

عرب مورخ[3] یہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ حضرت دحیہؓ جب قیصر روم کو مکتوب نبویؐ پہنچا کر شام سے واپس آ رہے تھے تو ان پر چند بدوی قبائل نے ڈاکہ ڈالا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مورخین کو ایک غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیونکہ حضرت دحیہؓ ۶ھ کے اواخر میں شام کو روانہ ہوئے اور جب وہ قبیلہ جذام کے علاقے میں تھے تو اس قبیلے کے چند رہزنی پیشہ افراد نے ان پر حملہ کیا۔ اس قبیلے میں چند خاندان مسلمان ہو چکے تھے۔ جب انہیں اطلاع ملی تو فوراً دوڑے اور حضرت دحیہؓ کا مال جو وہ تجارت کے لیے لے جا رہے تھے (نہ کہ وہ جو قیصر نے بطور انعام و اکرام دیا تھا، جیسا کہ کاکتانی نے واقدی کے افسانے سے اخذ کر کے لکھا ہے) ڈاکوؤں کے ہاتھ سے چھڑایا۔ حضرت دحیہؓ غضب ناک ہو کر مدینہ منورہ واپس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ اس کو بعض افراد عوام نے یہ سمجھ لیا کہ وہ سفارت پوری کر کے واپس آ گئے اور ان ہی کی روایت مسلمان مورخین کے پاس جگہ پا گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ایک تنبیہی مہم روانہ فرمائی اور چند دن بعد خود بھی خیبر کی جنگ پر روانہ ہو گئے۔ جہاں حضرت دحیہؓ ساتھ رہے۔ اور خیبر کی فتح کے بعد وہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ شام کو روانہ ہو گئے تا کہ قیصر کو نامۂ مبارک پہنچائیں۔[4]

۱۔ Buhl Das Leben Mohammeds p.245

۲۔ نیز دیکھئے تاریخ مصر مؤلفہ ابن عبدالحکم (طبع لائڈن) صفحہ ۴۵

۳۔ قرآن مجید سورہ ۱۹ آیت ۷۔

۴۔ Caetani, Anna dell Islam anno 6.p.50

یہ یاد رہے کہ اس واقعے کے جزئیات سب حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ماخوذ ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی عمر اس واقعے کے وقت دس سال سے زیادہ نہ تھی انہیں یہ حالات بعد میں بعض کوتاہیوں یا غلطیوں کا امکان ضرور رہتا ہے گو اس کے ذمہ دار وہ خود نہیں۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ فرستادگی سفارت کا واقعہ حضرت ابن عباسؓ کے زمانے میں بھی ملک میں مشہور تھا گو ایک سرکاری اور حکومتی معاملہ ہونے کے باعث اس کے تمام جزئیات سے عوام کو واقفیت نہیں ہو سکتی تھی۔ خاص کر سفیر کا مال لٹ کر حکومت اسلامیہ کی توہین ہونے کے۔

حضرت دحیہؓ پر ڈاکے کے سلسلے میں جو مہم بھیجی گئی تھی وہ حسمیٰ نامی تاریخ[1] مقام پر پہنچی حسمیٰ کا مقام وادی القریٰ کے پرے مدینے سے آٹھ دن کے[2] فاصلے پر واقع ہے۔ یلغار کر کے آئیں تو بعض وقت اونٹ یہاں سے مدینے کو تین ہی دن[3] میں پہنچ گئے ہیں۔ بعض حالیہ یورپی سیاح[4] بھی تبوک کے اطراف میں اس نام کے ایک پہاڑ کا ذکر کرتے ہیں تو بعض اسلامی حجاج اس نام کے ایک علاقے اور قبائلی دیار کا۔ معاملے کا بدیہی اسباب کے بنا پر زیادہ چرچا خود رسول کریمؐ نے پسند نہ فرمایا۔ خیبر کی مہم بھی درپیش تھی۔ لوگوں کی توجہ اور یکسوئی کو بٹانا کسی طرح قرین مصلحت نہ تھا۔ غرض یہ مقام مدینے سے اتنا قریب ہے کہ حضرت دحیہؓ کی سفارت پر روانگی و واپسی اور تنبیہی مہم سب اس مدت کے اندر وقوع میں آ سکتے ہیں جو

۱۔ اصل میں واقدی نے واقعات کے وقت کے ذکر میں سہواً اس بات کا لحاظ نہیں کیا ہے کہ حجاز میں سنہ کبیسہ رائج تھا اور ہر تین سال میں ایک مہینہ بڑھایا جاتا تھا۔ پھر بعض وقت سنہ ہجری سے وقت مقرر کیا ہے اور بعض وقت تاریخ ہجرت سے (دیکھئے کاکتانی کی تاریخ اٹالی ۱ حف ۱۳ نوٹ نمبر ۱) سب جانتے ہیں کہ ہجرت نبوی اور سنہ ہجری میں دو ماہ کا فرق ہے اور ۶ھ میں حجاز کے مروجہ سنہ اور ہجری سنہ میں دو ماہ کا فرق ہو جاتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقدی نے حضرت دحیہؓ کی مہم کا وقت بیان کرتے وقت مروجہ عربی سنہ کی جگہ سنہ ہجری بیان کر دیا اور کبیسہ مہینوں کے بڑھانے کا خیال نہ رکھا تو پھر اس پانچ چھ ماہ کے فرق کا اصلی باعث معلوم ہو جاتا ہے۔

۲۔ السیرۃ الحمدیہ مؤلفہ زینی دحلان جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۳۷۔

۳۔ السیرۃ الحمدیہ مؤلفہ زینی دحلان جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۳۷۔

۴۔ مثلاً سیرۃ ابن ہشام (طبع یورپ) صفحہ ۹۷۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح حدیبیہ سے واپسی اور خیبر کی روانگی کے مابین پائی جاتی ہے۔ ابن ہشام[1] کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے ذی قعدہ ۶ھ کے آخر دنوں میں مدینہ واپس آئے اور محرم ۷ھ میں خیبر روانہ ہوئے ابن سعد[2] کے مطابق خیبر کو روانگی اور چند ماہ بعد عمل میں آئی۔ غرض حدیبیہ اور خیبر کو روانگی کے مابین کم از کم پانچ ہفتوں کا وقفہ پایا جاتا ہے اور یہ مدت حضرت دحیہؓ کی روانگی اور حسمی کی تنبیہی مہم کے پیش آنے کے لیے کافی ہے۔

کائتانی کا دوسرا اعتراض

بھی مذکورہ بالا توضیح کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ کائتانی کو حضرت دحیہؓ کی جنگ خیبر میں شرکت صرف واقدی میں ملی ہے۔ مگر یہ واقعہ ابن ہشام، طبری اور بخاری[3] نے بھی بیان کیا ہے۔ تاہم جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں حضرت دحیہؓ کا مہم خیبر میں شریک رہنا ناممکن نہیں اور نہ ہی وہ اس بات کے لیے کوئی ثبوت بن سکتی ہے کہ سفارت شام کا واقعہ من گھڑت ہے۔

کائتانی کا تیسرا اعتراض

بھی برقرار نہیں رہ سکتا کیونکہ سفیر مذکور کا ۷ھ کے اواخر میں بیت المقدس میں رہنا کسی طرح بھی غیر قرین قیاس نہیں علاوہ برآں یہ امر قابل ذکر ہے کہ واقعات زیر بحث کے اسلامی ماخذوں میں امام بخاری کی شخصیت سب سے ممتاز ہے اور انہیں بہر حال واقدی پر ترجیح دینی ہوگی۔ خاص کر اس لیے کہ دونوں نے واقعات کو حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ امام بخاری کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفیر کو حکم دیا تھا کہ خط گورنر بصریٰ کے حوالے کرے اور اس خط کو گورنر بصریٰ نے قیصر کے پاس حمص

۱۔ ایضاً ؍ ؍ ؍

۲۔ الف: مغازی واقدی مخطوطہ برٹش میوزیم ورق (۱۲۸) میں حضرت زید بن حارثہ کی تنبیہی مہم کے ذکر میں بیان ہوا ہے کہ ورد معہ دحیہ ——— (۱۴ ب ابن حبیب نے کتاب المجر صفحہ ۲۶۲ میں لکھا ہے فی الماء بعد ما غاض (بن طوفان نوح) فی امراض جذام وحی حسمی اربعین سنہ۔

۳۔ معجم البلدان مؤلفہ یاقوت لفظ "حسمی"

خود بھیجا۔ قیصر بیت المقدس جا رہا تھا تا کہ وہاں صلیب مقدس کی واپسی کے شکرانے کی تقریب میں حصہ لے۔ چنانچہ گورنر بصریٰ کا خط ملنے پر قیصر نے (جسے اسلام اور بانی اسلام کے متعلق کوئی معلومات نہ تھے) حکم دیا کہ رومی علاقے میں اگر حجازی تاجر آئے ہوئے ہوں تو انہیں حاضر کیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان تاجروں کو بیت المقدس میں باریابی کا موقع حاصل ہوا۔ (بخاری)

رہا قیصر کا سفر سو ۶۲۹ء کی روایت یونانی مورخ تیوفان[1] نے بیان کی ہے مگر مورخ نقیفور (Nrcephore) لکھتا ہے کہ قیصر ہرقل ۶۲۸ء میں بیت المقدس میں آیا۔ وہاں کے گرجے کی یادداشت بھی اس کی تائید میں ہے اور اسی سے یہاں تک تعیین ہوتی ہے کہ ۶۲۸ء میں وسط ستمبر میں ہرقل نے عید واپسی صلیب میں شرکت کی۔

کائتانی کا چوتھا اعتراض

بھی درست نہیں کیونکہ گو ابن ہشام[2] نے سفیروں کے واقعے کو بیان کرتے وقت شروع میں ابن اسحاق کا نام نہیں لیا ہے۔ لیکن اس روایت کے سلسلے میں ذرا نیچے اس نے دو مرتبہ ابن اسحاق کا حوالہ دیا ہے ابن ہشام نے یہ بھی لکھا ہے کہ یمن اور بحرین کی سفارتوں کا حال اس کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ جن کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہیں کہ باقی دیگر سفارتیں خود ابن اسحاق کی بیان کردہ ہیں۔ مزید براں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ ابن اسحاق نے قیصر و نجاشی کے پاس بھیجے ہوئے سفیروں اور خطوں کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے، کیونکہ اگرچہ ابن ہشام نے اپنی کتاب میں ان خطوط کے متن حذف کر دیے ہیں لیکن

۱۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۹۷۸۔

۲۔ Jausseuet Savignac, Mission archeologique en Arabie (Paris 1909) Vol 1. p 67

ابراہیم رفعت بادشاہ نے اپنی تالیف مرآۃ الحرمین (جلد اول ص ۳۰۶) میں لکھا ہے۔ واھم ثغورہ الواقعۃ علی البحر الاحمر الوجہ والحوراء وینبع ورابغ وجدۃ وکلھا محطات الحجاج المصریین وینزلہ من القبائل الغربیۃ الان عرب الحویطات فی الاقلیمہ الشمالی السمی حسمی۔

طبری[1] اور بیہقی[2] اور قلقشندی[3] نے ان خطوط کے متن ابن اسحاق کے حوالے ہی سے درج کئے ہیں۔

کائتانی کا پانچواں اور آخری اعتراض

یہ تھا کہ سفارت کا اہم واقعہ صرف حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا ہے اگرچہ اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا مگر یہ اعتراض بھی کائتانی کی تحقیقات کا سطحی ہونا ثابت کرتا ہے کیونکہ علاوہ دیگر مؤلفین[4] کے بلاذری[5] اور احمد بن حنبل[6] نے قیصر کی سفارت حضرت انسؓ کی روایت کی بنا پر بھی بیان کی ہے۔ کنز العمال (جلد پنجم نمبر ۵۶۸۵) میں یہ حضرت خالد بن سعید بن العاص سے بھی مروی ہے۔ طبرانی میں تو خود حضرت دحیہ کلبی کی روایت محفوظ ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ جو ہمارے بڑے ماخذ معلومات ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابہ میں سے ہیں۔ ایک آپ کے چچا زاد بھائی ہیں تو دوسرے شخصی خادم، ان دونوں نے شام ومصر کے فتوحات اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کے متعلق اس بات کا کس طرح گمان ہوسکتا ہے کہ ان میں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کا جذبہ پایا جاتا ہو جس کے تحت انہوں نے اپنے بانی مذہب کی بڑائی دکھانے کے لیے قیصر روم سے خط وکتابت کا واقعہ گھڑ لیا ہو۔ ان دونوں بڑی عمر اپنے والے صحابیوں کی نوجوانی ہی میں قیصر ہرقل کی فوجوں کو مسلمان متعدد فاش شکستیں دے چکے تھے اور اس کی سلطنت کے چند نہایت زرخیز صوبے چھین چکے تھے۔ رہے خالد بن سعید، سو وہ فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کے بھتیجے ہیں۔ ان لوگوں میں تو اپنے آپ کو برتر سمجھنے کا ہی جذبہ ہونا چاہیے۔

۱۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۹۷۵ تا ۹۷۶ نیز تاریخ طبری ۹ھ کے واقعات کا آخری حصہ۔

۲۔ طبقات ابن سعد جلد دوم حصہ اول صفحہ ۷۷

۳۔ صحیح بخاری کتاب نمبر ۶۴ باب نمبر ۳۸، حدیث نمبر ۶، نیز کتاب نمبر ۳۴ باب نمبر ۱۰۸، حدیث نمبر ۲۔

۴۔ Sprenger, Dasleben und die Lehre des Mohummed III, 261, nl.

۵۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۹۷۱ تا ۹۷۳

۶۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۵۶۵، ۱۵۶۹ تا ۱۵۷۔

یہ تو جواب تھے اعتراضوں کے انہوں نے عدم امکان کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے ان کے علاوہ بعض اور وجوہ ہیں جو ہمیں ارسال سفیر کے واقعے کی صحت کا یقین دلاتے ہیں۔

اولاً یہ واقعہ ہے کہ ہمعصر بیزنطینی تاریخیں موجود نہیں ہیں۔ بیزنطینی حکومت کے دربار میں بھی سرکاری وقائع نگار ہوا کرتے تھے مگر ایک زمانے میں ایک صدی تک ان میں فصل پڑ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کا تذکرہ نہ کیا[1] ہو تو کوئی حیرت نہیں کیونکہ وہ عیسائی تھے اور ان کے بادشاہ کو اگر کسی کے مذہب کے بانی نے تبلیغ کی ہو تو ان کی نظروں میں اس خط کو کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔ مسلمانوں سے بعد میں ان کی لڑائیاں رہیں اس لیے بیزنطینی مورخ جنگ مؤتہ کا ضرور[2] ذکر کرتے ہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانہ کردہ فوجوں کو بیزنطینی فوجوں نے شکست دی تھی۔

دوسرے یہ کہ جملہ مسلمان مورخ جن میں امام بخاری جیسی محتاط شخصیت شامل ہے اس سفارت کا ذکر کرتے ہیں۔

تیسرے خود نفس معاملہ میں کوئی امر غیر قرین عقل نہیں۔ ایک بانی مذہب اپنی کامیابیوں سے حوصلہ وہمت پا کر اپنے ایک ہمسایہ حکمران کو تبلیغ دین کرنے کی خواہش کرتا ہے اور اس حکمران کے ایک صوبہ دار کے توسط سے جس سے اس کے ہم وطن تجارت کے سلسلے میں اچھی طرح واقف تھے اس حکمران کے نام ایک خط روانہ کرتا ہے کیونکہ حکمران مذکور کا قیام اکثر سمندر پار قسطنطنیہ میں رہتا ہے اور اس کے عرب سے قریب بیت المقدس آمد آمد کی شہرت تھی۔ اس سے تخاطب کا اس سے بہتر موقع نہیں ہوسکتا تھا۔ آداب کے سلسلے میں اس کی کہاں توقع کی جا سکتی ہے کہ نبی حجازی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرسلہ خطوط میں ان ظاہری اور رسمی امور کی پابندی ہو جو سلاطین عظام اپنی خط وکتابت میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ قیصر ہرقل کا نام عرب میں ہر شخص جانتا تھا کہ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے اکتیس (۳۱) سال (۶۱۰ء تا ۶۴۱ء) حکومت کی اور عربوں کی گرمائی تجارت گاہ شام وفلسطین ومصر کو ایرانیوں کے ہاتھوں سے دوبارہ چھین لیا تھا۔ یہ بات نہ

۱۔ منقول از رسالات نبویہ مؤلفہ عبدالمنعم خاں نمبر ۱۰۹۔

۲۔ صبح الاعشیٰ جلد ۶ صفحہ ۳۷۹، ۳۶۶۔

بھلائی جائے کہ خط گورنر بصریٰ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ سفیر کے ذمے یہ فریضہ بالکل نہ تھا کہ وہ قیصر سے بھی ملاقات کرے۔

چوتھے خود اصل خط کی موجودگی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے چھٹی صدی ہجری کے مراکشی مورخ سہیلی (۲) نے چشم دید گواہوں کی شہادت پر یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کے زمانہ میں اسپین (قسطیلہ) کے حکمراں الفونسو (۳) نے جس کے قبضے میں آنحضرت صلعم کا خط بنام ہرقل موجود تھا ایک مسلمان سپہ سالار عبدالملک بن سعید کو دکھایا نیز یہ کہ الفونسو کی وفات کے بعد یہ نامہ اس کے نواسے کو وراثت میں ملا۔ اس سے ایک صدی بعد علامہ عینی کا زمانہ آتا ہے۔ وہ مصر کے مملوک سلاطین کے دربار میں بڑا رسوخ رکھتے تھے اور اعلیٰ سرکاری خدمت پر مامور تھے وہ بھی لکھتے ہیں کہ مملوک سلطان قلاوون نے اسپین کے عیسائی بادشاہ کے پاس ایک سفارت بھیجی تھی اور اس بادشاہ نے سلطان کے سفیر سیف الدین قلیج کو نامہ مذکور بتایا تھا یہ سفارت ۶۸۲ء میں بھیجی گئی تھی۔ ابن فضل اللہ العمر (فوت ۷۴۸ء) مصر کے میر منشی کا زمانہ اس کے بعد آتا ہے۔ اس نے بھی اپنی کتاب میں سلاطین عالم کے القاب کے سلسلے میں شاہ اسپین کا ذکر کیا ہے۔ (۳) اور بتایا ہے کہ شاہ اسپین کے سفیر نے اس سے گفتگو کی اور کہا کہ شاہ اسپین قیصر ہرقل کی اولاد (۴) میں سے ہے اور یہ کہ نامہ نبوی بنام ہرقل اس وقت تک شاہ اسپین کے پاس محفوظ وموجود ہے۔

۱۔ ابن حبان (منقول از السیرۃ الحمدیہ مؤلفہ زینی دحلان جلد دوم صفحہ ۳۳۵)

۲۔ فتوح البلدان مؤلفہ بلاذری (طبع یورپ) صفحہ ۳۶۱۔

۳۔ مسند احمد ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۳۔

۴۔ زوناراس (Zonaras) بارھویں صدی عیسوی کا مشہور یونانی مورخ ہے۔ وہ قسطنطنیہ میں حکومت کا میر منشی تھا۔ پھر سیاسیات سے کنارہ کشی کر کے راہبانہ زندگی اختیار کر لی۔ اور اس سلسلے میں ایک تاریخ عالم لکھی اس نے بعض اہم اور ایسی کتابوں کے اقتباسات اپنی تاریخ میں دیے ہیں جو آج مفقود ہیں۔ اس ایک مؤلف نے البتہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم قیصر سے ملنے کے لیے خود تشریف لائے تھے اور یہ کہ قیصر نے آپ کو کچھ زمین جاگیر میں دی زوناراس کے متعلق دیگر معلومات کرومباخر کی کتاب تاریخ ادبیات یونان میں Krumbacher Geschichte der byzantinischen Literatur. p.340-99 ملیں گے۔ زوناراس کی کتاب کا یونانی متن مع لاطینی ترجمے کے شہر بون واقع جرمنی میں ۱۸۹۷ء میں چھپا ہے۔

بقیہ اگلے صفحہ پر

مراکش کے مشہور امیر و عالم شیخ عبدالحی کتانی نے حال میں ایک دلچسپ (۱) کتاب شائع کی ہے جس میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ سیاسی اور سماجی اداروں اور پیشوں کے متعلق کتب حدیث و تاریخ وغیرہ کا مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی جلد اول صفحہ (۱۵۶ تا ۱۶۸) میں خاص اس خط کے متعلق ایک باب باندھا ہے انہوں نے خفاجی (فوت ۱۰۶۹ء) کی کتاب شرح شفاء جلد سوم صفحہ (۱۲۴) طبع اول پر یہ عبارت ڈھونڈ نکالی ہے۔

''کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اب تک اسپین کے بادشاہوں کے پاس موجود ہے۔ وہ اس کی عزت کرتے ہیں اور ایک سنہری صندوق میں حفاظت سے رکھتے ہیں اور نسلاً بعد نسل اُس کی نگہداشت کی وصیت کرتے آتے ہیں۔ (۲)

اسی طرح شیخ کتانی (۳) کی تحقیقات سے مراکش کے ایک مشہور مؤلف شیخ ابوراس بن احمد بن ناصر الراشدی العسکری (فوت ۱۲۳۸) کی کتاب الجزالمعرب عن الامرالمغرب الحال بالاندلس وثغور المغرب میں بھی اس خط کے وجود کا ذکر پایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کتانی

بقیہ پچھلے حاشیہ کا

اس کتاب کے متعدد یورپی زبانوں میں ترجمے ہوئے مگر میرے پیش نظر صرف لاطینی ترجمہ تھا۔ جس کا ضروری اقتباس دیا جاتا ہے۔

------In eodem regis triumphali ex persia sditu regem convenit Maometus, Saracenotum princeps----is igitur ex Aethribo progressus regem conveit et regionem. ad habitandum petitam acceppit"(Jaones Zonaras Eptlomae Historiarum Epit XIV 17, 12-27, p.214.

Ecclesiastique (paris 1914ff) vol III s.v,Arabie, col 128.

۱۔ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ محمد با خولہ

Theophane Chroreografhie ed. De Boor, Vol I p. 335.

۲۔ روض الانف مؤلفہ سہیلی جلد دوم صفحہ ۳۳۱۔

۳۔ اس نام کو عرب مؤلفوں نے معرب کر کے اذفونش بنالیا ہے۔

کو اس خط سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ [1] جب وہ ۱۳۳۱ھ میں اپنی مراکش کے پایہ تخت تطوان گئے تو وہاں کے اسپینی ریذیڈنٹ جنرل (مقیم عام) سے اس بارے میں گفتگو کی مگر جب سے مسلمان اسپین سے جا چکے ہیں اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ مقیم عام مذکور تو بھی اس بارے میں کوئی علم یا اطلاع نہیں تھی۔ مراکش کے سلطان مولائی اسمٰعیل بن الشریف نے بھی اپنے ہمعصر شاہ فرانس سے اس بارے میں خط و کتابت کی تھی۔ کیونکہ سنا جاتا تھا کہ وہ خط اب فرانس میں ہے مگر ۱۳۳۲ھ میں جب رئیس جمہوریہ فرانس مراکش کے دورے پر آیا تو اس نے مقامی مسلمان علماء کی دریافت پر کہا کہ فرانس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے اور نہ اس نے اس سے پہلے اس بارے میں کچھ سنا ہے۔ شیخ کتانی نے چند اور مسلمانوں مؤلفوں [2] کے حوالے دیے ہیں جنہوں نے اس خط کی موجودگی کا ذکر کیا ہے مگر ان کے بیانات سے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسلامی مورخوں [3] کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ تبوک کے وقت قیصر ہرقل کو ایک اور خط بھیجا تھا۔ بعض بیانات [4] سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ بھی حضرت دحیہؓ ہی سفیر تھے۔ بعض متاخر مسلمان [5] مؤلف قیصر اور ہرقل میں فرق کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ہرقل شام کے گورنر کا نام تھا، اور قیصر قسطنطنیہ کے بادشاہ کا لقب تھا اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط قیصر کے نام نہیں

۱۔ ان کے حالات کے لیے دیکھئے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

۲۔ عمدۃ القاری مؤلفہ عینی جلد اول صفحہ ۱۱۶ نیز دیکھئے فتح الباری مؤلفہ ابن حجر عسقلانی شرح صحیح بخاری کتاب نمبر۱۔ باب نمبر۶ المواہب اللدنیہ مؤلفہ قسطلانی جلد دوم صفحہ ۲۹۱۔ السیرۃ الحلبیہ مؤلفہ وحلانہ جلد دوم صفحہ ۳۳۳۔

۳۔ قلاؤون کے خارجہ سیاسی تعلقات کے لیے دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ خاص اس سفارت کے مزید حالات کے لیے دیکھئے تشریف الایام والعصور بسیرۃ السلطان الملک المنصور (مخطوطہ کتاب خانہ عام پاریس کتاب عربی نمبر۱۷۰۴) ورق ۲۲۱ ب تا ورق ۲۳۳ ب۔

۴۔ التعریف بالمصطلح الشریف صفحہ ۹۳ (مطبوعہ مصر ۱۳۱۲ء)

۵۔ اس کی تائید میں دیکھئے نفح الطیب مؤلفہ مقری جلد دوم صفحہ ۱۵۸۱

بلکہ ہرقل گورنر شام کے نام تھا۔ مگر شاید اسے غلط فہمی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سلطنت رومہ دو خود مختار مملکتوں پر مشتمل تھی ایک کا پایہ تخت رومہ تھا تو دوسرے کا قسطنطنیہ۔ قیصر عموماً رومہ کے شہنشاہ کا لقب ہوتا تھا۔ مگر اسلامی مورخ قسطنطنیہ کے بادشاہ کو بھی قیصر ہی کہتے آئے ہیں اور قسطنطنیہ کی بیزنطینی حکومت ہی شام کی مالک تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہاں ہرقل ہی حکمران تھا۔ اس لیے قیصر اور ہرقل کا امتیاز کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اس بحث کے بعد اب شاید کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم کا بیزنطینی شہنشاہ ہرقل کو تبلیغی خط لکھنا ناممکن نہیں ہے بلکہ حالات اس کی تائید ہی میں ہیں۔

عربوں کے تعلقات بیزنطینی سلطنت سے زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں

جزیرہ نمائے عرب تین براعظموں کے بیچ میں واقع ہوا ہے۔ اسی لیے قدیم زمانہ سے اس کو بین الممالک اہمیت حاصل رہی ہے۔ جب تک راس اُمید کی راہ ہندوستان اور یورپ میں راست تعلقات نہیں قائم ہو گئے مشرق کا تجارتی مال بڑی حد تک عرب ہی کی راہ مغرب کو پہنچتا[1] تھا اور عرب خود بھی تجارت کے سلسلے میں دور دور تک نکل جاتے تھے۔

ایک طرف اس تجارتی کاروبار نے عربوں کو مصر و شام اور چین و ہند تک پہنچایا تو دوسری طرف ان کے لیے آب وگیاہ مرزبوم کی غیر مہمان نوازی انہیں قدیم سے ترکِ وطن پر مجبور کرتی رہی ہے ایک طرف قبیلہ طی نے عراق و ایران میں "تازی" بن کر چینیوں سے پورے عربوں کے لیے "تاشی" (Tashi) کا لقب حاصل کیا[2] تو دوسری طرف سنہ عیسوی کی ابتدا میں جب سینٹ پاول کا دمشق سے گزر ہوا تو اسے وہاں ایک عرب بادشاہ حارث[3] نامی

1- Hexd. Histoire du comerce du Levant, Vol. 1, p25 Heffemng Dos Islamische Fremdenrdcht, sec 47 p 101.
رسالہ دیدۂ اصفی حیدرآباد دکن (۱۳۲۳ء) رجب و شعبان تجارت العرب قبل الاسلام از حکیم شمس اللہ قادری ارض القرآن مؤلفہ سلیمان ندوی اور عربی جہاز رانی مؤلفہ ایضاً کے متعلقہ ابواب بھی دیکھیے۔ نیز تمدن عرب مؤلفہ "لیبان" (لوبون:LOBON)

2- Bretchneider, Knoweldge pcssessed by the Ancient Chinese of the Arads P 6.

۳- لفظ حارث بعد میں لقب بن گیا اور اس سے مراد بیزنطینی سلطنت کا باجگذار حکمران ہونے لگا۔ دیکھیے Desverger, L, Arabie, P 88 note۔

سے سابقہ پڑا۔[1] عربوں کی نوآبادیوں حلب جیسے شمالی مقام تک میں اپنے لیے سلطنتیں قائم کرا چکی تھیں۔[2] جب بیزنطینی رومیوں کو عروج اور فروغ حاصل ہوا تو ان میں سے اکثر حکومتیں مٹ کر ناپید ہو گئیں یا بیزنطینیوں کی ماتحت اور آلۂ کار بن گئیں۔ بیزنطینیوں اور ایرانیوں میں باہم نسل بانسل سے بیر تھا تو خانہ بدوش عرب ان دونوں کے مستقل اور موروثی دشمن تھے اور عراق اور شام کے مرغزاروں پر ہمیشہ حملے کرتے اور لوٹ مار مچایا کرتے تھے ان خانہ بدوشوں کی روک تھام کے لیے انہوں نے عربوں ہی سے کام لیا۔ اور ان کی حاجز مملکتیں (Buffer-State) عربی سرحد پر قائم کر دیں۔ ایرانیوں نے حیرہ (حال کوفہ) کی ایک عربی ریاست سے اپنی رعایا کی حفاظت کا سامان کیا[3] تو بیزنطینیوں نے دمشق میں ایک ایسی ہی ریاست قائم کی۔ ایرانی اور بیزنطینی جنگوں میں حیرہ اور دمشق کے عرب اپنے اپنے حامیوں کا ساتھ دیتے اور ان کے جھنڈوں کے نیچے برادر کشی میں روز افزوں حصہ لیا کرتے تھے۔

دمشق میں ابتداً قبیلہ ضجعم برسراقتدار تھا مگر جب یمن کے سد مارب کے ٹوٹنے سے ہزاروں اہل قبائل بے خانماں اور بے روزگار ہو کر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تو قبیلہ غسان بھی گھومتا گھماتا یمن سے شام آ پہنچا۔ یہاں کے لہلہاتے مرغزار جن کو دیکھ کر جنات تجری من تحتھا الانھار کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ انہیں اس قدر پسند آئے کہ وہاں رہنے بسنے کی اجازت کے لیے ہر قیمت کے دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ضجعمی ریاست نے بیزنطینی سلطنت کی جانب سے ان پر فی کس سالانہ حسب حیثیت ایک ڈیڑھ یا دو دینار مقرر کیے۔ غسانی کچھ دن تو یہ محصول ادا کرتے رہے پھر اس سے انکار کر دیا اور مقابلے پر اتر آئے۔ آخر ایک گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں قبیلہ ضجعم بالکل تباہ و برباد ہو گیا رومی شہنشاہ دیقیوس[4]

۱- انجیل- II Cor. XI,32. 82

۲- Encyclopeedia of Islam, S.N Sham.

۳- تنبیہ والاشراف مؤلفہ مسعودی صفحہ (۱۸۶) Noldehe, La Perse ancienne P 160 note

۴- جیسا کہ آگے حوالے میں بیان کیا گیا ہے یہ مورخ محمد بن حبیب کا بیان ہے اس کو بڑی تاریخی اہمیت حاصل ہے اور سد مارب کے ٹوٹنے کی تاریخ کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اب تک محققین کا خیال یہ تھا۔ (دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت عنوان غسان (مارب)

(حاشیہ اگلے صفحے پر)

Decius فوت ۲۵۱ء نے اس صورت حال کو دیکھا تو راضی برضا ہو گیا اور غسانی سردار کو کہلا بھیجا کہ تم بڑے بہادر معلوم ہوتے ہو، کہ عربوں کے بہادر ترین اور تعداد میں بھی کثیر ترین قبیلے کو یوں آسانی سے نیست و نابود کر دیا۔ بہتر ہو کہ ہم آپس میں دوست رہیں۔ میں تمہیں ضجعمیوں کی جگہ مقرر کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم پر کوئی عرب قبیلہ حملہ آور ہو تو چالیس ہزار مسلح رومیوں سے تمہاری مدد کروں گا۔ اور اگر ہم پر کوئی عرب قبیلہ حملہ آور ہو تو ہمیں بیس ہزار مسلح مقاتلوں (Combatant) سے مدد دو۔ نیز ہمارے اور ایرانی تعلقات میں بھی دخل نہ دو غسانی سردار ثعلبہ نے اسے منظور کر لیا تو شہنشاہ دیقیوس نے اسے ایک تاج شہریاری سے سرفراز کیا۔[۱]

غسانیوں نے ہمیشہ عربی وفاداری کی لاج رکھی اور کڑے سے کڑے وقت میں بھی اپنے حامی رومیوں کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ رفتہ رفتہ ان کے اثر سے خود عیسائی مذہب بھی اختیار کر لیا۔[۲]

بیزنطینی اثرات رفتہ رفتہ پھیلتے ہی گئے اور شام سے گزر کر فلسطین اور پھر خود شمالی عرب تک حاوی ہو گئے۔ معان، آذرح، جرباء، آیلہ۔ مقنا، دومتہ الجندل وغیرہ مقامات کے علاوہ قبائل کلب، تغلب، لخم، جذام، قین، بلی، بہرا، قضاعہ وغیرہ پر بھی یہی اثرات کارفرما تھے اور ان قبائل کو اکثر حالات جنگ میں ہم بیزنطینی جھنڈے کے نیچے جمع دیکھتے ہیں۔[۳] ان قبائل کو "قیصر روم" کی طرف سے سالانہ پندرہ سیر سونا بطور وظیفہ مقرر تھا[۴] اور یہ رقمی امداد ان کو قابو میں رکھنے کا بڑا ذریعہ تھی جیسا کہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر قیصر ہند کی حکومت کرتی رہی ہے۔

[illegible] کہ یہ واقعہ شہنشاہ انسطاس کے زمانے میں ہوا جس کا ۵۱۸ء میں انتقال ہوا۔ مگر محمد بن حبیب کے مطابق سد مارب کا ٹوٹنا چھٹی صدی عیسوی میں نہیں بلکہ تیسری صدی عیسوی میں ہوا ہے۔

۱۔ یہ پورا بیان محمد بن حبیب کی کتاب المحبر سے لیا گیا ہے جو دائرۃ المعارف حیدر آباد میں چھپی ہے۔ دیکھئے ورق (۱۳۰) مابعد نیز دیکھئے میرا جرمن مضمون ZDMG جلد (۸۹) میں۔

۲۔ Encyolopoedic of S.V Ghassan

۳۔ سیرۃ ابن ہشام طبع یورپ صفحہ (۷۹۲) حالات جنگ موتہ۔

4- De Goeje. Memoire yut la Conqusto de la syme. 2nd ed, 9.29 Nieephora Cportase De redus mamlium gestis

بیزنطینی سلطنت نے مصر اور اسکندریہ پر بھی تسلط جما لیا تھا۔ اور حبش یعنی ابی سینیا تک اس کے زیر نگیں آ چکا تھا۔ حبش نے آخر یمن (جنوبی عرب) پر قبضہ کر کے ایک اہم تجارتی راہ پر قابو پا لیا۔ مصر اور حبش سے عربوں کے تجارتی تعلقات مستقل اور قدیم تھے جیسا کہ آئندہ مزید تفصیل سے واضح ہو گا۔

یہ بیان ہو چکا ہے کہ قبیلۂ قضاعہ قیصر روم کے زیر اثر تھا۔ ضجعم خانوادہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا کے دادا قصیٰ نے جو اسی قبیلۂ قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے، اپنے اہل قبیلہ اور حلیفوں کی مدد سے مغربی عرب کے سب سے اہم مرکز اور تجارتی راہوں کے ایک بڑے جنکشن یعنی شہر مکہ پر قبضہ کر لیا تھا۔[۱] مکے پر اس وقت جنوبی عرب کے ایک قبیلے (خزاعہ) کا تسلط تھا۔ اگر ابن قتیبہ کے بیان[۲] پر اعتماد کیا جائے تو قصیٰ کو خود قیصر روم نے مدد دی تھی جس کے ذریعے مکے پر قبضہ حاصل ہوا۔

قصیٰ نے مکے میں ایک شہری مملکت (City State) قائم کی جس میں علاوہ اور ضروریات مملکت کے ایک دارالندوہ بھی (جس کا لفظی ترجمہ ہو گا ہاؤس آف پارلیمنٹ) تعمیر کیا گیا اس میں شہر کے وہ سب مرد مشورے کے وقت جمع ہوتے تھے جن کی عمر کم از کم چالیس سال کی ہو۔ خود قصیٰ کے بیٹے البتہ عمر کی اس قید سے مستثنیٰ تھے۔[۳] قصیٰ کے بعد وہاں ایک طرح کی اعیانیت یا امرأ کی حکومت (Aristocracy) قائم ہو گئی جس میں عہدے موروثی ہو گئے مثلاً قومی معبد (کعبے) کی تولیت، حج اور حاجیوں کا انتظام، سپہ سالاری، علمبرداری، سفارت و خطابت، (یا ایک طرح سے وزارت خارجہ) عشر یعنی محصول درآمد کی وصولی، رفادہ یعنی حجاج کی خدمت و ضیافت وغیرہ کے نام سے اہل شہر پر سالانہ ٹیکس اندازی وغیرہ۔[۴] فنیقی اور اس سے زیادہ یونانی شہری مملکتوں سے مکے کی یہ شہری مملکت غیر معمولی مشابہت رکھتی تھی۔ یہ تقابلی مطالعہ گو بہت دلچسپ ہے مگر ایک علیحدہ مضمون کا محتاج ہے۔

۱۔ ابن ہشام طبری وغیرہ۔

۲۔ کتاب المعارف طبع یورپ صفحہ (۳۱۳)

۳۔ اخبار مکہ للازرقی صفحہ (۶۴۔۶۵۔۳۶۴)

۴۔ التنبیہ والاشراف للمسعودی صفحہ ۲۸۲ تا ۲۸۳۔ سیرت ابن ہشام صفحہ ۸۰،۸۳،۸۵،۶ے طبقات ابن سعد جلد حصہ صفحہ ۳۹۔ العقد الفرید لابن عبد (ب جلد صفحہ ۱۴۴ جلد صفحہ ۴۵۔۳۶ ازرقی صفحہ ۶۳۔۶۹۔

عبدمناف بن قصی کے چار بیٹے مشہور ہیں۔ عبدشمس، ہاشم، نوفل اور المطلب کہتے ہیں کہ ان میں سے پہلا نجاشی حبش سے ملا۔ دوسرا قیصر روم اور شاہ غسان سے، تیسرا کسرائے ایران سے اور چوتھا حمیر یعنی یمن کے بادشاہ سے ملاقی ہوا۔ اور اس بات کے پروانے حاصل[1] کئے کہ وہ بے خرخشہ، امن وحفاظت کے ساتھ ان کے ملکوں میں تجارت کے لیے آیا جایا کریں گے۔[2] کہتے ہیں کہ قیصر روم نے نجاشی کے نام سفارشی خط دیا تھا۔ اسے دیکھ کر نجاشی نے ان لوگوں کو اپنے علاقے میں تجارت کے لیے آمدورفت کا عام پروانہ عطا کیا۔[3]

اب مکّے والے ہر سال "رحلۃ الشتاء" اور "رحلۃ الصیف" کے نام سے سردیوں میں یمن اور گرمیوں میں شام ومصر وغیرہ علاقوں میں آنے جانے لگے تھے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیزنطینی حکومت آزاد تجارت کی حامی تھی چونکہ شام پر بدوی قبائل کی غارت گریوں کا سلسلہ غیر منقطع چلا آرہا تھا اس لیے بیزنطینی حکومت ہر صحرانشین کو شبے کی نظر سے دیکھنے میں شائد حق بجانب بھی تھی۔ عرب کاروانوں کے لیے چند منڈیاں مقرر تھیں۔ ان کے علاوہ دیگر مقامات پر وہ آزادانہ نقل وحرکت نہیں کر سکتے تھے۔[4] اسی طرح انہیں ہتھیار اور سونا اور اسی قسم کی بعض چیزوں کے برآمد کرنے کی قطعی ممانعت تھی۔ اور سرحد پر ان کی بڑی سختی سے جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ ان کا اسباب کھولا جاتا تھا۔[5] اور کوئی دقیقہ نگرانی کا فروگذاشت نہیں کیا جاتا تھا مزید برآں ان سے متعدد ٹیکس وصول کئے جاتے تھے۔ عربوں کو مجبوری تھی۔ یمامہ[6] یمن اور دیگر اندرونی علاقوں کے غلوں کی پیداوار ضروریات کے لے ناکافی ہوتی تھی اور بہرطور عرب شام سے غلے اور دیگر مایحتاج کے خریدنے کے لیے ہر قسم کی پابندیاں اور شرطیں گوارا

۱۔ یعقوبی جلد ا صفحہ ۲۸ نیز لسان العرب (ایلاف) نیز سورۂ ایلاف کی تفسیریں۔

۲۔ تاریخ طبری سلسلہ اول صفحہ ۱۹ Lammans La Mecque, P.128, ete

۳۔ ابن سعد جلد ا حصہ ا صفحہ ۴۳، ۴۵۔ بعض مفسرین کی رائے ہے کہ "لا یلاف قریش" میں سی کی جانب اشارہ ہے اور ایلاف کے معنی بھی یہی ہیں یعنی امن نامے حاصل کرنا۔

۴۔ Lammens be mecque a is veilledell Hegire, p129-so dapres guterback.

۵۔ حوالۂ بالا۔

۶۔ تاریخ طبری صفحہ ۹۱۹۔

کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مصر پر قبضے کے بعد سے رومیوں نے بحر احمر میں سمندری حمل ونقل شروع کردی تھی۔ جس کے باعث بین الممالک کاروانوں کا مغربی عرب سے گزرنا کم ہوگیا تھا اور "وادی غیر ذی زرع" مکہ والے اس سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ کوئی تعجب نہیں جو عبدمناف کے چاروں بیٹے انہیں حالات سے مجبور ہو کر باہر نکلے ہوں اور اپنے ہاں کی خام پیداوار (جس میں جانوروں کے پوست سب[1] سے اہم تھے) باہر کی منڈیوں میں نکالنے کی جانب متوجہ ہوئے ہوں۔

یمن میں نجران ایک ذرخیز علاقہ ہے۔ اسلام کے تقریباً سو سال پہلے یہ خطہ بڑی حد تک عیسائی مذہب اختیار کر چکا تھا۔ یمن کے بادشاہ ذونواس نے جب یہودیت اختیار کی تو تبلیغی غلو کے باعث یا دیگر نامعلوم وجوہ کے تحت نجرانیوں کو عیسائیت کے ترک کرنے کا حکم دیا۔ اور اس کے نہ ماننے پر زندہ آگ میں جھونک کر بڑی بے رحمی سے قتل عام کیا۔[2] نیز حیرہ کے حاکم کو بھی دوستانہ ترغیب دلائی کہ[3] اپنے ملک میں بھی عیسائیوں کا قتل عام کرے۔ چند بکس کہتے[4] ہیں کہ کسی نہ کسی طرح قسطنطنیہ پہنچے اور قیصر سے فریاد کی۔ قیصر نے نجاشی حبش کو جو عیسائی بھی تھا اور قیصر کے زیر اثر بھی، مدد کی جانب توجہ دلائی اور حمل ونقل کے لیے بہت سی کشتیاں بھی کیں۔[5] خود حبش میں سات سو کشتیاں تیار ہوئیں اور حبشی بندرگاہوں میں آئی ہوئی (ایرانی اور دیگر تاجروں کی کئی سو کشتیاں بھی ضبط کرلی گئیں۔[6] ان میں حبشی فوج سوار ہو کر یمن پر حملہ آور ہوئی۔ معرکہ آرائیوں کے بعد ذونواس مارا گیا اور حبشیوں نے یمن پر پوری طرح تسلط حاصل کر کے آبنائے باب المندب کے اہم تجارتی راستے پر اپنا اثر قائم کرلیا اور

۱۔ ابن ہشام وغیرہ میں قریش کی سفارت نجاشی کا ذکر دیکھئے۔ طائف کا چمڑا عربی میں ضرب المثل ہے۔ صلح حدیبیہ سے قبل بھی آنحضرتؐ نے ابوسفیان کو مدینے کی کھجوریں بھیج کر معاوضے میں کھالیں طلب کی تھیں۔

۲۔ کہتے ہیں کہ آیت اصحاب الاخدود النار ذات الوقود میں اسی کا ذکر ہے۔

۳۔ (بحوالہ مصادر سریانی وغیرہ) Desverger L Arabie, P-83,nl.

۴۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۴، طبری صفحہ ۹۲۶۔ ابن سعد ا۔ ا صفحہ ۵۵ تا ۹۵۔

۵۔ طبری صفحہ ۹۲۹۔

۶۔ Desverger L Arabie, p 70

رومیوں کو ہندوستان تک پہنچنے اور ریشم وغیرہ خریدنے کے لیے ایرانی سرزمین سے گزرنے کی حاجت نہیں رہی۔[1] اب یمن کا تعلق اسکندریہ کے بطریق سے ہو گیا اور اس نے "گرے جن تیوس" نامی ایک اطالوی پادری کو وہاں بھیجا اس نے ملک میں (۲۳) دفعات کا ایک قانون بھی مرتب کر کے نئے بادشاہ کے نام سے شائع اور نافذ کیا۔[2] اس کا ایک مخطوطہ اب بھی ویانا کے سرکاری کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یمن نے اگرچہ جلد مستقل اور خود مختار ہو کر حبش کی ماتحتی سے آزادی حاصل کر لی مگر بیزنطینی حکومت سے اس کے خاص مراسم رہے۔

۵۷۰ء میں پیغمبر اسلام کی شہر مکہ میں ولادت ہوئی۔ اگرچہ آپ کی ذات کے باعث تاریخ عالم کے متعلق بہت سے سابقہ پیش اندازے بعد کو غلط ثابت ہو گئے۔ لیکن آپ کے حالات زندگی کو آپ یتیمی کے باعث نبوت سے پہلے بہت کم کسی نے یاد رکھنے کی کوشش کی ہو گی۔ اتنا سیرت کی کتابوں[3] سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ بارہ سال کی عمر میں آپ اپنے چچا کے ساتھ ایک کارواں کی معیت میں بصریٰ تک گئے جو شمالی فلسطین ہے۔ پھر پچیس سال کی عمر میں خود بھی مال تجارت لے کر وہاں گئے۔ بعض حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کم از کم دو مرتبہ یمن[4] اور ایک مرتبہ بحرین وعمان[5] بھی ضرور تشریف لے گئے تھے۔ اور اگر وہ خط صحیح[6] ہے جو اپنے مندرجات کے مطابق آنحضرت کے اپنے چچا زاد بھائی کو ترک وطن کر کے حبش جاتے وقت بطور تعارف دیا تھا اور جس میں نجاشی سے نہایت واقفانہ اور بے تکلفانہ انداز میں ان تارکین وطن کی مہمان نوازی کی خواہش کی گئی تھی، تو شاید یہ گمان بے جا نہ ہو کہ

۱۔ ایضاً ۲۔ ایضاً صفحہ ۱۷۶
۳۔ ان تمام مشہور واقعات کو ابن ہشام، طبری، ابن سعد وغیرہ میں ورنہ شبلی کی سیرۃ النبی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے حوالے غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیے ہیں۔
۴۔ شبلی جلد اول حالات قبل نبوت۔ ۵۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۳۰۶۔
۶۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۵۶۹۔ صبح الاعشیٰ جلد ۶ صفحہ ۳۷۹۔ ابن القیم زاد المعاد جلد ۳ صفحہ ۶۰۔ اس خط کو مورخ ۶ھ کے اواخر سے متعلق کرتے ہیں جو صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس وقت ان مہاجرین کو حبش آئے ہوئے پندرہ سال ہو چکے تھے اور وہ اب مدینہ واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسے وقت خط کی یہ عبارت "میں اپنے چچا زاد بھائی جعفر کو چند مسلمانوں کی ہمراہ تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ جب وہ تیرے پاس آئے تو ان کی مہمان نوازی کر" بر محل نہیں ہو سکتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نجاشی سے پہلے ہی سے تعارف رکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ کسی تجارتی سفر کے سلسلے میں آپ فلسطین سے خشکی کی راہ مصر اور وہاں سے حبش تشریف لے گئے ہوں۔ عمرو بن العاص[1] وغیرہ متعدد مکی تاجروں کا بیان ہے کہ نجاشی سے ان کی شخصی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قبل نبوت ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو اور آپ بحری راہ سے یمن ہو کر مکے واپس ہوئے ہوں احادیث میں آنحضرت کی زبان سے گفتگو میں بعض حبشی الفاظ کا مروی ہونا بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ مگر قدیم سیرت نگاروں کی خاموشی اس بارے میں کسی زیادہ اذعانی بیان کی اجازت نہیں دیتی۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بیزنطینی علاقے میں عرب تاجروں سے بڑی سختی کا سلوک ہوتا تھا۔ اور خاص کر چنگی کے افسر بڑی تکلیف دیتے تھے کوئی تعجب نہیں جو اس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ذاتی تجربہ رہا ہو۔ احادیث میں عشار اور ماکس (عشر اور مکس وصول کرنے والے افسروں) کے متعلق جو بڑی سخت وعید آئی ہے۔[2] اس سے بھی مراد غالباً۔ یہ اور ایسے ہی لوگ ہوں گے۔ گو آپ رومیوں کو بہرحال ایرانیوں پر ترجیح دیتے تھے۔

قالم غلبت الروم فی الدنی الارض کی آیت کی تفسیر میں ملاحظہ ہو۔ لیکن آنحضرتؐ کے جو جذبات ایرانیوں اور بیزنطینیوں کے متعلق تھے۔ وہ ہجرت سے بھی پہلے واضح ہو چکے تھے چنانچہ ابن ہشام[3] کی روایت ہے کہ ہجرت سے چار پانچ سال قبل ہم وطنوں نے مصالحت اور یکسوئی کی ابو طالب کے توسط سے جب آخری کوشش کی تو آپ انہیں یہی فرماتے تھے کہ مجھے مدد تو قیصر و کسریٰ کی بستیوں کے تمہارے زیر نگیں آنے پر کچھ دیر نہیں درکار ہو گی۔

ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ کی شہری مملکت اپنے دامن کو پھیلانے لگی تو ان

۱۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۶۰۳۔ ابن ہشام ۱۷۶ وما بعد۔
۲۔ صحیح مسلم کتاب الحدود رجم الغامدیہ لقد تابت توبۃ لو تابہا صاحب مکس لغفر لہ اس بارے میں بکثرت دیگر حدیثیں اسلامی فنانس کی مشہور کتاب الاموال مؤلفہ ابو عبید (فوت ۲۲۴ھ) طبع مصر فقرہ ۱۶۲۳ تا ۱۶۲۷ میں بھی ملیں گی۔
۳۔ سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۲۷۸ سطر ۷ تا ۸۔

جذبات کے لیے کام کرنے کا موقع ملا۔ مدینے کی روز افزوں ضرورت رسد کو پورا کرنے کے لیے نبطی تاجر سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔[1] جب دومۃ الجندل کے (جو حجاز سے شام اور عراق جانے کے راستوں کے پھٹنے کی جگہ واقع ہے[2] اور خود بھی ایک بڑے میلے کا مقام رہا ہے[3]) حاکم اکیدر نے جو قیصر روم کے زیر اثر تھا، ان کاروانوں کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کیے اور ان کو ستانے کا آغاز کیا۔[4] تو ۵ھ میں رسول کریمؐ نے اس علاقے کا رُخ کیا۔ گو ابن سعد[5] (بحوالہ واقدی) کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی آمد پر اکیدر بھاگ گیا اور شہر خالی کر گیا۔ لیکن ابن ہشام[6] (بحوالہ ابن اسحاق) کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کہ اگرچہ راستے میں چند قبائل ملے جو اسلامی فوج سے ڈر کر منتشر ہو گئے، لیکن رسول کریمؐ دومۃ الجندل نہیں پہنچے۔ بلکہ اثنائے راہ ہی سے واپس ہو گئے۔ رسول کریمؐ کا اس مہم کو ادھوری چھوڑ کر عاجلانہ مدینے واپس ہونا غالباً اس وجہ سے ہو گا کہ آپ کو قریش، غطفان اور مدینے کے یہودی قبائل وغیرہ کی سازش کی اطلاع ملی ہو گی۔ کہ آپؐ کے غیاب سے فائدہ اٹھا کر مدینے پر حملہ بول دیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی مدینے میں واپسی کے چند ہی ہفتوں بعد خندق کی جنگ ہوئی جس میں مدینے کا بہت دن تک محاصرہ رہا۔

دومۃ الجندل کی اہمیت اور اس علاقے کی مؤثر نگرانی کے لیے ایک زیادہ مفصل کارروائی کی ضرورت تھی۔ دومۃ الجندل کے اطراف بہت سے خانہ بدوش قبائل بستے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توڑ لینا چاہا۔ چنانچہ مذکورہ مہم کے ایک ہی سال بعد ۶ھ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو ایک فوج دے کر روانہ کیا گیا کہ قبیلہ کلب کے سردار الاصبغ

۱۔ کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۳۹۷۔ المواہب اللدنیہ جلد ۱ صفحہ ۳۳۳ نبطیوں کا مسکن بھی اس میں معاون بھی کیونکہ وہ عرب کے شمال میں عراق سے فلسطین تک پھیلے ہوئے تھے۔
۲۔ صبح الاعشیٰ جلد ۴ صفحہ ۲۹۲، کیمبرج ہسٹری آف بائبل باب ۴ فصل ۲ فقرہ ۴ (بحوالہ شمس اللہ قادری دیدبہ آصفی بابت شعبان ۱۳۲۳ھ)
۳۔ کتاب الازمنہ والامکنہ للمرزوقی جلد ۲ صفحہ ۱۶۱۔
۴۔ التنبیہ المسعودی صفحہ ۲۴۸
۵۔ طبقات ابن سعد ۲۔ اصفحہ ۴۴
۶۔ صفحہ ۶۶۸

سے دوستی کی بنیاد ڈالیں۔ وہ مسلمان ہو گیا اور اپنی بیٹی حضرت عبدالرحمٰن کو بیاہ دی۔[1] اس طرح اکیدر کو حلیفوں سے بچھڑا دینے اور گھیر لینے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ الاصبغ کے علاوہ بعض دیگر کلبی سردار بھی اسلام لائے۔[2] اس سے بھی مسلمانوں نے اپنی جگہ مضبوط کی ہو گی۔ غرض جب ۹ھ میں تبوک کے پڑاؤ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو سواروں کا ایک دستہ حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں دومۃ الجندل روانہ کیا تو اکیدر گرفتار ہو کر آنحضرت کے سامنے لایا گیا۔ اسلحہ اور قلعے کی ضبطی سے آنحضرت نے اس علاقے کو نہتا کر دیا اور اکیدر کے معاہدے اور دومۃ الجندل کی غیر مقبوضہ آراضی کی حوالگی[3] پر یہ کشمکش اختتام کو پہنچی۔ ابن سعد[4] نے لکھا ہے کہ اس معاہدے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ناخن سے مہر لگائی (ضمتہ بظفرہ) یہ ایک بہت قدیم سامی طریقہ تھا۔ چنانچہ حال میں چند پرانی بابلی اصل دستاویزیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کے آخر میں ایک یہ جملہ ہے۔ ''اور بہ طور توثیق اس پر اپنے ناخن کا نشان کیا۔'' اس کے بعد نیچے بجائے دستخط کے ایک ہلال کی وضع کی لکیر نظر آتی ہے۔ جو ''ناخن کی مہر'' تھی۔

مگر اس اثنا میں قیصر روم اور مدینے کے تعلقات کی کشیدگی جنگ پر منتج ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ۶ھ کے اختتام پر جب مکے سے صلح ہو گئی اور ادھر سے یکسوئی ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ہمسایہ حکمرانوں کو تبلیغی خط[5] بھیجے۔ ان میں سے ایک ہرقل عظیم الروم کے نام تھا۔ جب قیصر سے کوئی آس نہ رہی تو آنحضرت نے قیصر کے باجگذار عرب رئیسوں اور صوبہ داروں سے براہ راست تخاطب فرمایا۔[6] ان میں سے ایک سفیر بصری کے حاکم کے پاس

۱۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۹۹۱ تا ۹۹۲۔ الاصابہ لابن حجر حالات الاصبغ۔
۲۔ الاصابہ لابن حجر نمبر ۱۵۳ رسالت نبویہ مؤلفہ عبدالمنعم خان نمبر ۷ ے طبقات ابن سعد ۱/۲ صفحہ ۲۴ تا ۲۹۔ الاستیعاب لابن عبدالبر نمبر ۴۹۹۔ عقد الفرید جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۵۔
۳۔ یہ معاہدہ کوئی بارہ کتابوں میں ملتا ہے سب سے بہتر متن المواہب اللدنیہ جلد ۴ صفحہ ۲۹۸ میں ہے۔ گو ابوعبید و بلاذری ابن سعد، قدامہ بن جعفر وغیرہ نے بھی اس متن کو محفوظ کیا ہے۔
۴۔ جلد ۲۔ اصفحہ ۳۴۔
۵۔ ابن ہشام، طبری وغیرہ۔
۶۔ خاص اس خط پر میرا تحقیقی مقالہ رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت جون ۱۹۳۵ء میں چھپا ہے (جو ابھی اس سے پہلے کے باب میں درج ہوا۔

گیا مگر اس کو موتہ کے مقام کے قریب غالباً جاسوس سمجھ کر یا یہ خیال کر کے کہ وہ غداری کی سازش میں کام کر رہا ہے، قبیلہ غسان کے ایک سردار شرجیل بن عمرو نے قتل کر دیا۔[1] سفیر کا قتل بین الممالک رسم ورواج کی شرمناک خلاف ورزی تھی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۸ھ میں ایک فوج روانہ کی جس میں زید بن حارثؓ جعفر طیار اور خالد بن الولید جیسے افسر شامل تھے۔ یہ لڑائی ایک مقامی حادثہ ہو کر رہ جاتی اگر قیصر اپنے ماتحت اور زیر حمایت قبیلہ غسان کی حفاظت کے لیے فوجیں نہ بھیجتا۔ اور بہت سے عرب سرحدی قبائل کو بھی ہموار نہ کر لیتا[2] اس نئی صورت حال کے لیے مسلمان فوج تیار نہ تھی مگر اس نے پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا اور گو وہ خالد بن الولید کی کوشش اور موقع شناسی سے زندہ سلامت واپس آ گئی مگر بہت سے افسروں کو کھونے کے بعد۔[3]

جب یہ فوج پسپا ہو کر واپس آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً حضرت عمرو بن العاص کو بھیجا کہ عرب کے شمال میں قبیلہ قضاعہ کو جس سے عمرو بن العاص کی رشتہ داری بھی تھی، بیزنطینیوں سے توڑ کر مسلمانوں کا حلیف بنا لیں۔[4] مگر یہ بظاہر اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی اس پر بڑے ساز وسامان سے جن میں بحرین وعمان کی اطاعت کے باعث وہاں کی آمدنی سے بڑی مدد ملی،[5] دوسرے سال ۹ھ میں خود آنحضرت تیس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ روانہ ہوئے اور تبوک میں آخری پڑاؤ ڈالا۔ یہاں سے قیصر ہرقل کے نام ایک تہدید یہ بھیجا کہ یا[6] تو اسلام لائے یا جزیہ دے کر سیاسی ماتحتی قبول کرے ورنہ کم از کم اس میں آڑے نہ آئے کہ اس کی رعایا ایسا کرے۔ اگر کچھ بھی منظور نہ ہو تو جنگ ہو گی۔ قیصر کا جواب جو یعقوبی[7] نے محفوظ کیا ہے اور جس میں قیصر کے اسلام کا اعلان ہے، صریحاً فرضی معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعد کے واقعات اس کی تائید نہیں کرتے۔ علاوہ بر آں قیصر کا خط بیزنطینی اسلوب میں

۱۔ مثلاً غسانی سرداروں۔ معاون کے حاکم، داریوں اور تمیوں کو خطوط لکھے گئے یا ان سے معاہدے ہوئے (دیکھیے میری فرانسیسی کتاب Documents II No.25-52، ابن سعد ۲۔ ا صفحہ ۹۲۔

۲۔ ابن ہشام صفحہ ۷۹۲، ایضاً ۷۹۱ و مابعد۔

۳۔ تاریخ دمشق میں ابن عساکر نے لکھا کہ موتہ کے سلسلے میں ایک بحری مہم ایلہ بھیجی گئی۔

۴۔ ابن ہشام صفحہ ۹۸۴ تا ۹۸۵ طبری صفحہ ۱۶۰۴۔ ۵۔ ابن سعد ا صفحہ ۲۸۔

۶۔ متن خط کے لیے دیکھیے کتاب الاموال فقرہ ۵۵ نیز صبح الاعشیٰ جلد ۶ صفحہ ۳۷۷

۷۔ جلد ۲ صفحہ ۸۴ منشات السلاطین مولفہ احمد فریدون بیک جلد ا صفحہ ۳۰

ہونا چاہیے حالانکہ یہ جواب خالص عربی بلکہ بدوی انداز میں ہے قیصر نے جو بھی جواب دیا ہو، بہرحال اسلامی فوجوں نے جرباء، اذرح، ایلہ، مقنا، اور دومتہ الجندل کو مطیع کر لیا تو قیصر نے کوئی حرکت نہ کی۔ غرض تبوک سے مختلف دستے آس پاس کے اہم شہروں پر روانہ کیے گئے۔ خالد بن الولید نے دومتہ الجندل کے حکمران اکیدر کو گرفتار کیا اور جب اس نے آنحضرت کی اطاعت قبول کی تو اس کو گدی پر بحال کیا گیا۔ دومتہ الجندل[1] کے آس پاس رہنے والے بعض قبائل سے بھی معاہدات اطاعت[2] لیے گئے جو غالباً اس سے کچھ دنوں بعد کے ہیں۔

ایک دوسرا فوجی دستہ ایلہ (حال عقبہ) کے اہم تجارتی مرکز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تحریری پیام لے کر گیا[3] یہاں کے حاکم یحنہ بن روبہ نے جو مقامی پادری بھی تھا مناسب یہ خیال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باقہ کرے۔ چنانچہ ایک معاہدہ لکھا گیا[4] جس میں ایلہ نے اسلامی مملکت کی باجگذاری اور دیگر تمام ممالک سے آزادی و بے تعلقی منظور کی۔ وہاں کے لیے چند اصول عدل گستری بھی معاہدے میں لکھے گئے۔ اور یہ امر طے کیا گیا کہ بندرگاہ ایلہ میں جو تجارتی جہاز یا کارواں آئیں (خواہ وہ شامیوں ہی کے کیوں نہ ہوں، جن سے اسلامی مملکت اس وقت حالت حرب میں تھی) امن میں رہیں گے۔ اور ایلہ والے اسلامی سرزمین میں آزادانہ تجارت کے لیے آ سکیں گے نیز دیگر ممالک سے بھی تجارت کر سکیں گے۔ (خواہ وہ ممالک اسلامی مملکت سے برسر پیکار ہی کیوں نہ ہوں)

غالباً جرجا۔ اور اذراح کے گاؤں کو بھی (جو معانؔ کے قریب فلسطین میں جبل سراۃ کے جنوب میں ایک دوسرے سے چند گھنٹوں کے فاصلہ پر واقع تھے)[5] کوئی فوجی دستہ بھیجا گیا تھا، کیونکہ یہاں کے بھی وفد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تبوک میں آ کر ملے اور جزیے کے ادائی کے وعدے کے ساتھ معاہدہ اطاعت کیا۔[6] یہ بہت چھوٹے گاؤں تھے

۱۔ بلاذری صفحہ ۶۱۔ ابن سعد ا۔ ۲ صفحہ ۳۶ روض الانف للسہیلی جلد ۲ صفحہ ۳۱۹ تا ۳۲۰ وغیرہ۔

۲۔ جیسا کہ ابھی اوپر ذکر ہوا۔

۳۔ ابن سعد ا۔ ۲ صفحہ ۲۸ تا ۲۹، ابن حدیدہ (المصباح المضیی) مخطوطہ۔

۴۔ ابن ہشام صفحہ ۹۰۲، ابن سعد ا۔ ۲ صفحہ ۳۷، فارسی ترجمہ سیرۃ ابن اسحاق (مخطوطہ پیرس) ۱۹۹ و مابعد۔

۵۔ دیکھیے معجم البلدان مولفہ یاقوت میں یہ نام۔

۶۔ ابن سعد ا۔ ۲ صفحہ ۳۷، مواہب جلد ۲ صفحہ ۲۹۷۔

جن کی آبادی بہ مشکل سو، سوا سو نفوس پر مشتمل تھی جیسا کہ ان کے جزیے کی مقدار سے واضح ہوتا ہے۔

اس مہم کے دوران میں بندرگاہ مقنا کے باشندے بھی مطیع ہو گئے۔ ان کے معاہدے کے سلسلہ میں بہت سے مسائل تحقیق طلب رہتے ہیں۔ یہاں میں اپنی تحقیقات کے نتائج کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مقنا پر جو ایلہ کے قریب تھا، ایلہ کے حاکم نے قبضہ کر لیا تھا اور یہاں کے یہودی باشندوں کو ان کے کسی خونی جرم کی پاداش میں ملک بدر کر دیا تھا۔[1] تبوک میں یہ لوگ آنحضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اوروں سے پہلے ملے اور معاہدہ اطاعت کیا اور استدعا کی کہ انہیں ان کے ملک میں دوبارہ بسایا جائے۔ اس استنباط کا باعث ایک فقرہ ہے جو ایلہ کے حاکم کے نام ابتداً "بھیجے ہوئے خط کے آخر میں درج ہے کہ اہل مقنا کو سامان دے کر ان کے وطن بھیجو۔" نیز خود معاہدہ مقنا کے شروع میں بھی اس خواہش کی تکمیل کا ذکر ہے۔

معاہدہ مقنا کا متن ہمیں تین جگہ ملتا ہے طبقات ابن سعد،[2] فتوح بلاذری اور کنیزہ[3] مصر کی ایک قلمی کتاب[4]۔ یہاں ان کے فرق اور ان کے مندرجات پر کچھ روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

کسی کتاب یا تاریخ میں یہ نہیں بیان کیا گیا ہے کہ مقنا والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فوجی مقابلہ کیا ہو اس کے باوجود ان کے معاہدے کی ایک شرط جو ابن سعد اور بلاذری دونوں کے متن میں ہے ایسی ہے جو صرف بزور مطیع بنائے ہوئے قبائل پر عہد نبوی میں عائد کی جاتی تھی یعنی جملہ ہتھیاروں، غلاموں، جانوروں اور پہننے کے کپڑوں کی حوالگی۔ مہم تبوک میں جملہ مفتوح علاقوں سے جزیہ طلب کیا گیا تھا۔ لیکن مقنا والوں کو جزیے سے معاف کر دیا گیا اور صرف ان کے کھجور کی پیداوار، مچھلی پکڑنے کی کشتیوں اور عورتوں کے کاتے ہوئے سوت کا پاؤ پاؤ حصہ اسلامی حکومت کے حوالے کرنے کا معاہدہ ہوا۔

۱۔ دیکھئے معاہدۂ مقنا جس کا حوالہ آگے آتا ہے۔

۲۔ جلد ۱، ۲ صفحہ ۳۸۔ ۳۔ صفحہ ۶۰

۴۔ سلسلۂ اول جلد ۱۵ صفحہ ۷۷ تا ۹۷ میں اصل کتاب کے فوٹو ہیں۔ نیز دیکھئے۔

اسی معاہدے میں مندرج ہے کہ اہل مقنا بیگاری (سخرہ) سے مستثنیٰ رہیں گے بشرطیکہ وہ مطیع اور فرماں بردار رہیں سوال یہ ہے کہ کیا عہد نبویؐ میں مسلمانوں میں بیگاری کا رواج تھا؟ اگر یہ کہا جائے کہ بیزنطینی حکومت میں بیگاری رواج تھا اور آنحضرت نے ان لوگوں کو آزاد کر دیا تھا تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ عہد نبوی میں اسلامی مملکت کا اقتدار شمالی عرب میں خلیج عقبہ تک جہاں مقنا واقع ہے مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گیا تھا۔

ابن سعد کی روایت میں آنحضرتؐ نے وعدہ فرمایا ہے کہ مقنا والوں کے معززین کا آپ احترام فرمائیں گے اور ان کے مجرموں کو معاف کر دیں گے اور یہ کہ ان کا حاکم یا تو انہیں میں سے ہوگا یا اہل رسول اللہ[1] میں سے۔

بلاذری کا انتقال ابن سعد کے کچھ دنوں بعد ہوا۔ بلاذری کو ایک شخص نے جس نے مقنا والوں کے ہاں انکا معاہدہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس معاہدے کو لفظ بہ لفظ نقل کر کے لا دیا تھا۔ اس میں ابن سعد کے متن پر متعدد اضافے ملتے ہیں۔ مثلاً ان کا حاکم یا تو ان میں سے ہوگا یا "اہل بیت رسول اللہ" میں سے...... جملہ بہائے ہوئے خون سے مقنا والوں کو بری کیا گیا...... مقنا کے مالک مقنا والے ہوں گے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرستادہ کوئی شخص...... وہ اپنے ہتھیار، غلام، جانور اور کپڑے مسلمانوں کے سپرد کر دیں گے بجز اس کے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کا کوئی فرستادہ مستثنیٰ کر دے۔

کتبہ علی بن ابو (کذا) طالب فی سنۃ تاریخیں بتاتی ہیں کہ حضرت علیؓ اس مہم میں شریک نہ تھے۔ مدینے ہی میں رہ گئے تھے۔ "اہل رسول اللہ" کو "اہل بیت" "رسول اللہ" بنا دینا اور آخر میں سنہ کا ذکر کرنا جبکہ سنہ کا رواج عام تاریخی بیانات کے مطابق ۱۶ھ سے پہلے مسلمانوں میں نہ تھا اور "علی بن ابو طالب" لکھنا جو نحوی حیثیت سے غلط ہے قابل غور ہے۔

مگر قبل اس کے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کریں اس معاہدے کی ایک تیسری روایت کا ذکر ضروری ہے۔ مصر کے کنیزے میں ایک عربانی قلمی کتاب ملی جواب کیمرج میں ہے اس میں عربی عبارتوں کو عبرانی رسم الخط میں (Transcription) لکھ کر محفوظ کیا گیا ہے اس میں

۱۔ یہ محاورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور خطوط میں بھی ہے مثلاً ابن ہشام صفحہ ۹۷۷ میں اس سے مراد حضرت معاذ بن جبل ہیں۔

اس معاہدے کی بھی نقل ہے مگر اس کا متن ابن سعد اور بلاذری کے متن سے ڈھائی گنا زیادہ ہے۔ اس میں بہت سی زائد چیزیں ہیں جن میں سے اہم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ معاہدہ نہ صرف اہل مقنا بلکہ اہل خیبر سے بھی متعلق ہے اور ان کی اولاد سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے...... مراعات کی وجہ بھی معاہدے میں لکھی ہے کہ بی بی صفیہ (خیبر والی) سے آنحضرتؐ نے نکاح فرمایا ہے۔ اہل مقنا و خیبر پر ہتھیار غلام اور دیگر سامان حوالے کرنے کی شرط نہیں۔ وہ سب انہیں کے رہیں گے...... یہ معاہدہ عہد نبوی کا ہے مگر پھر بھی اس میں لکھا ہے کہ ان یہودیوں کو رسم (چنگی ٹیکس) سے مستثنیٰ اور معاف کیا جاتا ہے...... نیز انہیں خاص قسم کے کپڑے پہننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ تسمہ کاٹے ہوئے چپل پہننے پر مجبور کیا جائے گا۔ ان کو اجازت ہو گی کہ اچھے کپڑے پہنیں۔ ہر قسم کے ہتھیار رکھیں اور گھوڑے پر سوار ہو سکیں...... اگر کوئی یہودی کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے تو اس کی قانونی حیثیت وہی ہو گی جو کسی مسلمان قاتل کی ہوتی...... دیگر تمام ذمیوں سے یہ اہل معاہدہ زیادہ محترم سمجھے جائیں گے...... وہ اپنے جنازے شہر کی بڑی سڑکوں پر سے لے جا سکیں گے...... وہ مسجدوں میں داخل ہو سکیں گے...... اگر ان میں سے کوئی مسلمان ہو جائے تو وہ اہل بیت رسول اللہؐ میں (بطور مولیٰ) داخل سمجھا جائے گا۔ اور اہل بیت کے لیے جو وظیفہ مقرر ہے اس کے چوتھائی یعنی پچاس دینار کا مستحق ہو گا اور یہ اس وقت عطا ہو گا جب دوسرے قریشیوں کو...... تاریخ معاہدہ ۳ رمضان ۵ھ لکھی گئی ہے۔ حالانکہ مہم تبوک و مقنا ۹ھ میں ہوئی اور جنگ خیبر ۷ھ میں۔ اور کاتب کا نام بلاذری ہی کی طرح علی بن ''ابو'' طالب لکھا گیا ہے گو جیسا کہ بیان کیا گیا، وہ تبوک کی مہم میں شریک نہ تھے۔ آخر میں بطور گواہ تین ایسے صحابہ کا نام ہے جو اہل شیعہ کے نزدیک خاص احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ یعنی عمار بن یاسر، سلمان فارسی مولیٰ رسول اللہ اور ابوذر غفاری۔

اگر چہ ہرش فیلڈ (Hirsehfeld)[1] اور لے ژنسکی (Leszynsky)[2] نے اپنی قابلیت اور علمیت سے انتہائی کام لے کر اس دستاویز کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ (یہ دونوں مؤلف یہودی ہیں) مگر اس میں قبل از وقت چیزوں کا اتنا بڑا عنصر ہے کہ اس کا جعلی

۱۔ Jewish Quarterly Review, XV-P is 2 FF

۲۔ Die Juden la Arabten P 107 FF بحوالہ (MSOS) برلن مذکورہ بالا صفحہ ۵۵۔

ہونا پہلی نظر ہی میں ظاہر ہے۔ اس کے ثابت کرنے میں کسی تضیع اوقات کی مطلق حاجت نہیں۔ اور غالباً یہ وہی دستاویز ہے جس کے شائع ہونے کا یاقوت[1] اور ابن القیم[2] نے بھی ذکر کیا ہے اور اس کی صحت کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ ابن القیم نے تو بڑی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے اور دس وجوہ سے اسے غلط ثابت کیا ہے۔

اشپربر (Sperber)[3] نے گو تسلیم کیا ہے یہ دستاویز جعلی ہے در اصل میں بلاذری کی روایت پر حذف و اضافہ کر کے تیار کی گئی ہے مگر وہ ابن سعد کی روایت کو بہر حال صحیح تسلیم کرتا ہے لیکن ان بے وقعت چیزوں اور غیر معمولی برتاؤ کی کوئی وجہ نہیں بیان کرتا جن کی جانب ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

ہم اپنی رائے بیان کرنے سے پہلے اس اہم جملے کی طرف دوبارہ توجہ منعطف کراتے ہیں جن میں اہل مقنا کو اپنے ہتھیار اور اپنے کپڑے حوالے کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ شرط اصل میں ۷ھ میں فتح خیبر کے وقت وہاں کے یہودیوں پر لگائی گئی تھی۔[4] اور اس جنگ میں حضرت علی بھی شریک تھے۔[5] کوئی تعجب نہیں جو معاہدہ انہوں نے لکھا ہو۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان یہودیوں کو جنہیں حسب معاہدہ اسلامی حکومت جلا وطن کرنے کی مجاز تھی شام میں جا بسنے کا حکم دیا گیا۔[6] اسی بنا پر ہمارا گمان ہے کہ جب یہ خیبری شام و فلسطین پہنچے تو وہ اپنے ساتھ اپنا معاہدہ بھی لیتے گئے جو آنحضرتؐ نے کیا تھا۔ اور مقامی یہودیوں کو جن میں اہل مقنا بھی شامل ہیں۔ اُس کی اطلاع ملی۔ بعد میں ابن سعد اور بلاذری کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے شیعہ یا عباسی تحریک کے زمانے میں اہل مقنا نے اپنے اصلی اور اس خیبر کے معاہدے دونوں کو سامنے رکھ کر ایک نئی دستاویز تیار کی جس میں حسب ضرورت دونوں اصلی معاہدوں کے

۱۔ معجم الادبا، جلد ۱ صفحہ ۲۴۷ تا ۲۴۸۔ ابن کثیر کا بھی اس پر ایک خصوصی رسالہ ہے۔

۲۔ احکام اہل الذمہ (مخطوطہ بزم ادب حیدر آباد) ورق ۳ تا ۵۔

۳۔ برلن کے مذکورہ رسالے (MSOS) کا صفحہ ۵۹ تا ۵۷ ملاحظہ ہو۔

۴۔ بلاذری صفحہ ۲۳۔ کتاب، الخراج لقدامہ بن جعفر (مخطوطہ استانبول) باب خیبر۔

۵۔ حالات جنگ خیبر کسی کتاب سیرت میں دیکھیے۔

۶۔ ابن ہشام صفحہ ۷۸۔

جملے یا فقرے داخل کیے گئے اور کچھ نئی چیزیں داخل کی گئیں اور خیبر کے معاہدے کے کاتب کی حیثیت سے (یا یوں بھی وقتی اہمیت کے باعث) حضرت علیؓ کا نام آخر میں بڑھا دیا۔ اس کے بعد فاطمی عہد حکومت میں خاص کر الحاکم بامراللہ کے زمانے میں جب غیر مسلم رعایا سے سخت برتاؤ ہونے لگا اور ان پر بہت ظالمانہ پابندیاں عائد کی گئیں تو مصر کے یہودیوں نے ایک تیسری دستاویز تیار کی جسمیں ضروریات زمانہ کے مطابق بہت کچھ حذف و اضافہ وتبدیلی کی۔ اس دستاویز کی نقل کا مصر میں دستیاب ہونا، اس میں شیعی عنصر کا اتنا زیادہ مقدار میں پایا جانا اور فاطمیوں کا تعلق ...... ان تمام امور سے ہمارے گمان کو مزید تقویت ہوتی ہے۔

غرض متعدد اہم مقاموں کو مطیع بنانے اور اسلامی اثر کا سکہ بٹھانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی مہم سے واپس مدینہ تشریف لائے۔ مگر مسلمانوں کو موتہ کی شکست کا ملال تھا۔ اس لیے دو سال بعد جبکہ جزیرہ نمائے عرب کی اندرونی الجھنیں سلجھ چکی تھیں اور دیگر مقامات سے یکسوئی ہو کر پورا ملک مسخر ہو چکا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موتہ کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک اور خاصی بڑی فوج حضرت اُسامہ بن زیدؓ کی سرداری میں جن کے والد زید بن حارثؓ موتہ میں سپہ سالاری کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے تیار کی، ابھی یہ فوج مدینے سے روانہ بھی نہیں ہوئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کا دوسرے ہی دن انتخاب ہو گیا اور خلیفہ حضرت ابوبکرؓ نے مجوزہ مہم کو روکنا پسند نہیں کیا چنانچہ حضرت اُسامہ کو فوج آبل پر[1] جس کی جگہ بعض وقت اُبنی بھی[2] کہتے ہیں مگر جغرافیائی حیثیت سے غلط ہے۔ چھاپہ مار کر ستر دن میں واپس آ گئی۔ بعض یورپی مؤلفوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس فوج کی روانگی اصل میں اس لیے تھی کہ اس میں معززین انصار شریک تھے اور حضرت ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ انتخاب خلیفہ سے انصار میں ان کے نمائندے کی شکست کے باعث جو جوش پیدا ہوا تھا اسے ٹھنڈا کیا جائے ممکن ہے یہ اتفاقی فائدہ بھی ہوا ہو لیکن اس فوج کی روانگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کی تکمیل کا جذبہ بھی بہت کچھ کارفرما تھا حضرت ابوبکرؓ اس کا جتنا خیال رکھتے تھے وہ اس واقعے

۱۔ یہ طبری کی روایت ہے۔ طبری میں عموماً نام صحیح ملتا ہے۔ مثلاً قابیل کی جگہ قاین Cl.Calin۔

۲۔ یہ عام روایت ہے۔

سے بھی معلوم ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ ''جس کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ وعدہ کیا تھا وہ اب مجھ سے رجوع ہو۔''[1]

اسلامی مملکت کو چندے مرتدوں، باغیوں اور مدعیان نبوت سے پریشانی رہی لیکن جب اس سے بے فکری ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے قیصر روم کے پاس ایک مرتبہ اور سفارت بھیجی اور اسلام یا سیاسی اطاعت کی دعوت دی مورخ ذہبی[2] نے اس سفارت کا حال بڑی تفصیل سے قلم بند کیا ہے اور اس میں بعض عجیب قصے بھی لکھے ہیں کہ قیصر کے پاس جملہ انبیاء کی تصویریں تھیں اور مسلمان سفیروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر کو فوراً پہچان لیا تھا۔ ارمنی مورخ سابیوس (Sabecs) نے بھی ذکر کیا ہے کہ اس زمانے میں قیصر کے پاس ایک اسلامی سفارت آئی تھی۔ اس بیان کا ترجمہ ہیوبش مان (Hubrash Man) نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

''انہوں (مسلمانوں) نے تب ایک سفارت بیزنطینی شہنشاہ کے پاس بھیجی۔ اور کہا! خدا نے یہ علاقہ ہمارے جد (حضرت) ابراہیم اور ان کی ذریت کو عطا کیا تھا۔ تو اس پر بہت دنوں سے قابض ہے وہ ہمیں صلح اور آشتی سے واپس کر دے پھر ہم تیرے ملک میں نہیں آئیں گے۔ ورنہ ہم اصل کا سود کے ساتھ واپسی کا مطالبہ کریں گے۔''

''قیصر نے انکار کیا اور وہ جواب نہ دیا جس کی سفیر کو اس سے توقع تھی۔ کیونکہ اس نے کہا، یہ ملک میرا ہے، تیرا ورثہ تو صحرا ہے جا وہاں امن سے رہ۔''

قیصر کی سفارت کی ناکامی اور اتمام حجت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے شام فلسطین اور اردن پر الگ الگ فوجیں بھیجیں۔ ان فوجوں کو جو ہدایتیں حضرت ابوبکرؓ نے دیں وہ متعدد مؤلفوں[3] نے محفوظ کی ہیں۔ دخویے (Degoeje) کو[4] ان کے متعلق اعتراف ہے کہ

۱۔ کتاب الخرج ابی یوسف صفحہ ۲۳۔

۲۔ تاریخ کبیر حالات ابوبکرؓ (مخطوطہ بزم ادب حیدر آباد)۔

۳۔ مثلاً شرح السیر الکبیر للسرخسی جلد ۱ صفحہ ۷ ۳ جمع الجوامع للسیوطی، مخطوطہ بزم ادب حیدر آباد، ''مسند ابی بکرؓ'' طبری صفحہ ۱۸۳۹ تا ۵۰ کنز العمال جلد ۲ نمبر ۲۲۵۹ ۔ ۲۳۶۱۔

۴۔ Memoire sur la conquete dela Syrie. P22

"ان ہدایات میں معقولیت اور اعتدال کی جو روح کارفرما ہے اس کے باعث ان کا بجا طور سے داد دینی پڑتی ہے۔"

مسلمان فوجوں نے بڑی ہمت اور بہادری سے بیک وقت بیزنطینی اور ایرانی دونوں شہنشاہیوں سے مڈبھیڑ شروع کر دی تھی۔ مسلمانوں کی کامیابی کا بڑا باعث ان کو طرز عمل تھا۔ چنانچہ اس بات کا ذکر کرنے کے بعد کہ فوجی مصلحتوں سے مسلمان سپہ سالار نے جب ایک مرتبہ چند شہروں کا تخلیہ کیا تو رعایا سے وصول کردہ ٹیکس یہ کہہ کر واپس کر دیئے تھے کہ یہ ٹیکس حفاظت کے معاوضے میں تھے ہم اب تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ ولندیزی مستشرق دخویے[1] لکھتا ہے۔

فی الحقیقت شام میں لوگ عربوں کی جانب بہت مائل ہو گئے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ عربوں نے مفتوحوں سے جو برتاؤ کیا اگر اس کا مقابلہ وہاں کے سابق مالکوں کے بے اصول ظلم سے کیا جائے تو بڑا ہی سخت فرق نظر آتا ہے۔ جو عیسائی فیصلہ کالسی ڈون (Chaicedon) کو نہیں مانتے تھے۔ ان کے ناک کان قیصر ہرقل کے حکم سے کاٹے گئے۔ اور ان کے گھر ڈھائے گئے تھے (دیکھئے حوالے کے لیے Barhebraeus, (Chron Ecel I, p274

یہودیوں پر الزام لگایا گیا تھا کہ ایرانیوں کے حملے کی انہوں نے تائید کی تھی۔ اگرچہ ہرقل نے ان کے لیے عام معافی کا وعدہ کیا تھا لیکن ان کا سخت ظالمانہ طور سے پیچھا کیا گیا تھا (حوالہ Eutychius, II, 242) اس کے برخلاف عرب جو حضرت ابوبکرؓ کی ہدایتوں پر عمل کرتے تھے، مقامی باشندوں کا دل موہ لینے کی کوشش کرنے لگے اور سب سے زیادہ اپنی بات کا پاس کرتے رہے۔۔۔ تقریباً پندرہ سال بعد ایک نسطوری پادری (حوالہ Assemari Bibl Oriert III 2 p-XCVI) نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے)

1۔ ایضاً صفحہ ۱۰۲،۱۰۶۔

ہمارے مالک بھی بن گئے ہیں۔ مگر وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسر پیکار نہیں۔ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور قدسیوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجوں اور کلیساؤں کو جاگیریں (Dons) عطا کرتے ہیں۔"

اسی سلسلے میں ایک اور اہم شہادت یہاں پیش کی جا سکتی ہے۔ مشہور پادری کارالیفس کی (C Karalevski) نے شہر انطاکیہ کے عیسائی حالات لکھتے ہوئے فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا Dict. d Histor. et Geographic Eccksias. v Antioche میں اعتراف کیا ہے۔

مسلمان عربوں کو یعقوبی عیسائیوں (Jacobites) نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اس مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دینوی عدالتی اقتدارات عطا کیے جائیں گے۔

اسی طرز عمل کا نتیجہ تھا کہ پہلی صدی ہجری میں شام و فلسطین کی مادری زبان تک عربی ہو گئی۔ اور یہ علاقے آج تک ٹھوس عربی ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہ وغیرہ کے قیصران روم سے جو سیاسی تعلقات تھے اگرچہ ان کے متعلق لاطینی، ارمنی، اور سریانی تاریخوں سے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور سفارتوں اور مراسلتوں کا دلچسپ تذکرہ ملتا ہے، اور ان سے عربی تاریخوں کی تائید یا تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن ان سب کا ذکر اس صحبت میں ممکن نہیں۔ ان کے لیے اور دیگر بیزنطینی علاقوں مثلاً معان، تغلب مصر، آرمینیا، حبش وغیرہ کے سیاسی تعلقات عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ رہے اسکے لیے میری تالیف La Diplomatie musulmane al epoque du ophete etdes Khehttas Orthodoxes کے ابواب متعلقہ میں مواد اور حوالے مل سکتے ہیں۔

عہد نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات

قبل اسلام

جزیرہ نمائے عرب زیادہ تر صحرا ہے۔ اس لیے وہاں کی آبادی اپنی غذا تک کے لیے قدیم سے بیرونی درآمد کی محتاج رہی ہے۔ تعدد ازدواج سے آبادی میں تیز اضافہ اور ذرائع معیشت میں خانہ جنگیوں وغیرہ کے باعث روز افزوں انحطاط عربوں کو اکثر ترک وطن پر قدیم سے مجبور کرتا رہا ہے۔ ایک طرف وہ خطرناک بحری راستے سے مشرقی افریقہ جاتے رہے۔ تو دوسری طرف شمال مشرق میں عراق کی طرف اور شمال مغرب میں فلسطین کی طرف بھی خشکی کے راستے سے ہمیشہ ان[1] کا رخ رہا بعد میں ملاحی مہارت بڑھنے پر وہ ہند اور چین تک تجارت کے لیے آنے جانے لگے۔

جہاں تک ایران کا تعلق ہے۔ اس کو سب سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ طے ہی سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اب یہ مسلمات سے سمجھا جاتا ہے کہ فارسی لفظ تازی اور اس کا بگڑا ہوا چینی لفظ تاشی[2] (جس سے عرب مراد ہوتے ہیں) اسی لفظ "طی" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ تبت کے تاشی لاما کا بھی شاید اس لفظ سے کوئی تعلق ہو۔

ان تارکان وطن کی تعداد ایرانی صوبہ عراق میں اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ انہوں نے عہد

1۔ اس کی قدامت اور وسعت کے لیے دیکھئے میرا مقالہ "عربوں کے تعلقات بیزنطینیوں سے" جو اوپر درج ہوا۔ مختصر یہ کہ سنت پاول کے زمانے میں دمشق میں ایک عرب بادشاہ حارث حکمران تھا تو سب جیسے شمالی علاقوں تک میں عرب کی راجدھانیاں قائم ہو چکی تھیں۔

2۔ بریٹ شاندر کا انگریزی رسالہ عربوں کے متعلق چینیوں کے معاملات ص ٦۔

نبوی سے صدیوں قبل حیرہ (کوفہ) میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی تھی اور لخمی قبیلے کے ان عرب حکمرانوں پر ماحول کا کچھ اتنا اثر پڑا کہ شام کی طرف جانے والے غسانیوں کے برخلاف انہوں نے خانہ بدوشی تک ترک کر دی۔ اور بستیوں میں بس کر عربی تہذیب کی عظیم الشان خدمت انجام دینے لگے۔

ایرانی شہنشاہوں نے مختلف مصلحتوں سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ عرب اور ایران (عراق) کے مابین حد فاصل اور حاجز مملکت (بفراسٹیٹ) بنے اور خانہ بدوش بدویوں کی عراق میں لوٹ مار کی مہمیں خود یہ لوگ جھیلنے لگے۔[1] اور ایرانی امن میں ہو گئے تو دوسری طرف ایرانی جو روز افزوں آرام طلب ہوتے جا رہے تھے، مفت کے عرب رضا کاروں سے اپنی فوج میں کثیر تعداد میں کام لینے لگے۔ اس سے عربوں میں جنگجوئی اور فوج آرائی کی روح نہ صرف تازہ رہی بلکہ صیقل پاتی اور فطرت میں رچتی گئی تو ساتھ ہی ایرانی روز بروز جنگ سے ڈرنے لگے اور بزدل ہوتے گئے۔ ایرانی بیزنطینی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان عربی فوجوں نے جو فیصلہ کن اور عظیم الشان حصہ لیا اور ایرانی حکومت کے لیے صرف اپنے بل بوتے پر جو وسیع فتوحات حاصل کیں، ان سے ہر کوئی واقف ہے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ امر البتہ نمایاں کئے جانے کے قابل ہے۔ کہ بیزنطینی قیصروں نے حبشیوں اور پھر غسانیوں سے جنگی حلیفی کر لی اور ایرانی کسراؤں کے لیے بھی ناگزیر تھا کہ اسی کے مماثل طاقتور عربوں کو اپنا حلیف بنائے رکھیں۔

عرب کے جانوروں تک کی وفاداری ضرب المثل ہے۔ پھر حیرہ کے حکمرانوں پر کسرایان ایران کا اعتماد کیوں نہ بے پایاں ہوتا۔ کسی اور ملک میں یہ نظیر نہ ملے گی جیسی یہاں ملتی ہے کہ کسرائے ایران اپنے ولی عہد کو اپنے جونیئر حلیف بلکہ ماتحت حکمران حیرہ کے ہاں بھیج دے تاکہ وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہو۔ بعد میں بدوی روایات کے حامل اس شہزادے نے حکمران بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حیرہ کا عربی ماحول مدائن کے ایرانی ماحول سے کہیں زیادہ مفید و کردار ساز تھا۔

حیرہ والوں کی خدمات خود عرب کے لیے کچھ کم اہم نہ تھیں۔ عربی شعراء اور تاجر

1۔ تنبیہ مسعودی ص ١٨٦۔

ہمیشہ ان کے دربار میں بھرے رہتے تھے اور غیر محسوس طور سے تاثر و تاثیر کرتے چلے جاتے تھے اور غالباً صحرا نشینوں سے اس مسلسل تعلق ہی نے باوجود عیش و ترفہ کے لخمی حکمرانوں میں بہت سی اچھی بدوی صفتیں مثلاً بات کا پاس اور ان کے لیے جان تک کی پروا نہ کرنا بہت کچھ برقرار رکھیں۔

عربی رضا کاروں کی وفاداری اور اطاعت شعاری نے رفتہ رفتہ دربار مدائن کو یہ بھلا دیا کہ حیرہ کمزور اور جونیر حلیف سہی، لیکن ماتحت اور غلام نہ تھا۔ مجوسی و مزدکی روایات نے عصمت و ناموس کا تصور ہی ایرانی دربار سے مٹا دیا تھا۔[1] اسی لیے انہوں نے اس میں کوئی بُرائی ہی نہیں سمجھی کہ ان ہی اصول کا اطلاق عرب حکمران کی بہو بیٹیوں پر کیا جائے۔ اس کے نتیجے سے سب واقف ہیں کہ حکمران حیرہ کو مدائن طلب کیا گیا۔ اور اس وفاشعار نے جانتے بوجھتے اس کی تعمیل کی، تو تحفظ عصمت کے جرم میں اس کا سر قلم کیا گیا اور نشۂ غرور میں چور شہنشاہ نے عاجز مملکت کو بھی فنا کر دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حیرہ میں ایرانی افسر آ دھمکے اور گو برائے نام ایاس بن قبیصہ نامی ایک عرب کو بھی وہاں کے عربوں کا سردار بنایا گیا، لیکن سلطنت حیرہ کا ایران سے الحاق کر کے ایک معمولی صوبہ بنا دیا گیا۔ یہ قصہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ حکمران حیرہ نے اپنے پاس کا بعض اماتی مال اصل مالکوں کو پہنچانے کے لیے بعض بدوی قبائل کے سرداروں کے سپرد کیا تو شہنشاہی حکام اس کی فوری حوالگی کے لیے پہنچے اور انکار پر سزا دہی اور عربوں کی بالکلیہ تباہی کے لیے ایک عظیم الشان ایرانی لشکر روانہ کیا گیا۔ مگر اب کی دفعہ قدرت نے ایران کو ایک تنبیہ کرنی چاہی اور ذی قار کی جھیل پر ان کی فوج کو جان پر کھیلے ہوئے بدوؤں نے کاٹ کر رکھ دیا۔ مگر دربار ایران نے بجائے سبق لینے اور اپنی اصلاح کرنے کے عربوں پر مزید ستم آرائی شروع کر دی۔ اور انہیں روز افزوں اپنا دشمن بنانا شروع کیا (اب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مدنی دور زندگی شروع ہو چکا تھا) اور خلافت صدیقی کے آغاز پر اسی ایرانی سرحد کے ستم رسیدہ مثنیٰ شیبانی کا ایران پر حملے کے لیے اپنا رضا کارانہ

---

[1] مزدک نے ملکۂ ایران کے متعلق بھرے دربار میں شہنشاہ سے جس بے باکانہ بے تحتی کا اظہار کیا تھا اس سے عربی خواں بے خبر نہ ہوں گے۔

خدمات کا پیش کرنا زیادہ تر ایران کی اسی عرب کش سیاست کا ردعمل تھا۔ اس واقعے سے چند ہی سال قبل یمنیوں کی دعوت اور تعاون سے ایرانیوں نے حبشیوں کو نکال کر یمن پر قبضہ کر لیا تھا اور وہرز کی فوجی گورنری کے بعد لائق باذان وہاں گورنر بنا لیکن پائے تخت ایران میں کچھ ایسی تیزی سے شاہ گردی ہو رہی تھی کہ مٹھی بھر ایرانی فوج کے لیے کسی مزید کمک کی غیر موجودگی میں یمن پر قبضہ رکھنا بڑا دشوار ہو گیا تھا۔

حیرہ اور یمن کے علاوہ مشرقی اور جنوب مشرقی عرب کے ساحلی علاقوں یعنی عمان اور اور الحساء میں بھی (جسے اُس زمانے میں بحرین کہا جاتا تھا) ایرانی اثرات مستحکم ہو گئے تھے۔ عمان جلندی بن المستکبر کا خاندان کسرائے ایران کی طرف سے حکمران نامزد ہوا تھا۔ جس کے کچھ حالات محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ء) نے اپنی مشہور کتاب المحبر (مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد) میں لکھے ہیں اور بعد میں اسی جلندی کے بیٹوں جیفر اور عبد سے جناب رسالت مآب صلعم نے تخاطب فرمایا تھا۔ عمان وسیع ملک ہے وہاں کے ایک اور عرب سردار ہوذہ بن علی کو کسرائے نے ایک جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی۔ اسی لیے اس کا لقب ذوالتاج یا صاحب التاج مشہور ہو گیا۔ (دیکھیے اشتقاق ابن دُرید ۲۰۹ عقد الفرید ابن عبدربہ جلد ۲ صفحہ ۶۷) الحساء میں کسی عرب ریاست کا بظاہر پتہ نہیں چلتا اور وہاں کے صدر مقام ہجر میں ایرانی فوجی گورنر (مرزبان) رہا کرتا تھا۔ بعض غیر موروثی عرب افسر بھی تھے۔

عرب مؤلفوں کے ہاں اس قسم کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں کہ فلاں عربی شیخ نے فلاں بادشاہ (کسریٰ، قیصر نجاشی وغیرہ) کے ہاں باریابی حاصل کی۔ ابن عبدربہ نے اس کا ایک مستقل باب (الوفادات) ہی قائم کیا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص سے خوشنودی کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ اس کی خواہش پر کسریٰ نے ایک مہندس (انجینئر) بھیجا جس نے وادی وج میں ایک فصیل دار قلعہ کیا جسے طائف کہنے لگے (کتاب الاغانی جلد ۱۲ صفحہ ۴۸-۴۹) اس کا استحکام کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ فتح مکہ و حنین کے بعد طائف کو اسلامی فوجوں نے آ گھیرا تھا۔ اور باوجود منجنیق اور دبابوں کے استعمال کے محاصرہ ختم ہوتا نہ نظر آیا۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید جانی نقصان نامناسب سمجھ کر محاصرہ اُٹھایا تھا۔

ابتدائے اسلام

ایران آتش پرست تھا انتہائی جنسی اباحیت رکی بھی تو حقیقی بہنوں اور صلبی بیٹیوں تک کو وہاں ازدواجی اغراض کے لیے محرمات میں نہیں شامل کیا جاتا تھا۔ غالباً اسی قسم کے معاملات ہوں گے جس نے مشرک عیسائیوں کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں مجوسیوں پر قابل ترجیح بنا دیا تھا۔ قرآن مجید کی سورۂ روم بھی ان ہی جذبات کی ترجمان ہے۔

ابن ہشام صفحہ ۲۷۸ وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت اور اسلام کی مدد کی ترغیب دیتے تو علاوہ اخروی روحانی ثواب کے وعدے کے یہ پیشگوئی بھی فرماتے کہ کسریٰ و قیصر کی دولت تمہارے قدموں پر نچھاور ہوگی۔ جنگ خندق میں سنگ مرمر کی چٹان کو توڑتے وقت چنگاریاں اڑنے پر اسی پیشگوئی کا اعادہ فرمایا گیا تھا۔ (دیکھو طبری وغیرہ)

تخمینی نقشہ سلطنت ایران بوقت آغاز اسلام



میں نے ایک مستقل مضمون میں اس پر تفصیل سے بحث کی[1] ہے۔ کہ ۶ھ کی صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کیوں کہا ہے اور کس لیے اسے اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی کامیابیوں کا شاہکار سمجھا جاتا ہے، مشہور عام خیال تبلیغ کی سہولت کچھ دل کو نہیں لگتا۔ یہاں اس کا دہرانا غیر ضروری ہے بہرحال اس صلح سے جہاں مسلمانوں کے ہاتھ کھل گئے اور وہ خیبر کے نمو پذیر خطرے کا دو ہی تین ماہ میں استیصال کرنے کے قابل ہو گئے، وہیں انہیں نینویٰ میں ایرانیوں کی بیزنطینیوں (رومیوں) کے ہاتھوں عہد آفریں شکست کے سلسلے میں بین الممالک صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا نینویٰ کی لڑائی شعبان ۶ھ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد صلح حدیبیہ ہوئی۔

بلاذری (فتوح صفحہ ۷۹) اور ابن الاثیر (کامل ۲/۱۷۵) نے بیان کیا ہے کہ ایرانی مقبوضہ بحرین کے ایک عربی النسل افسر منذر بن ساوی کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا خط ۶ھ ہی میں روانہ کیا تھا۔ غالباً کسرائے ایران کا خط بھی اسی نامہ بر کے ذریعے سے بھیجا گیا ہوگا جس نے بحرین کے حاکم سے خواہش کی کہ اسے کسریٰ کے پاس مدائن بھیج دے۔

یہاں اس کی غالباً ضرورت نہیں کہ وہ بحرین، عمان، یمن وغیرہ عرب کے جملہ ایرانی مقبوضات سے عہد نبویؐ میں جو اسلامی تعلقات رہے ان کی پوری تفصیل اور ان کا ارتقا بتایا جائے۔ ورنہ ان علاقوں کے ایرانی افسروں یا عرب شیوخ کے نام لکھے ہوئے کئی درجن نامہ ہائے نبویؐ تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ ایک منذر ہی کے نام کے نو خط ملتے ہیں جن میں بحرین کی سیاسیات کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ ان کے متن کے لیے میری حقیر تالیف "الوثائق السیاسیۃ" دیکھی جا سکتی ہے۔ (جس کی طباعت کے بعد اوائل ۱۳۶۱ھ میں کتب خانہ خدا بخش مرحوم پٹنہ میں قبیلہ عبدالقیس سے کیا ہوا ایک اور معاہدہ کتاب وسیلۃ المتعبدین میں دستیاب ہوا ہے یہاں صرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت پر کچھ بحث کی جائے گی۔ جس میں متعدد گتھیاں سلجھائی ہیں۔

تمام اسلامی مورخوں محدثوں اور دیگر مؤلفوں نے متفقہ طور سے بیان کیا ہے کہ صلح

۱۔ دیکھئے رسالہ سیاست حیدرآباد دکن۔ اپریل ۱۹۳۲ء نیز مجموعہ ہذا۔

حدیبیہ کے بعد ہی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے نام اسلام کے تبلیغی خطوط بھیجے تو ان میں سے ایک کسرائے ایران کے نام بھی تھا۔ اس کا متن جس میں کچھ لفظی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں یہ ہے۔

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے سردار ایران کسریٰ کے نام۔

۳۔ ہدایت پر چلنے اور خدا اور رسول پر ایمان لانے والے کے لیے سلامتی ہو۔

۴۔ میں تجھے خدا کا بلاوا دیتا ہوں کیونکہ مجھے خدا نے تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔

۵۔ تاکہ میں ہر زندہ شخص کو ڈراؤں، کافروں کے متعلق خدا کی بات پوری ہو کر رہے گی۔

۶۔ اسلام لا سلامت رہے گا۔

۷۔ اگر تو انکار کرے تو تمام مجوسیوں کا وبال تجھی پر پڑے گا۔

یہ تین مختلف تاریخوں میں لفظی اختلاف کے ساتھ روایت ہوا ہے۔ اہم تر یہ ہے۔

۱۔ بعض روایتوں میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' حذف ہو گیا ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ حذف عبارت کا عام رواج رہا ہے۔

۲۔ قلقشندی نے ابو ہلال عسکری سے یہ متن نقل کیا ہے، صرف اسی ایک روایت میں ''کسریٰ ابرویز عظیم فارس'' کے الفاظ ہیں اور باقی کسی نے بھی پرویز کا نام نہیں لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرویز کا نام بھی کا قیاسی اضافہ ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۔ میں طبری کی ایک روایت میں وشھدأن لاالہ الااللہ وحدہٗ لاشریک لہ وان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ کے الفاظ زائد ہیں جو اصل فقرے کی صرف شرح معلوم ہوتی ہے۔

۴۔ میں دعاء اللہ اور دعایہ اللہ کی روایتیں عام ہیں۔ رسالات نبویہ مؤلفہ عبدالمنعم خاں ٹونکی نے دعاء الاسلام کہیں سے نقل کیا ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔

۵۔ میں قرآنی آیت کے لحاظ سے بعض روایتوں میں ''لینذر'' بھی مروی ہے جو عربی کے لحاظ سے ذرا تکلف سے ٹھیک ہوگا۔

۶۔ میں ''فان'' کی جگہ ''وان'' اور اسی طرح ''ابیت'' کی جگہ ''تولیت'' نیز ''اثم المجوس

علیک'' کی جگہ ''علیک اثم المجوس'' وغیرہ فرق بھی ملتے ہیں جو روایت بالمعنی کا نتیجہ ہیں۔ ان سے مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرض یہ خط عبداللہ بن حذافہ اسہمی بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے تھے۔ یہ ٹھیک طور سے نہیں معلوم ہوتا کہ آیا عبداللہ بن حذافہ ہی مداین گئے تھے، یا حاکم بحرین نے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ اسے پایہ تخت روانہ کیا تھا بہرحال تمام اسلامی مؤلف بیان کرتے ہیں کہ کسریٰ (خسرو پرویز) نے طرز تخاطب دیکھتے ہی پورا خط پڑھے بغیر چاک کر دیا۔ اور نامہ بر کو سامنے سے نکلوا دیا۔ اس کے علاوہ یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسریٰ نے یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ دو آدمی مدینہ روانہ کرے اور نبی عربی کو برضا مندی ورنہ بجبر گرفتار کر کے مداین روانہ کرے۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ آج رات میرے رب نے تمہارے رب کا قتل کر دیا۔ اس پر وہ یمن چلے آئے اور جلدی ہی مداین سے کسریٰ شیرویہ نے سرکاری اطلاع بھیجی کہ اس نے مصلحت عامہ کے تحت اپنے باپ کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اور کہتے ہیں کہ شیرویہ کی پدرکشی کی تاریخ وہی ہے جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور اس معجزہ کو دیکھ کر باذان اور بہت سے یمنی مسلمان ہو گئے۔

یہ واقعہ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۶۴۳ پر مذکور ہے اور بظاہر ابن اسحاق کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ ابن ہشام نے زہری کی روایت خود اضافہ کی ہے۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۹۷۱ میں جہاں بادشاہوں کے نام خطوط کا ذکر ہے۔ وہاں کسریٰ کے سلسلے میں یہ قصہ بیان نہیں ہوا ہے تاریخ طبری صفحہ ۱۵۷۲ تا ۷۴ میں جہاں اس سفارت کا ذکر ابن اسحاق کے حوالے سے نقل ہوا ہے، وہیں زہری کی روایت صرف اتنی بیان ہوئی ہے کہ کسریٰ کے نامہ مبارک پارہ پارہ کر ڈالنے کی اطلاع ملی تو آنحضرت صلعم نے فرمایا خدا اُس کے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے اور طبری نے شیرویہ کی پدرکشی کا قصہ زہری کے اس قطع کلام کے بعد یزید بن حبیب کی روایت کی بنا پر نقل کیا ہے اور وہاں زہری کا اس سے تعلق نہیں ہے۔

اس اختلاف کو ہم کوئی خاص اہمیت عام حالتوں میں نہیں دیتے۔ لیکن طبری نے جہاں یہ قصہ ۶ھ کے حالات حدیبیہ کے بعد بیان کیا ہے، وہیں ایران قدیم کے حالات میں صفحہ

۱۰۰۹ پر یہ جملہ بھی عکرمہ کے حوالے سے ایک غیر مربوط قصے کے آخر میں لکھا ہے۔

> چنانچہ خدا نے کسریٰ کو ہلاک کر دیا اور اس کی اطلاع جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ کے دن پہنچی جس سے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو خوشی ہوئی۔

جب خسرو پرویز کے مرنے کی اطلاع حدیبیہ کے دن آ چکی تھی تو پھر بعد میں پرویز کے نام خط لکھنا اور پدرکشی کی اطلاع بطور معجزہ دینا سب بے بنیاد قصے بن جاتے ہیں۔ کثیر نویسی کی وجہ سے طبری کے ہاں بلاتنقید متضاد روایات کا آ جانا اور روایات میں بھی بے احتیاطی سے قطع و برید ہو جانا ایک معروف واقعہ ہے۔

اسی بنا پر ابونعیم کی دلائل النبوۃ (جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۴۴) کی یہ روایت خاص توجہ کی مستحق ہے کہ:

> ''رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی دن شکست ہوئی تھی جس دن حدیبیہ کی صلح ہوئی اور جب اس کی اطلاع پہنچی تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی خوشی ہوئی۔ (کہ قرآن مجید کی سورۂ روم کی کئی سال قبل کی پیشینگوئی پوری ہو گئی)

نینویٰ کی لڑائی شعبان ۶ھ (دسمبر ۶۲۷ء) میں ہوئی تھی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا عام طور سے اسلامی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ مہم حدیبیہ کے لیے مسلمان مدینے سے ذی قعدہ ۶ھ میں نکلے۔ لیکن امام ابو یوسف نے کتاب الخراج صفحہ ۱۲۸ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے لیے رمضان میں نکلے۔ تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ جلد ۴ صفحہ ۱۶۴) میں حدیبیہ کے ذی قعدہ میں پیش آنے کا ذکر کر کے اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ عروہ کے بیان کے مطابق صلح حدیبیہ ماہ شوال میں منعقد ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمانے کی تاریخیں نہ تو بیزنطینیوں کے ہاں محفوظ رہیں، نہ ایرانیوں کے ہاں، اور نہ حبشیوں کے ہاں۔ ان حالات میں ایک واحد استثناء خاص توجہ کا محتاج ہے۔ وہ یہ کہ قیصر ہرقل اور کسریٰ پرویز میں جب آخری فیصلہ کن لڑائی شروع ہوئی تو قیصر میدان جنگ سے وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خط روانہ کرتا رہا۔ اتفاق سے یہ اب تک محفوظ تو ہیں اور

انہیں میں سے ایک میں قیصر نے اپنے بیٹے کو لکھا ہے کہ خبر آئی ہے کہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے ۲۷ فروری ۶۲۸ء کو قتل کر ڈالا ہے[1] (جو وسط رمضان کے مطابق) قرائنی شہادت قیصر کے اس خط کی صحت کی تائید کرتی ہے۔ شعبان میں نینویٰ میں فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد وسط رمضان میں اس کا مارا جانا کوئی تعجب کا حامل نہیں اور بظاہر قیصر کو اس واقعے کے بیان کرنے میں عمداً جھوٹ پر آمادہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اسی وجہ سے واقدی کا یہ بیان کرنا کہ:۔

> ''شیرویہ نے اپنے باپ کسریٰ کو منگل کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا جبکہ چھ گھڑی رات گزر چکی تھی۔ (تاریخ طبری صفحہ ۲ ۱۵۷)''

اپنے اندر مقابلۃً کم کشش رکھتا ہے۔ غرض اس وقت جو گتھیاں نظر آتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

واقعہ	طبری کی روایہ	ابونعیم	ابو یوسف	واقدی	ابن کثیر کی روایہ	قیصر کا خط یونانی تاریخ میں	عام مورخین
نینویٰ میں ایرانی شکست	•	•	•	•	یوم الحدیبیہ	•	شعبان
کسریٰ پرویز کا قتل بیٹے کے ہاتھ	یوم الحدیبیہ	•	•	۱۰ جمادی الاولیٰ سنہ ۷ھ	•	وسط رمضان سنہ ۷ھ	حدیبیہ کے کئی ماہ بعد تقریباً ربیع الثانی یا جمادی الاولیٰ میں
اس قتل کی اطلاع کا جناب رسالت مآب کو پہنچنا		یوم الحدیبیہ	•	•	•	•	ذیقعدہ سنہ ۶ھ تقریباً اواخر
حدیبیہ کے لئے روانگی	•	•	رمضان سنہ ۶ھ	•	•	•	ذیقعدہ یا اوائل ذی الحجہ سنہ ۶ھ
صلح حدیبیہ					شوال سنہ ۶ھ		

1۔ قیصر ہرقل کی جنگوں کے متعلق بھی بڑی پیچیدگیاں ہیں، اس موضوع پر سب سے مستند کتاب جرمن زبان میں گیرلانڈ (Gerland) کی ہے جس کا نام قیصر ہرقل کی ایرانی مہمیں "Persische Feldzuge Des Kaisers Heraklius" ہے یہ واقعہ اس کتاب میں یونانی مورخ تیوفان کے حوالے سے نقل ہوا ہے۔

ان میں ممکن ہو تو باہم تطابق دینے ورنہ کسی ایک کے بیان کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے لیکن اس طرف توجہ کرنے سے قبل دو اہم امور بطور تمہید ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد نے سیرۃ نبویہ کے واقعات کو کبھی تو ہجری [۱] سے بیان کیا ہے۔ اور کبھی ہجرت کے وقت [۲] سے اور سب جانتے ہیں کہ ہجرت ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی اور سنہ ہجری اس کے کوئی دو ماہ اٹھارہ دن قبل یکم محرم سے شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مثلاً جنگ بدر کا ذکر کرنا ہو تو ماہ نہم (رمضان) ۲ھ یا ہجرت سے ایک سال چھ ماہ بعد کہنا پڑے گا۔ واقدی نے کسی ایک طریقۂ شمار کا چونکہ شروع سے آخر تک لزوم نہیں رکھا ہے، اس لیے من الہجر (ہجرت کے وقت سے) اور للہجرۃ (ہجری سنہ سے، کہنے میں با سانی خلط ملط ہو سکتا ہے۔ مزید برآں اگر راوی کی طرف روایت پہنچی ہو اور اس سے بالمشافہہ جرح اور تعین کا موقع نہ ہو اور راوی نے ہجری سنہ مراد لیا ہو، اور واقدی نے وقت ہجرت سے مدت مراد ہوئی سمجھی ہو، تو دانستہ تین ماہ کا بڑی آسانی سے فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ خاص کر اس لیے کہ واقدی نے مہینے کا نام لینے کے بجائے اکثر مہینوں کی گنتی دی ہے کہ ہجرت کے اٹھارہ یا بیس مہینوں بعد وغیرہ۔

۲۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی حجہ ۱۰ھ میں سال کبیسہ کو عربی مہینوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا اور خطبۂ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت انما النسیء زیادۃ فی الکفر الآیہ کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا کہ زمانہ چکر کھا کر پھر وہی شکل اختیار کر چکا ہے جیسا خلقت آسمان و زمین کے وقت تھا۔

(سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۹۶۸ تاریخ طبری صفحہ ۱۷۵۴ وغیرہ)

اور متفقہ طور سے اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع ہو گئے تھے۔ قمری اور کبیسہ مہینوں کے متعلق عربی مورخوں نے جو بیانات چھوڑے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر تیسرے سال

۱۔ یا اولین مسلمان مہاجرین مکہ کی مدینہ روانگی یعنی ماہ محرم سے بلکہ شاید وسط ذی حجہ سے۔

۲۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد مدینہ یعنی ماہ ربیع الاول سے۔

قبیلہ بنی فقیم کا سردار (جس کا لقب قلمّس ہوا کرتا تھا) حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص رسم کی انجام دہی کے ذریعے سے اعلان کرتا تھا کہ اب جو ذی حجہ چل رہا ہے اس کے بعد نیا چاند نظر آئے گا تو وہ محرم الحرام کا نہ ہوگا (بلکہ ایک گمنام اور غیر محترم مہینہ ہوگا) اور اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرم کا ہوگا (جدید علم ہیئت بھی یہی کہتا ہے کہ قمری سال میں شمسی سال سے دس دن کم ہوتے ہیں اور ہر تیسرے سال ایک مہینے کا فرق پڑ جاتا ہے) اس بیان کے بموجب اگر ۱۰ھ میں دونوں قسم کے مہینے یکجا ہو گئے تھے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ:

سنہ ۶		سنہ ۷		سنہ ۸		سنہ ۹		سنہ ۱۰	
ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری ثانی	کبیسہ مکی	ہجری ثانی	کبیسہ مدنی	ہجری ثانی	کبیسہ مکی	ہجری ثانی	کبیسہ مکی
محرم	ربیع ۱	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	محرم
صفر	ربیع ۲	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	صفر
ربیع ۱	جمادی ۱	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۱
ربیع ۲	جمادی ۲	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادیٰ	ربیع ۱	جمادیٰ	ربیع ۲	ربیع ۲
جمادی الاول	رجب	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	شعبان	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	رمضان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	رجب
شعبان	شوال	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شعبان
رمضان	ذیقعدہ	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	رمضان
شوال	ذی حجہ	شوال	ذیقعدہ	شوال	ذیقعدہ	شوال	ذیقعدہ	شوال	شوال
ذیقعدہ	×	ذیقعدہ	ذی حجہ	ذیقعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذیقعدہ	ذیقعدہ
ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	×	ذی حجہ	ذی حجہ

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ذی قعدہ ۶ مکی میں جب صلح حدیبیہ ہوئی تو رمضان ۶ھ چل رہا تھا اور اس طرح عروہ کا یہ کہنا کہ مہم حدیبیہ شوال میں ختم ہوئی یا امام ابو یوسف کا کہنا کہ حدیبیہ کے لیے مسلمان مدینے سے رمضان میں نکلے تھے، اور عام مورخین کا اس واقعہ کا ذیقعدہ

میں قرار دینا ان میں باہم کوئی تضاد نہیں۔ چونکہ اس وقت تک سال کبیسہ منسوخ نہیں ہوا تھا اور مکے پر قریش ہی قابض تھے، اس لیے ان کے حج کا موسم ان کے ذی قعدہ سے شروع ہوا تھا حالانکہ خالص قمری حساب سے ابھی رمضان ہی کا مہینہ چل رہا تھا۔

سنہ ہجری اور وقت ہجرت کے فرق کے تین مہینے اور قمری اور کبیسہ سالوں ۶ ھ میں فرق کے تین مہینے جملہ چھ مہینوں کا فرق، یہ بڑی آسانی سے واقدی کی اس روایت کی توجیہ کر دیتا ہے کہ پرویز کا قتل ذی قعدہ (کی) کی جگہ جمادی الاولیٰ میں کیوں بیان کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں راوی نے کہا ہوگا کہ سنہ ہجرت کے اکہترویں مہینے میں اور واقدی نے وقت ہجرت (ربیع الاول) سے حساب کیا اور نہ تو دو کبیسہ سالوں کا خیال رکھا اور نہ ہجرت اور سنہ ہجری کے فرق کے لحاظ کیا۔ اور سنہ ہجرت کے اکہترویں مہینے ذی قعدہ ۶ ھ کی کی جگہ جمادی الاولیٰ ۷ ھ بیان کر دیا۔

واقدی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ خسرو پرویز کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارے جانے کی تاریخ انہیں کس ماخذ سے معلوم ہوئی۔ اگر اس تاریخ کے متعلق یونانی مورخ کا بیان (خود قیصر ہرقل کے خط کی بنا پر) صحیح مانا جائے تو یہ واقعہ ۲۷ فروری ۶۲۸ء (مطابق وسط رمضان ۶ ھ م وسط ذی قعدہ ۶ ھ کی) کو ہوا ہوگا۔ اور یہ روایت قطعاً رد کر دینی پڑے گی کہ کسریٰ کے حکم سے جب یمن سے دو ایرانی افسر مدینے آئے تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ "آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا۔" اور یہ کہ اس پیشگوئی یا غیب گوئی کے صحیح ثابت ہونے پر گورنر یمن مع حوالی موالی مسلمان ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اپنی عظمت کی برقراری کے لیے ایسے کسی معجزے کی محتاج نہیں خاص کر جبکہ اس معجزے کا حال کچھ بہت زیادہ مستند ذرائع سے بھی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے متعلق خود غریب مؤلف متضاد باتیں بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر واقدی کی روایت کہ یہ قتل ۱۰ جمادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مانی جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پرویز کے قتل کی جو تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

اسی لیے طبری کی روایت کہ کسریٰ کے قتل کی اطلاع حدیبیہ کے دن آئی اصل میں اس روایت کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو ابونعیم نے بیان کی ہے۔ کہ نینویٰ کی شکست کی خبر حدیبیہ[1]

1۔ گو ابونعیم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نینوا کی شکست ہی حدیبیہ کے دن ہوئی۔

کے دن آئی۔ اور اس میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ یہ حدیبیہ سے مہینہ بھر پہلے کا واقعہ تھا اور اس عرصے میں ایران کی خبر اس زمانے میں مکے تک آ سکتی تھی۔

مجھے اپنے ان اخذ کردہ نتائج پر اصرار نہیں ہے اور اگر کوئی اہل علم ان کی اصلاح کر سکیں اور گتھیوں کو سلجھا سکیں تو سیرۃ نبویہ کی ایک الجھن رفع ہو سکے گی۔ واللہ الھادی الی الصواب وھو ملوافق والیہ لمآب۔

تتمہ

جیسا کہ عرض کیا گیا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے "کسریٰ عظیم الفرس" کے نام خط روانہ فرمایا تھا۔ ابوہلال عسکری کی روایت کہ خط میں "کسریٰ ابرویز" لکھا ہوا تھا ممکن ہے کہ صحیح ہو اور باوجود پرویز کے قتل ہو چکنے کے اس کی اطلاع اس وقت تک مدینہ منورہ نہ آئی ہو لیکن پرویز کے قتل کے بعد مدائن میں جو شاہ گردی شروع ہوئی اس کے باعث یہ نہیں معلوم کہ وہ نامۂ مبارک دراصل کس نے وصول کیا بہر حال ایران کی پریشان صورت حال کے باعث جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست ایرانی مقبوضات عرب کے افسروں سے مخاطبت شروع فرمائی چونکہ ان منتظمی بھر ایرانیوں کو اب مدائن سے کسی کمک اور مدد کی توقع نہ رہی تھی جیسا کہ طبری نے (تاریخ صفحہ ۱۹۹۰ میں) بیان کیا ہے کہ کم از کم یمن میں ایک وطنیت پسند تحریک زور و شور سے اٹھ چکی تھی کہ مداخلت کنندہ ایرانی غیر ملکیوں کو نکال باہر کیا جائے، اس لیے علاوہ اور اسباب کے کوئی تعجب نہیں کی اپنی جان و مال کے اس خطرے کو دیکھ کر ان ایرانیوں نے اسلام قبول کرنے اور حکمران عرب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت حاصل کرنے کی جانب ترغیب پائی ہو۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ یمن، عمان، بحرین وغیرہ کے ایرانی مقبوضات دیکھتے کے دیکھتے مدائن سے ٹوٹ کر مدینے سے جڑ گئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست خارجہ کچھ اتنی کامیاب ہو رہی تھی کہ ماتحی علاقوں کے لیے مدائن کو فکر ہونے لگی۔ چنانچہ چند ہی دنوں بعد جب قسمت نے بوزان دخت کو تخت کیانی پر پہنچایا تو اس نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحفے تحائف بھیج کر دوستی کی طرح ڈالنی چاہی (جیسا کہ تاریخ طبری صفحہ ۳۱۶۳ میں صراحت سے اور ترمذی شریف جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۹۶ باب قبول الھدایا میں بلا صراحت نام اس کا ذکر ملتا ہے)

ضمیمہ

نسی کے متعلق عرب مؤلفوں میں سے البیرونی وغیرہ بعض یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سال قمری کو سال کبیسہ بنانے کا نام ہے تو بعض مؤلف یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ شہر حرم کی طوالت سے گھبرا کر غیر حرام مہینہ بیچ میں شامل کیا جانے کا نام تھا تا کہ اس زمانے میں لوٹ مار کی جا سکے۔ غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''نسی'' کی موت کے کئی سو سال بعد جب خالص قمری سنہ میں پلے ہوئے بعض عرب مؤلف اس کو سمجھ نہ سکے اور جس طرح قمری و شمسی سال میں سالانہ دس دن کا فرق قدیم زمانے میں عام بدویوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور وہ قلمس کی کبیسہ گری کو محض یہ سمجھتے تھے کہ مسلسل تین حرام مہینوں کی دل برداشتہ کرنے والی طوالت کو توڑنے کے لیے ایک غیر حرام مہینہ لایا گیا ہے، بالکل اسی طرح انہیں بدویوں کی اولاد اور ان کی کہاوتوں اور روایتوں کے حامل مسلمان علماء بعد کو زیادہ غور کیے بغیر بدویوں کی روایتوں کو اسلامی ادبیات میں شامل کرنے لگے۔ نسی کے متعلق سویڈن کے پروفیسر موبرگ (Moberg) نے جرمن زبان میں ۱۹۳۱ء میں جو مقالہ لکھا ہے وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر تشفی بخش ہو لیکن مواد اور حوالوں کے اعتبار سے بہت مفید ہے۔ اس کا خلاصہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں بھی دیا گیا ہے۔

عہد نبوی میں یہود

(۱)

پس منظر

موجودہ دنیا کی خونی یا نسلی اساس پر بنی ہوئی قوموں میں یہود ایک بہت پرانی قوم ہے، جس کا اپنا تمدن، جس کے اپنے ادبیات اور جسکی اپنی تاریخ موجود ہے۔ اگر ان کو حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی اولاد مانا جائے تو یہ لوگ نمرودوں کے ظلم سے تنگ آ کر بابل یعنی عراق سے کنعان یعنی فلسطین و شام آ بسے تھے۔ پھر حضرت یوسفؑ کے زمانے میں مصر پہنچے جہاں کہتے ہیں کہ اس زمانے میں شامی نسل کا ایک خانوادہ فرعونیت کر رہا تھا۔ حضرت یوسفؑ کا جلد ہی عزیز مصر اور مختار کل وزیر بن جانے میں ان وجوہ سے زیادہ دشواری نہ تھی۔ چند نسلوں بعد شاہ گردی ہوئی اور ایک مصری خانوادہ برسر اقتدار آ گیا تو سابق کے منظور نظر اب معتوب اور رفتہ رفتہ مقہور بن گئے۔

فرعون رعمسیس[۱] کے زمانے میں یہ حضرت موسیٰؑ کی رہنمائی میں اجتماعی طور پر مصر کو خیر باد کہتے اور ارض مقدس (فلسطین) کا رخ کرتے ہیں۔ صحف موسیٰ یعنی توریت کے کتب خمسہ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ باقی توریت بعد کے دیگر انبیاء وغیرہ کی طرف منسوب ہے۔ اس سے خاص کر صحیفۂ اشوئیل کے موجودہ نسخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ارض مقدس

۱۔ رعمسیس بہ ظاہر لقب ہے۔ اس کا نام میامون نیز عیسوسترس مشہور ہے۔ یہ ۱۳۳۰ ق م کے لگ بھگ اپنے باپ سیتی اول کا جانشین ہوا۔ اور ۱۲۶۰ تا ۱۲۰۰ ق م میں کسی وقت غرق بحر ہوا۔ اس کی موسیائی ہوئی لاش ۱۸۸۱ء میں دستیاب ہوئی۔

کی پرانی آبادی پر (جو عمالقہ قبائل کے عربوں پر مشتمل تھی) کچھ اتنے مظالم کئے کہ انسانیت کو گھن آتی ہے۔ دودھ پیتے بچوں تک کو جیتا نہ چھوڑا۔ یہی یہودی تھے جن کے باعث خانہ جنگی بھی پھیلی۔ لاتعداد انبیاء و مصلحین بھی اپنوں ہی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

چنانچہ طالوت (یعنی بادشاہ) ساول کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نے حکومت الٰہی چلائی۔ پھر خانہ جنگی ہوکر یہودی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ کبھی عراق نے مشرق سے اور کبھی شام نے شمال سے ان کی بستیوں پر حملہ کیا اور یہ وہاں سے خارج البلد ہوکر تتر بتر ہوئے تو اس کے مرابعانہ اثرات ہزاروں برس گزر جانے کے بعد آج تک جاری ہیں۔

قبل بعثت

عہد نبوی کے آغاز پر یہودی ہم کو عرب کے ہر حصے میں ملتے ہیں۔ ٹھوس بستیوں میں بھی، اکّے دکّے بھی بلکہ بستیوں کا ایک زنجیرہ نظر آتا ہے جو ایلہ (عقبہ) مقنا، خیبر، وادی القریٰ، تیمار، فدک، مدینہ، یثرب اور طائف و جرش سے لے کر یمن اور عمان و بحرین تک عرب میں شمالاً جنوباً چلا گیا تھا۔

مکے میں یہ کم نظر آتے ہیں۔ البتہ میلوں میں جو مکے کے آس پاس بہ کثرت ہوتے تھے (جیسے عکاظ، منا، مجنہ، ذوالمجاز وغیرہ) یہ پیسے کمانے کے قسم قسم کے ڈھنگ اختیار کرتے تھے۔ غیب دانی کے دعویدار قسمت بتانے والے کاہن، عراف، وغیرہ زود یقینوں کے لیے دلجمعی تو بےفکروں کے لیے دل بہلائی کا سامان مہیا کرتے تھے۔ اور ان پڑھ بدویوں کی نظر میں لکھنے پڑھنے والے (اہل کتاب) ہونے کی حیثیت سے بڑا احترام رکھتے تھے۔

مشرق و مغرب[1] اب سب جگہ مسلم ہے کہ عہد نبویؐ کے آغاز کے لگ بھگ زمانے میں اہل کتاب ایک بڑے انسان، ایک آخری تسلی دہندے کے انتظار میں تھے۔ لیکن سیرت نبویہ کے طالب علم کو عجیب پیچیدہ اور متضاد و متصادم واقعات سے سابقہ پڑتا ہے جن کا حل آسان نہیں۔ ایک طرف قبل بعثت زمانے میں مدینے کے یہود اپنے ہم شہری عربوں کو طعنے اور دھمکیاں دیا کرتے تھے کہ مسیحا اب آنے والا ہے۔ اور یہ کہ وہ اس کا ساتھ دے کر اپنے دشمنوں

ا۔ مثلاً کاسانوواکی کتاب "محمدؐ اور دنیا کا اختتام" (فرانسیسی) صفحہ ۲۸ نیز انجیل یوحنا $\frac{1}{11}$ ۔۲۳۔

کی سرکوبی کریں گے۔ دوسری طرف ایسے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں کہ جن میں یہودی ہی مسیحائے منتظر کے قتل کے درپے نظر آتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دودھ پلائی بی بی حلیمہ کی گود میں ایک میلے میں جاتے ہیں۔ ایک یہودی فال گو آپ کو دیکھ کر شور مچاتا ہے کہ یہودیو، دوڑو، اس بچے کو قتل کرو۔ یہ تمہارا استحصال کرے گا۔ یا آپ نو عمری میں اپنے چچا کے ساتھ تجارتی کاروان میں فلسطین جاتے ہیں۔ وہاں عیسائی راہب انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ مزید آگے نہ بڑھیں۔ یہود اس بچے کے دشمن ہیں۔ دیکھ پائیں اور پہچان لیں تو جان کے لالے پڑ جائیں وغیرہ۔

آغاز تبلیغ

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو عام انسانوں کے لیے نیز قیامت تک اسوہ حسنہ بننا تھا۔ اسی لیے خدا نے آپ کو عالم اسباب کا پابند رکھا۔ اور باوجود آپ کے مخاطب سارے جن و انس ہونے کے آپ کی شخصی ذمہ داری محدود رہی۔ بالکل ابتدائی زمانے میں اپنے ملنے جلنے والوں کو اسلام کی دعوت دینے کا حکم ہوا۔ پھر راز داری کو ختم کرنے اور سب کو برملا تبلیغ کی ہدایت ملی اور مکی زندگی میں بہر حال آپ کا ذاتی ذمہ داری وہی تھی جو قرآن نے بیان کی ہے کہ لِتُنذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (مکہ اور اس کے اطراف و حوالی کو خدا کی نافرمانی کے انجام سے ڈرائیں) کیا اس علاقے میں یہود بستے تھے؟ عرب مورخ بھی اس سے انکار کرتے ہیں اور قرآن مجید کی اندرونی شہادت بھی اس کے خلاف ہے۔

چنانچہ ہجرت مدینہ سے قبل جو (۸۶) سورے نازل ہوئے ہیں ان میں یہودیوں سے براہ راست تخاطب کہیں نہیں ہے۔ "یا بنی اسرائیل" کا جملہ سب سے پہلے[1] ترتیب نزولی کے لحاظ سے سورہ ۸۷ یعنی بقرہ میں ملتا ہے جو ہجرت کے بعد نازل ہونے والے سوروں میں پہلا ہے۔ ورنہ اس مکی دور میں "یا بنی آدم" اور "یا ایھا الناس" ہی کا استعمال ہے۔

ترتیب نزولی کی یادداشت سامنے رکھ کر قرآن مجید کا کئی دن مطالعہ کرنے پر جو انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلی آیت جس میں یہودیوں کا بالواسطہ ہی سہی، ذکر

ا۔ قرآن ۸۰/۲۰ میں یہ لفظ آنحضرت کے خطاب کے طور پر نہیں بلکہ نقل حکایت کے طور پر آیا ہے۔

ہے وہ سورۂ مزمل کی ہے کہ 'انّا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسول (۱۵/۷۳ مابعد) یہاں یہودی قوم کا کوئی ذکر نہیں یہودیوں کے سب سے بڑے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے، اور اپنی ان سے مشابہت کا کہ خدا نے فرعون (رعمسیس) کی ہدایت کے لیے ایک رسول بھیجا، اور نہ ماننے پر سخت سزا دی۔ اسی طرح تمہاری (مکّہ والوں کی) طرف بھی ایک رسول آیا ہے۔

اس کے بعد سورۂ اعلیٰ اُترتی ہے کہ "آخرت زیادہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے بے شک یہ گزشتہ صحف مقدسہ میں (یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں بھی) ہے" (۱۷تا۱۹/۸۷) پھر یہود تو نہیں البتہ ان کی ایک نئی شاخ (یعنی نصاریٰ) کا لطیف ذکر سورہ قل ھواللہ (۱۱۲) میں آتا ہے اور ان کے بنیادی عقیدے کی تردید کی جاتی ہے کہ خدا کے کوئی اولاد ہو۔ اور بار بار ذکر آتا ہے تو فرعون کا اور اس کے بُرے انجام کا (فجر ۱۰/۸۹ بروج ۱۸/۸۵ ق ۱۳/۵۰ قمر ۴۱/۵۴ ص ۱۲/۳۸) یہ ترتیب نزول سے درج ہیں۔

سورۂ تین (۹۵) میں طور سینین کا محض ضمنی ذکر ہے۔

سورۂ ص (۳۸) بہ کثرت انبیاء کا ذکر ہے۔ انہیں میں حضرت داؤد، سلیمان، اور ایوب علیہم السلام کے یہود میں مبعوث ہونے کا ذکر ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود کو بھی اسی طرح کا ایک نبی اور ایک رسول ظاہر فرماتے ہیں۔

یہود کا مکّی سورتوں میں تفصیلی اور اہم ذکر پہلی مرتبہ سورۂ اعراف میں ملتا ہے (جو تدوین کے لحاظ سے سورۂ ۷ ہے۔ لیکن نزول کے لحاظ سے ۳۹) اس سورت کی ان آیتوں کو نظر انداز کر دیں جو بہ اتفاق مدنی ہیں اور جن میں یہود کو عہد بعہد مختلف ملکوں میں مذہبی ایذا رسانیوں کی پیشن گوئی ہے (۱۶۳ تا ۱۷۰/۳۹) تو باقی مکّی سورت میں بنی اسرائیل کا قصہ کافی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ان کا فرعون سے نجات پانا اور ارض مقدس کے راستے میں کوہ طور پر الواح توریت سے حضرت موسیٰ کا سرفراز ہونا وغیرہ بیان ہونے کے بعد توریت و انجیل میں بھی رسولؐ عربی کی پیشینگوئی کا دعویٰ دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے جو یہ ہے:

"اور موسیٰ نے اپنے قوم کے لیے ستر آدمیوں کو ہمارے مقرر کردہ وقت کے لیے چن لیا۔ جب ان لوگوں کو زلزلے نے دھر لیا تو کہا میرے رب تو

چاہتا تو پہلے ہی ان کو ہلاک کر سکتا اور مجھے بھی۔ کیا تو ہم کو ہمارے میں کے احمقوں کے کرتوتوں کی بنا پر ہلاک کرے گا؟ یہ تو تیری ہی آزمائش ہے۔ اُس سے تو جس کو چاہے بھٹکاتا ہے اور جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے۔ تو ہمارا والی ہے اس لیے ہم کو معاف کر دے۔ اور ہم پر رحم کر کہ تو معاف کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔

اور لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی ہم تیرے ہی پاس توبہ کرتے ہیں۔

(خدا نے) کہا میرا عذاب، میں وہ جسے چاہوں پہنچاتا ہوں۔ اور میری رحمت ہر چیز کو سماتی ہے۔ پس میں یہ (رحمت) ان لوگوں کے لیے لکھتا ہوں جو تقویٰ کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ یعنی:

جو لوگ رسول نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں جو ان کو بھلی بات کا حکم دیتا ہے۔ اور ان کو ناپسندیدہ بات سے روکتا ہے اور ان کے لیے اچھی چیزیں حلال کرتا ہے اور بُری چیزیں اُن پر حرام کرتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اور بندشیں جو کہ ان پر تھیں گراتا ہے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدافعت کریں اور اس کی مدد کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اُس کے ہمراہ اُتری ہے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

کہہ اے لوگو! میں تم تمام کی طرف اس خدا کا بھیجا ہوا ہوں کہ آسمانوں اور زمین کا مالک اسی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ حیات بخشتا اور موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی اُمّی پر جو خود بھی اللہ اور اس کے کلموں پر ایمان لاتا ہے۔ اور اسی کی پیروی کرو تا کہ تم صحیح راہ پاؤ۔

اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ حق کے ذریعے سے رہبری کرتا ہے اور اسی کے ذریعے سے انصاف کرتا ہے۔" ۱۵۵ تا ۱۵۹/۷

ان آیتوں کا شان نزول تو صراحت سے کتب تفسیر و حدیث میں مجھے نہ ملا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکے والے جب بیرون کا سفر کرتے، مثلاً طائف، یمن، مدینہ، خیبر، عراق، شام، مصر وغیرہ اپنے شہر کی "نبا عظیم" سناتے کہ ان کے شہر میں ایک شخص (اللہ کا رسول ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے تو ان مقاموں کے یہود اور عیسائی "جتنے منہ اتنی ہی باتیں" یا "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" رائے زنی کرتے اور اعتراف وجوابات سمجھاتے سورۂ ہذا (اعراف) میں پہلے تو تبلیغ و ہدایت کا بنیادی استدلال تفصیل سے دہرایا گیا ہے کہ سابق میں بھی انبیا آئے تھے۔ ایک طرف اگر ان کے ہمعصر نافرمان عذاب الٰہی میں گرفتار اور تباہ ہوئے تو دوسری طرف تبعین کی آئندہ نسلوں میں گمراہی عود کر آئی اور سابقہ تعلیمات الٰہی کے آخری آثار بھی ناپید ہو گئے تو نئے سرے سے نبی بھیجے گئے۔ یا سابق میں جہاں کوئی نبی نہیں آیا تھا اب وہاں نبی مبعوث ہوا۔ نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کا اس طرح ذکر آیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کی طرف بھیجے جانے کا ذکر ہے۔ دیگر انبیاء کے برخلاف حضرت موسیٰ کی تعلیم محفوظ بھی جاتی تھی اور ان کے پیرو یہودی موجود بھی تھے۔ یہ سوال ہوتا تھا کہ اگر توریت حضرت موسیٰ پر اتری ہوئی ربانی کتاب ہے تو پھر کسی نئے نبی اور نئی کتاب کی کیا ضرورت ہے اور کیوں سب لوگ جو ہدایت کے متلاشی ہوں، یہودی نہ ہو جائیں؟ کم از کم مدینے کے یہودیوں میں ایک حد تک تبلیغ نظر آتی تھی اور وہ اپنے دین کو محض نسلی اور بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں سمجھتے تھے۔ ابھی براہ راست یہودیوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ نہیں پڑا تھا۔ صرف یہودیوں کے سکھائے ہوئے اہل مکہ کے اعتراضات سامنے آ رہے تھے ان کی سمجھ اور ضرورت کے مطابق ان کو جواب دیا جا رہا ہے کہ:

۱۔ آپ نبی موجود ہیں۔ توریت اور انجیل میں آپ کی بشارت اور آمد کی پیشنگوئی موجود ہے۔

۲۔ ارتقائے ذہن انسانی کے مدنظر خدا نے سابقہ احکام میں کچھ ترمیم کرنی چاہی اور کچھ بندشیں اور بوجھ دور کر کے انسانوں کے لیے ازراہ کرم و فضل سہولت بہم پہنچانی چاہی ہے۔

۳۔ سابقہ انبیاء ملک وار قوم وار یا زمانہ وار تھے۔ اب خدا نے ایک ایسے نبی کی بعثت

فرمائی ہے جو سارے انسانوں کے لیے سارے ملکوں سارے زمانوں کے لیے ہو۔

اگرچہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" نبی کی تعلیم اپنی آپ سفارشی ہے لیکن انبیائے سلف کے تبعین کی اس نہایت قلیل محدود تعداد کے لیے جو اب بھی صحیح ربانی تعلیم پر عامل ہو، ایک نئے نبی کی پیروی کی ترغیب کس طرح ہو؟ بہترین طریقہ یہی تھا کہ خود ان کی مذہبی کتابوں میں ایک آخری نبی ایک آخری تسلی دہندے کا صراحت سے ذکر ہو۔ انـــه لفی ذبـــر الاولین (۱۹۶/۲۶) یعنی آنحضرت کا ذکر تمام گزشتہ کتب میں ہونے کا قرآن مدعی ہے۔ اور باوجود امتداد زمانہ اور دستبرد حوادث کے اب تک ایسی چیزیں کچھ نہ کچھ ملتی ہیں ویدوں میں (جو صحف ابراہیم ہوں یا نہ ہوں) مرتے وقت اپنے چیلوں کو ایک برگزیدہ نبی کے انتظار کا حکم دیا۔ مذکورۂ صدر آیات میں توریت و انجیل میں بھی آپ کی بشارت کے لکھے ہوئے ہونے کا دعویٰ ہے۔ گزشتہ چودہ سو سال سے مسلمان علماء اس پر تفصیل سے بحث اور نشان دہی کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں تفصیل بے محل ہوگی۔

ابھی تک مکے والے ہی مخاطب تھے۔ ممکن ہے حج کعبہ کے لیے آنے والے اہل جزیرہ نمائے عرب بھی جو سال میں ایک مرتبہ منا میں جمع ہوتے تھے اور کئی دن وہاں رہ کر عید مناتے تھے۔ جلد ہی مخاطب بننے لگے ہوں۔ لیکن بہر حال چونکہ یہود و نصاریٰ سے براہ راست سابقہ تقریباً معدوم تھا۔ اسی لیے یہودیوں کا ذکر ضمنی اور بصیغہ غائب ہی ہے۔ البتہ ان کی واقعی فضیلتوں کا کھلے دل سے اعتراف ہے۔ اور ان کی مذہبی کتاب کو الہامی اور خدا کی دی ہوئی کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔

سورہ ۲۷ میں (جو بہ لحاظ ترتیب نزول ۴۸ ہے) ایک نیا انداز شروع ہوتا ہے سورہ کے شروع میں جہاں آنحضرت اور آپ کے تبعین کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ زیر نزول قرآن خدائے حکیم و علیم ہی کی طرف سے آ رہا ہے وہیں ذرا آگے (۷۶/۲۷ میں) یہ آیت ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو ایسی باتیں صحیح صحیح بتاتا ہے جس میں سے اکثر کے متعلق بنی اسرائیل میں آپس ہی میں اختلاف ہے۔" کیا کچھ یہود نبی موعود پر ایمان لا چکے اور باقی انکار کر رہے تھے؟ اس بارے میں سوائے قیاس آرائی کے کچھ چارہ نہیں لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ اس کے بعد قرآن اور آنحضرت کی توجہ یہود کی طرف بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ اس کے بعد جو دو سورے

(قصص و بنی اسرائیل ۲۸ و ۱۷ نازل ہوئے وہ زیادہ تر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے حالات پر مشتمل ہیں اور ان کی عظمت و علو مرتبت کا بار بار ذکر ہے۔ ان کی کتاب کو "بصائر للناس وھدیٰ ورحمۃ (۲۸/۴۳) اور "ھدی لبنی اسرائیل" (۱۷/۲) کہہ کر سراہا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب یہودیوں سے بالواسطہ ہی سہی، راست تماس قائم ہو گیا تھا اور وہ قریش مکّہ کے بحث اور مناظرے میں عملی دلچسپی لینے اور توریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کو شدت سے جھٹلانے لگے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی جو سورۂ (۱۰) نازل ہوا اس میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا مکرر تفصیلی ذکر (۱۰/۷۵ تا ۹۳) کرنے کے بعد ہمعصر یہودیوں پر جان بوجھ کر اختلاف و انکار کرتے (۱۰/۹۳) کا الزام لگایا گیا کہ فان كنت في شك مما انزلنا اليك فسئل الذين يقرون الكتب من قبلك اس سے بھی اس گمان کی تائید ہوتی ہے کہ ایک یا زائد یہودی اور نصرانی اسلام قبول کر چکے تھے اور وہ توریت و انجیل کی نبی موعود کے متعلق پیشینگوئیوں کا مصداق آنحضرت کو تسلیم کر رہے تھے۔ اس کے بعد سورۂ ہود (۱۱) نازل ہوا۔ جان بوجھ کر آنحضرت کا الزام اس میں پھر دہرایا جاتا ہے (۱۱/۱۱۰)۔

اسی اثناء میں حضرت موسیٰ کی کتاب "یا صحف" کو آسمانی وحی تسلیم کرنے سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو رہا اور اس کا جواب بھی ملتا جا رہا تھا یہودیوں کی مقدس کتاب میں انبیائے سلف کے حالات کثرت سے ہیں جن میں سے بعض میں ان کا کردار اقدار شرمناک نظر آتا ہے۔ ایک طرف قرآن ہر روز ان انبیاء کے نام یا حالات بیان کر کر کے ان کو مطمحِ انسان قابل تقلید و نمونہ شخصیتیں اور خدا کے برگزیدہ اور صالح ترین بندے قرار دے رہا تھا بلکہ مسلمانوں کو اب بھی ان کی تعلیم و سیرت کی اقتدا کا حکم دے رہا تھا اور دوسری طرف انہیں انبیاء کے حالات جو اہل کتاب یعنی یہودیوں کے ہاں لکھے ہوئے ملتے تھے ان سے جابجا گھن آتی تھی۔

یہودی قوم کی طرح اصل میں یہودی مقدس کتاب کی سرگزشت بھی دردناک رہی بھی تو غیر ملکی حملہ آوروں کی مذہبی ایذا رسانیوں میں یہ کتاب بار بار دنیا سے ناپید ہوئی اور صدیوں بعد محض انفرادی حافظوں سے کاملاً تو نہیں جزواً بحال ہوتی ہے۔ (متعدد ابواب کا دوسرے ابواب میں اب محض حوالہ ملتا ہے، اصل ناپید ہیں) کبھی نیک نیتی سے اخبار تصحیح کیا کرتے ہیں

کر تصحیف کرتے ہیں اور بکف چراغ داشتہ کبھی پرانے رسم الخط اپنی غیر ترقی یافتہ صورتوں میں غتر بود یا اور قسم کی ناخواستہ غلطیوں کا باعث بنتے ہیں کبھی استبداد زمانہ سے قلمی نسخوں کی سیاہی مٹ کر مفہوم کو کچھ سے کچھ کرتی ہے۔ اور یہ سب باتیں اب خود یہودیوں میں مسلّم ہیں۔ اور ہم شاید ایک مزید امر کا ذکر سکتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات پر یہودیوں میں تخت سلطنت کے لیے خانہ جنگی ہوتی ہے اور ہر فریق دوسرے کی عیب جوئی کرتا ہے۔

یروبعام نامی سردار حضرت سلیمانؑ کا سزا یافتہ اور دشمن تھا اور قسمت سے وہی آپ کے بعد یہودیوں کے بارہ میں سے دس قبائل کا بادشاہ بن جاتا، اور ارتداد اختیار کرتا اور بت پرستی کو رائج کرتا ہے (حضرت سلیمان کے فرزند اور ولی عہد کو صرف دو قبائل کی حکومت پر اکتفا کرنی پڑتی ہے) اگر یروبعامی علاقے کی تالیفوں میں حضرت سلیمان اور ان کے والد وغیرہ پر صریح بہتان ہوں تو کیوں قابل حیرت ہو؟

اب قرآن مجید یہود پر ایک مزید انعام و احسان الٰہی ثابت ہوتا ہے۔ اور وہ یہودی کتاب مقدس میں انسانی عناصر سے جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں ان کو دور کرتا اور ان کے انبیاء کی سیرت کو نکھارتا اور کذب و افتراء سے پاک ہوتا ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں قرآن کی تائید کا قدرتی سامان بھی ہوتا رہا ہے۔ مختلف مقاموں سے توریت کے مخطوطے برآمد ہو رہے ہیں اور ابتدائی مطبوعہ نسخوں سے ان کا مقابلہ کرنے پر تحریف، سہو، حذف و اضافہ سب ہی قسم کی ایک دو نہیں ہزارہا غلطیوں یا اختلاف کا پتا چل رہا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جہاں ہٹلر یہودیوں کے حق میں بخت نصر ثانی ثابت ہوا وہیں خود فلسطین میں یہودیوں کو تا حال قدیم ترین توریت چند عرب بدویوں کی مہربانی سے ایک پرانے کھنڈر میں مدفون لیکن محفوظ ملی ہے۔ یہ سنہ عیسوی کے آغاز یا اس کے لگ بھگ زمانے کا لکھا ہوا مخطوطہ ہے اور ابتدائی قرأت ہی میں مروجہ توریت کی متعدد مقامات پر اہم تصحیح کرتا پایا گیا ہے اگر اسے دیانت داری سے ایڈٹ کیا گیا تو توقع ہے انبیائے الٰہی کی اسی دنیا میں کچھ اور تنزیہ ہو جائے۔ یہودیوں کے اندرونی اختلافات اور جان بوجھ کر انکار وغیرہ کا سورۂ ہود (۱۱) کے بعد سورہ حم سجدہ (۴۱/۴۵) میں بھی ذکر ہے اور سورہ شوریٰ (۴۲/۱۴) میں بھی اور سورہ جاثیہ (۴۵/۱۶) میں بھی ہر جگہ یہودیوں کے انبیاء کی

تعریف و توصیف اور یہودیوں پر خدا کے انعام و احسان کا بار بار ذکر ہے۔ حتیٰ کہ آخرالذکر آیت سورہ جاثیہ نے تو حد کر دی کہ:

ہم نے بنی اسرائیل کو دی کتاب اور حکمت اور نبوت اور کھانے کو دیں
انہیں بہترین چیزیں اور فضیلت دی ان کو تمام جہانوں پر اور دیے ان کو
صاف صاف اوامر و احکام۔ پھر اختلاف نہ کیا انہوں نے مگر علم حاصل
ہونے کے بعد آپس کا نزاع و بغاوت کے باعث۔

پھر سورہ احقاف (۳۶) نازل ہوتا ہے اس میں کتاب موسیٰ اماماً و رحمة وهذا كتابٌ مصدق لساناً عربیا (۳۶/ ۴۸) کہہ کر توریت کی تعریف کی گئی۔ اور قرآن کو اس کا حریف نہیں بلکہ مؤید قرار دیا سورۂ انبیا (۳۳/ ۴۸) میں جو ذرا بعد میں نازل ہوا، توریت کو ''الفرقان وضیاءً'' کے القاب دیے گئے ہیں۔

قرآن کی تبلیغی ضرورتیں تھیں کہ مذکورہ بالا حکایاتی سوروں کے بعد پھر یکا یک خالص عقائدی و توحیدی سورۂ غاشیہ (نمبر ۸۸ نازل ہوتا ہے جس میں قیامت سے انسانوں کو ڈرایا گیا ہے اس کے بعد پھر مکرر حکایاتی سورۂ کہف (۱۸) نازل ہوتا ہے۔

ضرب المثلوں، کہانیوں وغیرہ کا منشا استدلال میں زور اور شگفتگی پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے سچ تو یہ ہے کہ ان قصوں کی ٹوہ میں پڑنا کہ اصحاب کہف کا زمانہ کونسا ہے، ان کی تعداد کیا تھی، ان کے نام کیا تھے، ان کا غار کہاں تھا وغیرہ قرآن کے موضوع بحث کے لیے جو انسانوں کی نصیحت و رہبری ہے، کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ تاہم علوم انسانی سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

قصہ موسیٰ و آب حیات پر (جس سے مچھلی زندہ ہو گئی) شاید یہاں کچھ بحث بے جا نہ ہو۔ اس طرح کا قصہ مختلف تمدنوں کی قومی روایتوں میں ملتا ہے۔ سکندر اعظم اور اس کے باورچی کی طرف بھی یہ قصہ منسوب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوئی ہزار سال بعد کا واقعہ ہے لیکن ایک قصہ جو عراق میں اینٹوں پر لکھے ہوئے کتب خانے میں ملا ہے اور جو حضرت موسیٰ سے قدیم تر مانا جا رہا ہے اس میں گلگا میش کی طرف بھی بعینہٖ یہی واقعہ منسوب ہے۔ قرآن مجید میں مثلاً عمران کا نام دو الگ شخصیتوں کے لیے آیا ہے۔ اسی طرح اگر موسیٰ کا نام

بھی دو لوگوں کے لیے ہو تو کوئی امر مانع نہیں۔ سورۂ کہف (۶۰ و مابعد/ ۱۸) میں موسیٰ بن عمران (برادر حضرت ہارون) ہی کا ہو۔ اس میں کوئی مانع نہیں کہ وہاں موسیٰ سے مراد ''گلگا موسیٰ'' ہی ہوں۔ (گلگا میش کے اس قصہ آب حیات اور مچھلی کے دوبارہ زندہ ہونے کی تفصیل کے لیے دیکھیے جرمن رسالہ تسائت شریفت فیور اسیوریالوگی ۱۹۱۱ء۔ توریت میں بھی مچھلی زندہ ہونے کا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب نہیں ملتا۔

مکی دور کی ان سورتوں میں مندرجہ ایک اور چیز کے ذکر پر اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے سورۂ انعام (موجودہ تلاوتی ترتیب میں ۶ اور بہ لحاظ نزول ۵۵) میں اور پھر سورہ نحل (تلاوت ۱۶ نزول ۷۰) میں یہودیوں کی غذائی ممانعتوں کا ذکر ہے چنانچہ اول الذکر میں (۶/۱۴۶) ارشاد ہوا ہے کہ وعلى الذين هادوا حرمنا كل ذى ظفر الآیہ اور آخر میں یہ ہے ذلك جزينا هم ببغيهم اور آخرالذکر سورے (۱۶/۱۶۸) میں مکرر اسی کو یاد دلایا گیا ہے کہ وعلى الذين هادوا حرمنا ما قصصنا عليك من قبل وَمَا ظلمنهم گمان یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان غیر ضروری ممانعتوں کو منسوخ قرار دیا (۱۵۷/ ۷) تو یہودی فضیحت کرنے لگے اور جاہل اہل مکہ کو بھڑکانے لگے۔ اس پر خود یہودیوں کی سرزنش مناسب نظر آئی اور انہیں یاد دلایا گیا کہ وہ چیزیں ایک کفارے کے طور پر ان کے لیے ممنوع قرار دی گئی تھیں، فی نفسہٖ وہ بری نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ بے قصور عربوں اور مسلمانوں کو خدا کی پیدا کردہ ان نعمتوں سے محروم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

نظر بازگشت

جیسا کہ ہم نے کہا، مکی دور کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودیوں کے تعلقات پر ہمیں کوئی بیرونی شہادتیں یا واقعات نہیں ملتے۔ قرآنی تذکروں کی اندرونی شہادت کی مدد سے تعلقات کا جو ارتقا اوپر دکھایا گیا۔ اس میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ اسلام اور یہودیوں میں کبیدگی پیدا ہو گئی اور روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ایک آیت جو اگرچہ ایک مدنی سورے (۳/۵۷) میں ملتی ہے لیکن جس کے متعلق بعض بیرونی شہادتوں سے تسلیم بھی کیا جاتا ہے کہ وہ مکی ہے اور ہجرت حبشہ کے وقت نجاشی کے نام جو نامۂ تعارف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا زاد بھائی جعفر طیار کو دیا تھا، اس میں بھی مندرج ہے۔ ایک عظیم کوشش کا آغاز معلوم ہوتی ہے کہ یہودی۔ عیسائی عام اہل عرب سب ملّت ابراہیم پر مجتمع ہو جائیں۔

یعنی: یااھل الکتب تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا و بینکم.

یہ کوشش ہجرت مدینہ کے بعد اور بھی بڑھ جاتی ہے وہ عہد نبوی میں تو ناکام رہی مگر پیشکش موجود ہے۔ اس پر مزید بحث آگے ص ۲۲۵ پر۔ مکی دور کے متعلق ہمیں اس کے سوا کوئی اور چیز نہیں ملی۔ اب مدنی دور کا مطالعہ کرنا ہے جو اہم واقعات سے لبریز ہے۔

یہودیوں سے تعلقات ہجرت کے بعد

(۲)

مدینہ طیبہ کا قدیم ترین نام طابت ملتا ہے۔ پھر طیبہ (بغیر تشدید کے) اس کا ایک محلّہ جو ابتداً الگ گاؤں ہوگا، یثرب کہلاتا تھا یہ اب جبل احد کے جنوب مغرب میں بتایا جاتا ہے، جہاں پانی اور نخلستان کثرت سے ہیں۔ مدینہ بھی خاص قدیم نام ہے ممکن ہے یہودیوں کے ایک مرکز کا نام ہو۔ بہرحال وہ زمانہ اسلام میں مدینۃ النبی کے نام سے پورے عرب میں مشہور ہوا۔

اس بستی میں یہودی آبادی خاصی قدیم تھی لیکن اس میں عربیت اتنی آگئی تھی کہ ان لوگوں کے نام اور گھریلو زبان بھی بحیثیت عربی ہو گئے تھے اور سماج بھی قبیلہ وار بن گیا تھا۔ لیکن اس میں بھی تنظیم تھی۔ ان کا ایک بیت المدراش تھا جو نیم عدالتی نیم علمی گویا دار الافتاء تھا۔ ان میں قبیلہ وار کنز بھی تھا یعنی وہ مال جو وہ اتفاقی قومی ضروریات کے لیے چندہ کر کے جمع کیا کرتے تھے یہاں یہ امر تو ذرا بے محل ہوگا کہ مدینے کے یہودیوں کی پوری تاریخ سے بحث کی جائے جس کا مواد بھی کم ہے یا مدینے پر یہودی اقتدار کے زمانے میں یمن کے ایک تبع (حکمران کی حملہ آوری کی تحقیق کی جائے۔ لیکن بہرحال آج بھی مدینے کے جنوبی حصے میں وادی العقیق کے ایک پُر فضا مقام پر عروہ سے متصل ایک پہاڑی پر یمنی خط مسند میں کئی کتبے اب (۱۳۶۶ھ) تک موجود ملتے ہیں جن میں لوگوں کے ناموں کے سوا کوئی چیز نہیں۔ معلوم نہیں یہ کتبے کب کے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے عین پہلے مدینہ منورہ کی آبادی کے دو بڑے

طبقے ہو گئے تھے۔ بُت پرست عرب اور یہودی۔ ان میں آپس میں بھی پھوٹ تھی اور نتیجہ یہ تھا کہ چند عرب اور چند یہودی قبائل ایک طرف اور باقی عرب اور باقی یہودی قبائل دوسری طرف حلیفی کر چکے تھے اور ان میں وقتاً فوقتاً خونریزی بھی ہوتی رہتی تھی۔ ایسی آخری جنگ جو یوم بعاث کے نام سے مشہور ہے، اتنی تلخ رہی تھی کہ اب اہلِ مکہ سے بھی اس میں شرکت کی کوشش کے ایک وفد سے بیعت عقبہ عمل میں آئی تھی۔

یہودی مدینے کی زراعت، تجارت اور صنعت پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں (صحیح بخاری ۴۹/۳۴) مدنی عرب تو جن اسباب سے بھی اسلام کی طرف مائل ہوئے ہوں، ان یہودیوں کے لیے کوئی خاص ترغیب بہ ظاہر نہ تھی۔ وہ ایک پُرانا مذہب رکھتے تھے اور اس پر وہ شدت سے دل بستہ تھے۔ اور ان کی دینی و دنیوی ضرورتیں اس سے بہر حال پوری ہو رہی تھیں۔ ان کی مالی معاشی حالت بھی ہمسایوں سے اچھی تھی ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج تھا۔ ان کے پاس ایک الہامی کتاب تھی اور اس طرح وہ ذہنی حیثیت سے بھی اپنے لیے بدوی عربوں پر ایک فوقیت محسوس کرتے تھے۔

بے شبہ ان کی مذہبی روایتوں میں ایک آخری نبی کی بشارت اور پیشینگوئی تھی۔ لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ اس کے عربوں میں سے ہونے کی کس حد تک توقع کرتے تھے۔ البتہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ بعثت نبوی کے وقت وہ ایسے نبی کی آمد کا انتظار ضرور کر رہے تھے جیسا کہ یورپی مورخ بھی اب تسلیم کرنے لگے ہیں۔ مگر یہودی چاہتے تھے کہ اس نبی کی مدد سے خود حکمران جماعت بر بنائے نسل بن جائیں الرمکم عند الله اتقاکم کی عمومیت انہیں پسند نہ آ سکتی تھی۔ لیکن خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ آنے اور پناہ گزین مہاجرین مکہ کو بسانے کے فوری کام سے فارغ ہونے کے بعد یہودیوں کی طرف متوجہ ہونا ناگزیر تھا۔ مکی عہد کے اواخر میں توریت کی بشارتوں پر زور دیا جانا شروع ہو چکا تھا اور اب یکا یک ہزاروں یہودیوں سے رات دن شہر کی گلیوں میں مڈبھیڑ رہتی تھی۔ ویسے بھی سیاسی اور دفاعی ضرورتوں سے جب تک شہر مدینہ کی اس تقریباً پچاس فی صدی آبادی سے سمجھوتہ نہ ہو کوئی انتظام قابل اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔

سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۵۴ میں بنی قینقاع سے تعلقات کے سلسلے میں جو تبلیغی انداز ہے

قدیم ترین معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ان کو آپ حلف دے دے کر پوچھتے تھے کہ "کیا توریت میں میری پیشینگوئی نہیں ہے۔ اگر تم قسم کھا کر کہو کہ نہیں ہے تو پھر تم سے کوئی مواخذہ نہیں اسی مفہوم کا ایک مکتوب نبوی بھی ملتا ہے۔ جو خیبر کے یہودیوں کے نام ہے اس میں ان کو خدا کی نعمتیں یاد دلائی گئی ہیں اور توریت کی بشارتوں کے مصداق پر ایمان لانے کی دعوت بھی کہہ کر دی گئی ہے کہ اگر واقعی توریت میں ذکر نہ ہو تو پھر تم سے کوئی خصوصی مطالبہ نہیں۔ غالباً یہ مکتوب بھی اسی زمانے کا ہے اور خصوصی قاصد کے ذریعے سے خیبر بھیجا گیا تھا۔ مگر اس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ بلکہ مسلسل ایسے اتفاقات ہی پیش آتے رہے جن سے تعلقات کبیدہ سے کبیدہ تر ہی ہوتے چلے گئے۔

یہ تو ٹھیک طور سے معلوم نہیں کہ صحیفہ یعنی شہری مملکت مدینہ کا دستور (جس میں یہودی بھی ساتھ شریک ہوئے اور جس کی تفصیل کے لیے کتاب "عہد نبوی کا نظام حکمرانی" جلد اول میں متعلقہ باب ملاحظہ ہو) کب مرتب اور نافذ ہوا لیکن مورخ یہ صراحت کرتے ہیں کہ اس کی خلاف ورزی سب سے پہلے بنی قینقاع نے کی۔ واقعات کی پوری تفصیل تاریخوں نے محفوظ نہیں کی۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۳ھ کے وسط میں ان یہودیوں نے زمانۂ جاہلیت کی بعض گندی عادتوں کے تحت ایک مسلمان عورت کی بے حرمتی کی جس پر کچھ کشت و خون ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست یہ تھی کہ ہر چیز پر تبلیغ دین مقدم رہے۔ چنانچہ اس عہد شکنی اور فساد کے سلسلے میں بھی آپؐ نے ان کے پاس جا کر انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ انہوں نے نہ معلوم کیا کیا جواب دیا کہ بات بڑھ گئی اور مسلمانوں نے ان کے محلّے کا محاصرہ کر لیا اور پندرہ دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غیر مشروط اطاعت پر اسے منظور فرمایا کہ یہ لوگ تین دن کے اندر مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں مگر ہتھیار ضبط کر لیے گئے ان کے اخراج کی نگرانی کے لیے آنحضرتؐ نے بروایت طبری ایک خصوصی افسر مقرر فرمایا تھا۔ ان کی تعداد سات سو بیان کی جاتی ہے کہتے ہیں کہ یہ لوگ اذرعات (فلسطین) جا بسے۔

یہاں دو ایک امور قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض بعد کے سالوں میں مدینے میں بنی قینقاع کے یہودیوں کا مسلسل پتہ چلتا ہے (جیسا کہ آگے ذکر آئے گا) معلوم نہیں آیا ان کے پورے قبیلے کی جلاوطنی ہوئی یا صرف چند کی۔ اگر سب کی ہوئی تو آیا بعد میں ان کے متعین

افراد کو معافی دے کر اجازت عطا ہوئی کہ مدینے میں آ رہیں اور اپنی دست کاری سنار کا کام انجام دیں تیسرا امکان یہ ہے کہ جن مؤلفوں نے بعد کے زمانے میں ان کا ذکر کیا ہے وہ کوئی سہو بیانی ہو کہ بنی قینقاع کے یہودیوں نے ۳ھ میں معرکہ احد میں مسلمانوں کو (ابن سعد ا۔۱/۳۴) تعاون کا پیش کش کیا۔ ۵ھ میں بنی قریظہ سے جنگ ہوئی تو (مبسوط سرخسی ۱۰/۲۳ نیز الاصل لاشیبانی) مسلمانوں کا ہاتھ بٹایا اور ۷ھ میں خیبر میں بھی مسلمانوں کو مدد دی اور انعام حاصل کیا (سنن کبریٰ بیہقی ۹/۵۳) مگر ایک بار سہو بیانی ہو گی۔ بار بار نہیں۔ بہر حال یہ لوگ زراعت پیشہ نہیں بلکہ دست کار تھے۔ ان کے رہنے کے مکانوں کی جگہ آج مدینہ منورہ میں چٹیل میدان کے سوا کچھ باقی نہیں۔ تاریخ میں سُوق بنی قینقاع کا بھی ذکر آتا ہے۔ غالباً یہ دستکاری کے علاوہ تجارت بھی کرتے تھے۔ انصار کے بعض قبائل کی بنی قینقاع سے تاحال دفاعی حلیفی تھی لیکن اب ان مسلمان انصار نے اس حلیفی سے دستبرداری دی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا ساتھ دیا۔ البتہ ان کی اطاعت کے بعد بہ پاس حلیفی ان کے ساتھ نرمی کی سفارش ضرور کی۔ اس لڑائی میں دیگر یہودی ناطرف دار رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہودیوں سے معاہدہ اجتماعی نہ تھا بلکہ ہر ہر یہودی قبیلے کے ساتھ انفرادی طور پر ہوا تھا۔ دستور مدینہ کے معاہدے میں قینقاع کا نام بھی نہیں ہے بلکہ ان کی بھی ہر شاخ کا الگ الگ نام ہے یہ تک نہیں معلوم ہوتا کہ دستور مدینہ میں مذکوران قبیلوں میں سے کون سے بنو قینقاع کے ہیں کون سے بنو النضیر کے اور کون سے بنو قریظہ کے۔

یہودیوں میں آپس میں جتنی بھی پھوٹ رہے غیر کے مقابلے میں وہ اپنوں کی پچ بہت کرتے ہیں۔ بنی قینقاع کی جلاوطنی کے بعد مدینے کے باقی یہودی اسلام اور مسلمانوں سے دل ہی دل میں کھٹک گئے ہوں تو بعید نہیں۔ لیکن دو سال تک ان کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ گمان کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ ان میں تبلیغ کرتے رہے ہوں گے۔ اور مباحثہ مناظرہ بھی عام مسلمانوں سے ہوتا رہا ہو گا۔ اور معدودے چند کے سوا کسی نے اسلام قبول نہ کیا ہو گا۔ سورۂ بقرہ ہجرت کے بعد نازل شدہ پہلی سورت سمجھی جاتی ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک بنی اسرائیل ہی کا قصہ ہے اور ان مباحثوں کا گویا جیتا جاگتا تذکرہ ہے۔ ان کو خدا کی وہ نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں جو پے در پے ان پر ہوتی رہیں۔ ان کی طرح طرح سے دلداری

کی جاتی ہے۔ ان کے متعلق ایک سورے میں دو دو مرتبہ صراحت کے ساتھ "فضلتکم علی العلمین" (قرآن ۲/۴۷.....۲/۱۲۲) تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان ہی کی مذہبی کتابوں میں رسول عربی کی آمد کی جو پیشین گوئیاں ہیں وہ انہیں یاد دلائی جاتی ہیں ان کے تمام انبیاء کو مسلمانوں کے بھی انبیاء تسلیم کیا جاتا ہے۔ حتی کہ یہ کہنا چاہیے کہ انہیں ایک بنیادی مذہب کے (جو اقل قلیل معتقدات پر مبنی تھا) قبول کرنے میں شرکت کی دعوت دیجاتی ہے کہ "مسلمان اور یہودی اور عیسائی اور صابی سب اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اور عمل صالح کرتے رہیں" (قرآن ۲/۶۲ نیز ۵/۶۹) لیکن "آساں نہیں مسلماں ہونا" پھر بھی ابھی ہمارے اس پیکر استقلال صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بالکل ہی مایوس نہیں ہو گئی ہو گی۔

اس اثناء میں بیت المقدس کی جگہ کعبے کو مسلمانوں نے اپنا قبلہ بنا لیا۔ یہودی اس پر بھی بھنائے ہوں گے۔

بنی قینقاع کے واقعے کو چند ہی مہینے گزرے تھے کہ احد کا معرکہ پیش آیا، جس میں قریش کے ہاتھوں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا اور اسلامی حکومت ختم ہوتے ہوتے رہ گئی۔ یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ اس میں یہودیوں کا کتنا ہاتھ تھا۔[1] لیکن ابن کثیر وغیرہ سے اس کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جنگ بدر کے بعد کعب بن الاشرف نامی ایک یہودی (جس کی ماں بنو النضیر کے قبائل سے تعلق رکھتی تھی) قریش کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی خفیہ دعوت دیتا اور اپنی مدد کا یقین دلاتا رہا۔ گمان غالب ہے کہ یہ بنو قینقاع کے حادثے کے بعد کا واقعہ حکومت اسلامیہ کی خبر رسانی کا نظام قابل رشک تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ساز باز کی اطلاع ہو گئی اور

۱۔ دستور مدینہ کے تحت یہود کا فریضہ تھا کہ بیرونی حملہ آور کی دفاع میں برابر کا حصہ لیتے مگر عام یہودی نہ صرف یہ کہ مدد نہیں دیتے بلکہ منافقوں کے تین سو کے دستے نے (جو پوری اسلامی فوج کا ایک تہائی تھا) عین وقت پر خذل کر کے اور دغا دے کر مسلمانوں میں ہراسانی ہی پھیلانی چاہی تھی۔ ان میں کچھ یہودی بھی ہوں گے۔ ان پر یہودی اثرات تو ناقابل انکار ہیں۔ شاید یہی وجہ ہو گی کہ امام زہری کے مطابق۔ (دیکھو ابن کثیر ۱۴/۴)

انصار نے رسول اللہؐ سے اُحد کی موقع پر اپنے حلیف یہودیان مدینہ سے مدد لینے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا کہ نہیں ہمیں ان کی حاجت نہیں۔" بنی قینقاع میں اشتباہ ہے کہ یہاں وہی مراد ہیں یا کسی دوسرے قبیلے کے۔

مسلمان مورخ صراحت سے تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے روانہ کردہ کارندوں نے اس غدار باغی کو دنیا سے رخصت کر دیا۔

کعب بن الاشرف اپنی عاشق مزاجی کے لیے بدنام تھا۔ اس کروڑ پتی کا اپنی دولت کو اس سلسلے میں لٹانا عربوں ہی میں نہیں، یہودیوں میں بھی اس کے خلاف غم و غصے کے جذبات بھڑکا تا رہا ہوگا۔ چنانچہ اس کے قتل پر کوئی ردعمل مدینے کی یہودی آبادی میں نہیں ہوتا۔ کعب کا شاندار محل نہ معلوم کتنا پُر تکلف رہا ہوگا۔ آج بھی اس کے کھنڈر مدینے کے جنوب میں سیاح کو متاثر کر دیتے ہیں۔ یہ قصر ایک اچھا خاصا قلعہ ہے۔ محاصرے کی صورت میں اس کے اندر پانی کا انتظام ہے اور صرف ایک کنواں ہی نہیں بلکہ ایک شاندار حوض بھی جس کے کئی حصے ہیں اور ایک دوسرے میں نلکوں (پائپ) کا اتصال ہے، بظاہر پانی کی صفائی کا انتظام تھا۔

صحیفہ مدینہ میں یہودیوں سے علاوہ دفاعی حلیفی کے ساتھ بیمے میں شرکت کا بھی اقرار تھا یعنی اگر کوئی خون بہا ہر جانہ دینا ہو تو تعاون کیا جائے گا۔ معرکۂ اُحد کو چند مہینے گزرے تھے کہ ۴ھ میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ معمولی وسائل سے توجہ دہانی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود متعلقہ قبائل یعنی بنو النضیر کی بستی میں بعض اکابر صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور صورت حال سے آگاہ کر کے معاہداتی فرائض یاد دلائے۔ انہوں نے ٹال مٹول کی اور انتظار کرایا۔ دھوپ تیز ہونے لگی تو مورخ بیان کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی گڑھی کے سائے میں جا بیٹھے یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ گڑھی پر سے چکی کے پاٹ گرا کر کعب بن الاشرف وغیرہ کا انتقام لیا جائے (تاریخ نے مدینے وغیرہ میں اور بھی اس طرح کے یہودی حوادث کا ذکر کیا ہے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چل گیا اور آپ اس طرح وہاں سے چلے گئے کہ شبہ نہ پیدا ہوا۔ لیکن یہ اعلان جنگ تھا۔

چنانچہ بنو النضیر کی گھنے نخلستان سے گھری ہوئی بستی کا محاصرہ کیا گیا جو مدینے کے جنوب میں ہے اور جب کافی کشمکش کے بعد جس میں جنگی ضرورتوں سے ان کے نخلستان کا کچھ حصہ بھی (حسب بیان قرآن) کاٹ کر صاف کرنا پڑا تھا، انہوں نے اطاعت قبول کی تو ان کے ساتھ کافی رعایت کی گئی۔ ہر شخص کو ایک ایک اونٹ سامان لے کر مدینے سے چلے جانے کی اجازت دی گئی۔ ہتھیار اس سے مستثنیٰ تھے۔ مورخ لکھتے ہیں کہ انہوں نے سرزوری دکھائی اور

گاتے بجاتے اس طرح مدینے سے گئے گویا فتح انہیں کی ہوئی ہے۔ انہوں نے گھر اور باغ تو بے شک چھوڑے لیکن اثاث البیت میں سے دروازے اور چوکھٹ تک اکھاڑ لے گئے اور وعدے کی فیاضانہ تعبیر کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سب کو روا رکھا۔

(طبری صفحہ ۱۹۵۲ء)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بنو النضیر نے جلا وطنی کے حکم پر توجہ دلائی کہ ان کے قرضے مقامی باشندوں سے وصول طلب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صعوا و تعجلوا" (رقم کچھ گھٹا کر میعاد سے قبل بے باق کرالو) (سرخسی سیر کبیر ۳/۲۹) ان کو باوجود دشمن ہونے کے حق تھا کہ اپنے قرضے وقت پر واپس پائیں۔ تعجیل ادا کے لیے مدیونوں سے کوئی نیا راضی نامہ کر لینے کا انہیں اختیار تسلیم کیا گیا۔ ان کی جائیداد غیر منقولہ جو صلحاً ہاتھ آئی تھی حکومت کی ملکیت ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کچھ تو اپنے صرف خاص کے لیے رکھا اور باقی کو انصار کی اجازت لے کر صرف مہاجرین میں تقسیم فرمایا۔ بجز دو غریب انصاریوں کے اور دو نو مسلم نضیریوں کے جائیداد ان ہی کو واپس دیدی گئی۔ (طبری صفحہ ۱۴۵۳) بخاری نے کتاب البیوع میں ایک حدیث لکھی ہے کہ یہودیوں کو جلا وطنی کرتے وقت آنحضرتؐ نے انہیں اجازت دی کہ اپنی زمینیں فروخت کر دیں مگر کوئی مزید تفصیل نہیں لکھی معلوم نہیں کب کا واقعہ ہے۔

ایک ذیلی تفصیل یہ ہے کہ بنو النضیر کے محاصرے کے وقت اسلامی پڑاؤ ایسے مقام پر ڈالا گیا جو بنو النضیر اور بنو قریظہ کی بستیوں کے مابین تھا۔ منشا ظاہر ہے کہ یہ تھا کہ آخر الذکر کی خفیہ جنگی امداد کا ممکنہ انسداد کیا جائے۔ اس اسلامی پڑاؤ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمے کی جگہ ایک یادگار مسجد فضیخ موجود ہے۔ یہ خیمہ لکڑی کا تھا تا کہ تیروں سے محفوظ رہے۔

(سیرۃ شامیہ)

یہ خیال کرنا معقول ہے کہ اسلام اور یہودیوں کے تعلقات اب بہت کشیدہ ہو گئے تھے اور یہ کہ تبلیغ اسلامی کی کوششوں پر اب یہودی ردعمل اخلاق و تہذیب سے بھی گرتا جا رہا ہو گا۔ مسجد نبوی کے وعظوں میں ان کے برگشتہ نوجوانوں کا آ کر دل کے پھپھولے پھوڑنا اور "السلام علیک" (تجھ پر سلامتی) کی جگہ "السام علیک" (تجھ پر موت) یا راعنا (ہم پر توجہ یا

رعایت کی) کی جگہ زبان موڑ کر غالباً "راعینا" (ہمارا چرواہا، کہتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح توہین کی انہیں یا کسی کو خبر بھی نہ ہونے پائی اور اسی طرح کی طفلانہ حرکتیں سرزد ہونے لگیں وہ خود دین اسلام کا بھی طرح طرح سے تمسخر کرنے لگے (قرآن ۵/۵۷) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہودی کریانہ فروشوں سے غلہ اُدھار بھی خرید فرمایا کرتے تھے ان میں سے بھی بعض لوگ گستاخی اور بدزبانی سے پیش آتے۔ لیکن آپ کا خلق عظیم ایک نمونہ تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی صحابی نے "السام علیک" پر آپ کی توجہ معطف کرائی تو آپؐ نے کہا ہاں میں ان کو جواب میں "وعلیک" (اور تجھ پر بھی) کہہ دیتا ہوں۔ "راعنا" کے سلسلے میں قرآن نے (۲/۱۰۴) مسلمانوں کو تعلیم دی کہ وہ ایک مترادف لیکن دوسرا لفظ "اُنظرنا" استعمال کیا کریں تاکہ یہودیوں کو ایک مروج محاورے سے بیجا فائدہ اُٹھانے اور خفیہ گستاخی کرنے کا موقع نہ رہے۔ علانیہ کی ظاہر ہے کہ انہیں کیا جرأت ہوتی، کریانہ فروش کے واقعہ میں مورخ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ لیکن جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کے حق سے زیادہ ہی رقم قرض کی ادائی میں دلا کر رخصت کیا۔ دین کی تمسخول پر بھی اپنی وسعت قلبی سے جواب جاہلاں باشد خموشی سے زیادہ کچھ نہ کیا۔

البتہ قرآن مجید کی تازہ وحیوں میں یہود کے متعلق انداز بیان درشت تر ہوتا چلا گیا ان پر ایک مذہبی کتابوں میں تحریف کرنے (۴/۴۷۔۴۵) پیسوں کی خاطر جھوٹے خلاف شروع فتوے اپنی ملت والوں کو دے کر انہیں گمراہ کرنے (۲/۷۹) سود خواری وحرام خوری (۴/۱۹۱) توریت کے احکام کو علی العموم پس پشت ڈالنے (۲/۱۰۱) اور اپنے انبیاء تک کو بہ کثرت قتل کرنے (۲/۶۱) وغیرہ کے الزام لگائے گئے حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ان پر لعنت کئے جانے (۵/۷۸) اور دیگر مماثل امور کا ذکر کر کے کہ گویا مسلمانوں کو تشفی دی جانے لگی کہ یہ قوم سدا سے ایسی ہی رہی ہے۔ اس کے ایمان نہ لانے سے دلگیر نہ ہونا اور یہ کہ ان گمراہیوں اور کفر ہی کے باعث ان پر ذلت اور مسکنت یعنی غریب الوطنی کا عذاب صدیوں سے نازل ہے۔

لیکن ان روز افزوں سیاسی کشیدگیوں کے باوجود ان کی کسی حق بات سے انکار نہیں کیا

گیا۔ ہمیشہ اور آخر تک یہی کہا جاتا رہا کہ توریت ایک ہدایت اور ایک خدائی کتاب ہے۔ یہودیوں کو اس کی کامل تعمیل کرنی چاہیے۔ (۵/۴۳، ۵/۶۸) یہودیوں اور دیگر اہل کتاب کا ذبیحہ اور پکوان نیز ان کی لڑکیوں سے نکاح مسلمان کے لیے جائز قرار دیا گیا (۵/۵) جن چیزوں میں راست وحی کے ذریعے سے قانون سازی نہ ہوتی تو مسلمانوں کو یہود وغیرہ اہل کتاب کے عمل کا پابند رہنے کا حکم دیا گیا جہاں قرآن میں اس کا نظری حکم ہے (فبھدٰھم اقتدہ) وہیں بخاری وترمذی میں (مثلاً بالوں کی مانگ نکالنے کے سلسلے میں) نظائر بھی موجود ہیں اور صریح تر حکم بھی ہے۔ بنو نضیر کو اپنی جلاوطنی کا بڑا دکھ ہوا۔ وہ خیبر جا کر بسے اور وہاں کے سردار سربرآوردہ لوگ بن گئے۔ لیکن ان کی ساری توانائیاں صرف انتقام کی تیاری میں خرچ ہونے لگیں۔ ان ہی کے وفد ایک طرف مکہ جا کر قریش کو مدینے پر حملے کے لیے اکساتے اور اپنی مدد کا اطمینان دلاتے ہیں تو دوسری طرف غطفان وفزارہ کے لٹیرے قبائل کو بھی مدینے پر حملے اور لوٹ کی چاٹ دلاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احزاب کا معرکۂ خندق میں مدینے کا محاصرہ کرنے آنا ان یہودیوں ہی کی کوشش کے باعث تھا۔

مدینے کا معاشی مقاطعہ اور مدینے جانے والے قافلوں کو دومۃ الجندل وغیرہ ہراساں کرنا بھی ان ہی کے اثرات کی غمازی کرتا ہے۔ خندق کے محاصرے کے دوران میں بنو قریظہ کے یہودی جو ابھی مدینے میں تھے حُیی بن اخطب وغیرہ ان نضیری یہودیوں ہی کے ورغلانے سے دغا بازی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اور خندق کی معرکہ آرائی کے بعد بھی یہ مایوس ہوئے بغیر اپنی سازشوں میں لگے رہے۔

شوال ۵ھ میں قریش واحزاب نے مدینے کا محاصرہ کیا۔ پیشگی اطلاع مل جانے کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کے لیے شہر کے کھلے حصے میں خندق کھدوائی تھی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ اس میں بنو قریظہ نے سبَل، پھاوڑے کدال وغیرہ اوزار مسلمانوں کو مستعار دیے تھے۔ (مغازی واقدی، مخطوطہ برٹش میوزم صفحہ ۱۰۲ ب) لیکن ان کی کسی عملی مدد کا پتہ نہیں چلتا بلکہ محاصرے کے آخری زمانے میں انہوں نے دغا کی تیاری بھی کی[1] اور صاف

۱۔ ایک رات خدشہ تھا کہ یہ پیچ حملہ کر بیٹھیں گے آنحضرتؐ نے پانچ سو سپاہی بھیجے جو رات بھر ان کی بستی کے پاس تکبیریں لگاتے رہے اس سے یہ ڈر گئے۔ (شامی)

صاف پرانے عہد و پیمان کے ختم ہو جانے کا اعلان کیا۔ مسلمان عورتیں بچے جن گڑھیوں میں پناہ گزیں ہوئے تھے وہاں یہ منڈلانے اور بدنیتی سے مواقع تلاش کرنے لگے بہرحال مسلمانوں کی زبردست سفارتی اور سیاسی جدوجہد کے باعث ان میں اور احزاب میں ایکا نہ ہونے دیا گیا اور جب قریش وغیرہ محاصرہ اُٹھا کر چلے گئے تو انہیں غداری کا وبال چکھنا ناگزیر تھا۔ ان کی بستی کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا۔ اس میں شہر کے دیگر یہودیوں نے بھی مسلمانوں کی مدد کی خاص کر بنو قینقاع کے باقی ماندہ یہودیوں نے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ معلوم ہوتا ہے بنو قریظہ کے سلوک سے یہ یہودی نالاں تھے۔ کافی مدت کے بعد قریظہ والوں نے ہتھیار ڈالے اور اسے منظور کیا کہ ان کے سابق انصاری حلیف ان کے متعلق جو فیصلہ کریں وہ نافذ کیا جائے بنو النضیر کے حلیفوں نے جاں بخشی کرائی تھی۔ بنو قریظہ کے حلیف ان کے پیچھے برتاؤ سے ناراض ہوں گے۔ انہوں نے حکم دیا کہ توریت میں مفتوح دشمن کے ساتھ جو برتاؤ کرنے کا یہودیوں کو حکم ہے وہی برتاؤ ان یہودیوں سے کیا جائے۔ رحمۃ للعٰلمین مجبور ہو گئے اور حکم دیا کہ تمام بالغ مرد قتل کر دیے جائیں اور عورتوں بچوں کو غلام بنا کر ان کی پوری جائیداد کو غنیمت بنا لیا جائے۔ عورتوں کو قتل اسی لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ لڑتی نہیں ہیں ورنہ اسی معرکے میں ایک یہودی عورت نے ایک گڑھی کے اوپر سے چکی کے پاٹ نیچے گرائے جس سے ایک انجان مسلمان سپاہی شہید ہو گیا۔ اس جنگی جرم کی سزا میں اس عورت کو بھی گرفتاری کے بعد سزائے موت دی گئی۔ (سیرت ابن ہشام) مالِ غنیمت میں سے حکومت نے اپنے حصے کی لونڈیوں کو ہراج کر کے اس کی آمدنی سے بروایت سیرت شامی شام اور نجد کے بازاروں میں اسلحہ اور گھوڑے خریدے۔ زمینیں، مکان، باغ وغیرہ جائیداد غیر منقولہ عام سپاہیوں میں بانٹ دی گئی۔ (بلاذری)

اب مدینے میں یہودی بہت کم رہ گئے۔ ان کی شرارتیں کم ہو گئیں تو اسلامی حکومت کا برتاؤ بھی ان کے ساتھ انتہائی مروت کا ہو گیا۔ ان کے غریب قبائل کو سرکاری خزانے سے روزینے مقرر ہو گئے (جیسے بنو عریض، مدینہ منورہ میں احد پہاڑ کے مشرقی سرے پر اب بھی ان کی بستی مسجد عریض کے نام سے موجود نظر آتی ہے) ان کو شہر میں تجارت و حرفت کی پوری آزادی رہی حتیٰ کہ خود رسول اکرمؐ کی زرہ کریانہ اُدھار لینے کے باعث ایک یہودی کے پاس

گرو تھی اور اسی حالت میں آپؐ نے وفات پائی تھی یہودی ہمسایوں کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدارات کرتے اور بنفسِ نفیس ان کے بیماروں کی عیادت کرتے۔ ان کے جنازے گلیوں میں سے گزرتے اور آپؐ بیٹھے ہوئے ہوتے تو موت کے خدائی فعل کے احترام میں اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔

بنو قریظہ کے خاتمے پر خیبر کے بنو النضیر وغیرہ کی آتشِ غضب اور بھی بھڑک اٹھی سرخسی (شرح سیر کبیر ۱/۲۰۱) کے مطابق ان میں اور مکے والوں میں یہ معاہدہ ہو گیا کہ اگر اب مسلمان انسدادی مہم کے لیے مکے کی طرف جائیں تو خیبری اور اگر خیبر کی طرف جائیں تو مکی لوگ مدینے پر (جو فوجوں سے خالی رہے گا) چڑھ دوڑیں اور شہر کو لوٹ لیں اور اگر کسی طرف بھی نہ جا کر مدینے میں رہیں تو وسیع تر تیاریوں سے خندق ثانی کا انتظام ہو رہا تھا۔

سیاست کاری کے شہ کار صلح حدیبیہ نے اس حلیفی کا خاتمہ کیا اور قریشی اور خیبری محور ٹوٹ گیا۔ اور جب خیبر کی مہم میں اس طرح قریش کی ناطرفداری کا تعین ہو گیا تو مہینے بھر بعد ہی محرم ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کا محاصرہ فرما لیتے ہیں۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ مہم خیبر کی تیاریاں مدینے کی یہودیوں پر شاق گزریں مگر وہ اس کی راز میں اطلاع خیبر کو دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے، امام ابو یوسف کے بیان کے مطابق تو بنی قینقاع نے آنحضرتؐ کی مدد کی اور مالِ غنیمت سے انعام پایا (رد علی سیر الاوزاعی صفحہ ۴۰ و تعلیق سنن کبریٰ بیہقی ۹/۵۳) میں ان یہودیوں کی تعداد صرف دس بیان ہوئی ہے۔ بہرحال کافی جمعیت مدینے میں رہی اور چودہ سو جانباز خیبر گئے۔ فزارہ غطفان خیبر کی حلیف تھے۔ راستے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ناطرفدار رہنے کا حکم دیا۔ مدینے کی کھجور کا لالچ بھی دیا جو بے سود رہا اور جب انہوں نے نہ مانا تو فوجی نقل و حرکت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تبدیلی کی کہ ان عرب قبائل کو اپنی بستیوں اور بیوی بچوں کی حفاظت ہی ضروری ہو گئی اور خیبر کی پوری معرکہ آرائی میں پھر انہوں نے کوئی حرکت نہ کی (یہ لالچی خیبر کی فتح کے بعد اپنا حصے یا انعام مانگنے بھی بے غیرتی سے آئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈانٹ کر انہیں رخصت کر دیا جیسا کہ شامی نے لکھا ہے۔)

خیبر کا معرکہ بڑا سخت تھا۔ آتش فشاں لاووں سے پٹے ہوئے دشوار گزار میدانوں

میں جہاں جہاں کچھ زمین قدرتی آگ کی دستبرد سے بچ گئی تھی وہ زرخیز بھی تھی اور پانی کی وہاں افراط بھی۔ وہاں عظیم الشان نخلستان اب بھی ہیں اور یہودی دور کے شکستہ پرانے تالاب بھی۔ یہاں پہاڑیوں پر سات قلعے بھی تھے۔ اور یقیناً پوری بستی میں پچیس مربع میل سے کم رقبے پر مشتمل نہ رہی ہوگی۔ ان قلعوں میں سے ایک جو حصن مرتب تھا کھنڈر ہونے کے باوجود آج بھی سعودی گورنر کے لیے رہائش فراہم کرتا ہے اور وہاں سے پورے شہر کا طائرانہ نظارہ ہوتا ہے۔ سدا کا تالاب بھی اچھی حالت میں باقی ہے۔

خیبر کی دولت مندی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ قریش زمانہ جاہلیت میں شادیوں کے موقع پر ان ہی سے زیورات کرائے پر لیا کرتے تھے اور ایک مرتبہ ضائع شدہ زیور کا ہرجانہ دس ہزار دینار ادا کیا تھا (شرح سیر کبیر ۱/۱۸۳)

یکے بعد دیگرے یہ قلعے فتح ہوتے گئے اور بعض کی فتح میں مقامی یہودیوں نے بھی مدد دی چنانچہ شامی کی روایت میں حصن الزبیر کے ایک زمین دوز راستے کا پتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک یہودی ہی سے ملا جس سے قلعہ آسانی سے فتح ہوگیا۔ مغازی واقدی (ورق ۱۰۱ میں ہے کہ محصور یہودی اپنے قلعوں پر سے مسلمانوں پر منجنیقوں سے سنگباری بھی کیا کرتے تھے۔ منجنیق کا مال غنیمت آئندہ جنگوں میں مسلمان سپاہی طائف وغیرہ کے خلاف استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی گڑھیوں کے اوپر سے چکی کے پاٹ گرا کر انجان مسلمان کی شہادت کا ایک واقعہ پیش آیا تھا (شرح سیر کبیر ۱/۱۸۷)

دوران محاصرہ میں کسی یہودی کا ایک غلام (جو چرواہا تھا) آ کر مسلمان ہوگیا اسلامی قانون کے مطابق وہ فوری آزاد ہوگیا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ اپنے آقا سے خیانت نہ کرنا۔ چنانچہ وہ جانوروں کے گلّے کو ہانکتا ہوا اپنے آقا کے قلعے کے قریب تک گیا پھر للکار کر جانوروں کو بھڑکا دیا۔ وہ عادت کے مطابق خود ہی اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور یہ دیانتدار غلام واپس اسلامی پڑاؤ میں آ گیا۔

شدید کشمکش کے بعد آخر سب قلعوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان سے معاہدہ یہ ہوا کہ جسم کے لباس کے ساتھ مع بیوی بچوں کے ایک بنی دو نو گوش وہ وہاں سے جہاں ان کے سینگ سمائیں چلے جائیں۔ (بلاذری صفحہ ۳۳)

اس علاقے میں کوئی اسلامی آبادی نہ تھی اور یہودی آبادی کے فوری اخراج پر بستی اُجڑ جاتی، باغ ویران ہو جاتے اور غلّے کی پیداوار رُک کر ملک کی ضرورتوں میں دشواری ہی پیدا ہو جاتی۔ اس لیے خود یہودیوں کی خواہش پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا کہ تا حکم ثانی وہ خیبر میں رہیں اور اپنی زمینوں سے حسب سابق استفادہ کریں اور پیداوار نصفا نصف تقسیم ہو۔

بعد کے سالوں میں اسلامی تحصیلدار کا طرز عمل اس بٹائی میں اتنا منصفانہ ہوتا تھا کہ بے اختیار یہودی پکار اُٹھتے تھے کہ "اسی انصاف کے باعث زمین پر آسمان کھڑا ہے ٹوٹ کر گر نہیں پڑتا بٹائی کے سرکاری حصے سے آنحضرتؐ نے جو روز ینے مقرر فرمائے اس کی دو دستاویزیں تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں (ابن ہشام صفحہ ۷۷۵ تا ۷۷۶) اس میں ازواج مطہرات کے نام بھی ملتے ہیں۔ بی بی فاطمہ کا بھی حضرت ابوبکر بھی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ رشتہ دار بھی بعض دیگر مردوں اور عورتوں کا بھی نام ہے اور مغازی الواقدی ورق ۱۵۸ کے مطابق داری اور اشعری لوگوں کے لیے بوقت وفات آپؐ نے اسی سے وصیت بھی فرمائی۔

صلح کے بعد مسلمان سپاہی یہودی باغوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کی شکایت کی تو آنحضرت نے مسلمان سپاہیوں کو سخت تنبیہ فرمائی اور یہودی معاہد کنندوں کا مال ان کی مرضی یا اپنے حق کے بغیر لینا حرام بتایا (شرح سیر کبیر ۱/۹۳) اسی موقع پر حضرت علی کی روایت میں متعہ (عارضی نکاح) اور گدھے کا گوشت مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا گیا امتاع مقریزی (۱/۳۲۲) کے مطابق مال غنیمت میں سے توریت کے نسخے یہودیوں کو واپس کر دیے گئے۔ صلح کے بعد ایک یہودی عورت نے آنحضرتؐ کی ضیافت کر کے زہر دینے کی کوشش کی۔ آنحضرتؐ نے اسے اقرار پر معاف کر دیا۔

معاہدے کے تحت ہتھیاروں اور سونا چاندی فاتح کے سپرد کرنا ضروری تھا۔ بنو النضیر کا کنز یعنی خزانہ بلدیہ لاپتہ ہوگیا۔ آنحضرتؐ نے اس کے افسر خزانہ کے اطمینان دلانے پر کہ وہ جنگوں میں خرچ ہوگیا، یہ کہہ کر رہا کر دیا کہ اگر یہ بات آئندہ جھوٹ ثابت ہوئی تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ بعد میں ایک مقامی یہودی نے چغلی کھائی کہ ایک کھنڈر میں کوئی شخص اکثر

مشتبہ حالت میں گھوما کرتا ہے۔ وہاں کھدائی پر یہ خزانہ برآمد ہو گیا اور خزانچی کنانہ بن للربیع کو جھوٹ کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور اسی کی نوجوان بیوہ اس کی شرح کبیر کے مطابق رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی، بی بی صفیہ حرم نبوی میں داخل ہو گئیں۔ بی بی صفیہ کے باعث اسلامی حکومت کا برتاؤ بھی خیبر کے ساتھ نرم ہو گیا۔ اور یہ خود بھی اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ ہمیشہ صلہ رحمی کرتی تھیں۔ لکھا ہے کہ جب بی بی کی وفات ہوئی تو انہوں نے اپنی ایک تہائی جائیداد اپنے ایک یہودی بھانجے کے لیے وصیت فرمائی اسلام ایسی صلۂ رحمی اور فراخ دلی کی حوصلہ افزائی ہی کرتا ہے۔

خیبر کے آس پاس کے علاقوں میں یہودی بستیاں بہ کثرت تھیں۔ خیبر کا انجام اس رقبے میں دور رس اثرات کا باعث بنا۔ بسوط سرخسی جلد ۲۳ صفحہ ۲ تا ۷) کے مطابق بنو عذرہ بھی یہودی تھے انہوں نے بھی اب خاموشی سے اطاعت قبول کر لی۔

بلاذری (صفحہ ۳۲ تا ۳۵) کا بیان ہے کہ خیبر سے واپسی میں داؤی القری سے آنحضرتؐ ہی نے اطاعت کا مطالبہ کیا اور ان کے انکار کچھ کشمکش اور جنگ رہی اور انہیں مفتوح کی شرطیں۔ جو خیبر کے مماثل تھیں) مجبوراً قبول کرنی پڑیں۔ یہاں کی کچھ زمین (جو غالباً افتادہ تھی) بروایت بلاذری حمزہ العذری کو جاگیریں بھی عطا فرمائی گئی یہاں عمرو بن سعید بن العاص کو عہد نبوی میں گورنر بنایا گیا (صفدی ۱/۸۴ تا ۸۵) مدینے کے رخ میں فدک بھی پڑتا ہے بقول بلاذری آپؐ نے وہاں ایک مبلغ بھیجا۔ ان لوگوں نے گھبرا کر لڑے بھڑے بغیر خود حاضر ہو کر خیبر کی شرطوں پر امن طلب کیا جو اس میں دے دیا گیا اسے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خاص کے لیے معین فرمایا یعنی یہاں کی آمدنی سے اپنے اور اہل وعیال کے مصارف زندگی ادا فرماتے اور جو بچ رہتا وہ عام مفاد ملی میں خرچ ہو جاتا (ابن ہشام صفحہ ۷۶۴) صفدی کے مطابق فدک ومضافات کا گورنر الحکم بن سعید بن العاص کو بنایا گیا۔

خیبر کو بہ ظاہر مکمل داخلی خود مختاری حاصل تھی وہاں کوئی مسلمان گورنر مامور نہیں ہوا حتی کہ ایک مرتبہ ایک انصاری (یرثی) مسلمان مسافر وہاں مارا گیا تو خون بہا کے لیے آنحضرتؐ نے یہودیوں ہی کو خط لکھا اور ان کے قسمیں کھانے پر کہ یہ یہودیوں کا فعل نہیں ہے خون بہا مدینے کے سرکاری خزانے سے ادا کیا گیا (ابن ہشام صفحہ ۷۷۸، نیز موطا امام مالک)

۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ پھر جلدی ہی طائف کی باری آئی، طائف میں یہودی تو کافی تعداد میں تھے۔ لیکن بہ ظاہر تجارت وحرفت اور سود خواری کے سوا انہیں وہاں سیاسیات میں کوئی خاص اثر حاصل نہ تھا۔ بلاذری صفحہ ۵۶ ان کا ذکر تو کرتا ہے لیکن طائف کے معاہدے میں ان کا کوئی خصوصی ذکر نہیں ہے بجز اس کے کہ ثقیف کے "تجارتی معاملت" وار سے یہی مراد ہوں۔

۹ھ میں تبوک کی عظیم مہم پیش آئی اس میں تیس ہزار مسلمان تھے۔ اتنی بڑی جمعیت کبھی عہد نبوی کے کسی اور معرکے میں نظر نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ آس پاس کی چھوٹی بستیاں آسانی اور خاموشی کے ساتھ مطیع ہو گئی ہوں گی جربا، اذرح تیماء اور مقنا زیادہ تر یہودی بستیاں معلوم ہوتی ہیں۔ جرباء واذرح نے فی کس سالانہ ایک دینار کے جزیے پر آمادگی ظاہر کی اور انہیں اسی شرط پر امان عطا ہوا۔ (ابن سعد)

تیماء کی اطاعت کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ وادی القریٰ کا حشر دیکھ کر انہوں نے خود پیش قدمی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امن کی درخواست کی۔ ان کے معاہدے میں جزیے کا ذکر ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ بھی تبوک کے لگ بھگ زمانے کا واقعہ ہے کیونکہ جزیہ زیادہ تر اسی زمانے کے معاہدوں میں ملتا ہے۔ یہاں کے گورنر یزید بن ابن سفیان تھے (صفدی ۱/۸۴ تا ۱/۸۵) جو فتح مکہ کے وقت ۸ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ جو بھی ہو فوج کشی کے بغیر اطاعت کے باعث ان سے خاص رعایت کی گئی۔ ان کا معاہدہ جو تاریخ نے محفوظ کیا ہے اختصار وجامعیت کا کمال اور اس زمانے کی سیاسی تسوید کا دلچسپ نمونہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مہربان رحم والے اللہ کے نام سے یہ تحریر ہے اللہ کے رسول محمد کی طرف سے بنو عادیا کے لیے ان کے لیے ذمہ داری ہے اور ان پر جزیہ نہ ظلم ہو گا اور نہ جلا وطنی رات (اس معاہدے) اور اند کیا کرے گی تو دن اس میں شدت پیدا کیا کرے گا۔ (اسے) خالد بن سعید نے لکھا۔

بنو عادیا کے نام اور تیما کے ذکر سے گمان ہوتا ہے کہ اس سے مراد وفاداری میں ضرب المثل یہودی سموال بن عادیا کا خاندان ہے جو مسعودی (التنبیہ والاشراف صفحہ ۲۵۸) کے مطابق تیماہی میں حکمران تھا۔

مقنا کا معاملہ کافی پیچیدہ ہے۔ خلیج عقبہ کی یہ بندرگاہ بھی غالباً یہودی عیسائی جھگڑوں کا ہدف بنی ہوئی تھی اور یہاں کے یہودیوں کو ایلہ والے عیسائی پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ایلہ سے معاہدہ ہوا تو آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ اہل مقنا کو زاد راہ و سامان دے کر ان کے وطن واپس کر دیا جائے (ابن سعد) یہ گمان ہوتا ہے کہ تبوک میں یہودی آ کر آنحضرت کی مدد اور رہبری کرنے لگے تھے۔ خود مقنا والوں کا معاہدہ ایک معمہ ہے ان سے کسی جنگ کا پتہ نہیں چلتا اس کے باوجود ابن سعد میں ان کا جو معاہدہ درج ہے، اس کے مطابق ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہتھیار، اپنے غلام، اپنے جانور، اپنے کپڑے، اپنے نخلستانوں کی ربع پیداوار، شکار ماہی کا چوتھائی حصہ اور عورتوں کی کتائی کا بھی چوتھائی حصہ اسلامی حکومت کو ادا (کیا؟) کریں البتہ انہیں جزیے سے معاف اور مستثنیٰ کر دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ساری گزشتہ و آئندہ خطائیں بھی معاف کر دیں اور آخر میں یہ کہ انہیں بیگاری اور جبری خدمت سے بھی معاف کر دیا گیا (مگر کیا عہد نبوی میں بیگاری تھی؟) اور وعدہ کیا گیا کہ ان کا سردار یا تو ان ہی میں سے ہوگا یا اہل رسول اللہؐ میں سے ہوگا۔ اس کے چند دن بعد بلاذری نے اپنی تاریخ فتوح البلدان لکھی اور اس معاہدے کے چشم دید نسخے کا جو متن دیا ہے اس میں کچھ مزید اضافے تھے اولاً سارے بہائے ہوئے خون کی معافی۔ دیگر یہ کہ ان کی بستی کا ان کے سوا کوئی مالک نہ ہوگا بجز رسول اللہؐ یا رسول اللہ کے کسی فرستادے کے۔ ہتھیار، لباس، غلام وغیرہ کی حوالگی کے ذکر میں یہ جملہ ہے کہ بجز اس کے جو رسول اللہؐ یا آپ کا فرستادہ مستثنیٰ کر دیں۔ ان کی بستی کا سردار یا تو ان ہی میں سے ہوگا یا ''اہل بیت رسول اللہ میں سے (ابن سعد پر لفظ بیت کا اضافہ!) پھر آخر میں کاتب کا نام بھی ہے۔ ''علی بن ابو (کذا) طالب اور تاریخ بھی کہ ۹ھ تاریخ کے سلسلے میں اگرچہ ایک روایت صبح الاعشیٰ قلقشندی ۳۴۰/۶ اور الترتیب الادار یہ مؤلفہ کتانی ۱۸ تا ۱/۸۱ میں ہے کہ سنہ ہجری کی ایجاد خود جناب رسالتؐ کے حکم سے ہوئی مگر طبری وغیرہ کی روایت ہی عام طور پر مسلمہ ہے کہ یہ ۱۶ھ میں حضرت عمرؓ کی ایجاد ہے۔ لہٰذا ۹ھ کی دستاویز میں اس کا ذکر مشتبہ ہے ممکن ہے اس جعلی دستاویز ہی کی اساس پر قلقشندی وغیرہ کو دھوکا ہوا ہو۔

اس معاہدے کی ایک تیسری روایت یہودی گنیزہ مصر کے ایک مخطوطے میں عربی زبان مگر عبرانی رسم الخط میں ملتی ہے اس کے مطابق یہ معاہدہ مقنا کے ساتھ ساتھ اہل خیبر اور اس کی اولاد کے حق میں قیام قیامت تک کے لیے ہے۔ رعایتوں کی وجہ بی بی صفیہ کا ازدواج بیان کیا گیا ہے جو خیبر والی تھیں ہتھیار، غلام، مال و متاع کی حوالگی نہیں ہے بلکہ وہ سب یہودیوں ہی کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ مزید برآں انہیں سرکاری ٹیکس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ نیز یہودیوں کو خصوصی لباس پہننے اور خصوصی رنگ کا کمر بند باندھنے سے (ان میں کوئی چیز بھی عہد نبوی میں نہ تھی!) انہیں عمدہ لباس پہننے ہتھیار باندھنے اور گھوڑوں پر سواری کرنے کی بھی اجازت ہے (گویا عہد نبوی میں کسی پر ایسی کوئی ممانعتیں تھیں نہ کسی مسلمان کے قتل عمد پر ان سے عدالت میں وہی برتاؤ کیا جائے جو قاتل کے مسلمان ہونے کی صورت میں ہوتا۔ انہیں دیگر تمام ذمیوں پر فوقیت و اولیت عطا کی گئی ہے۔ یہ مسجدوں میں داخل ہو سکتے اور اپنے جنازے شہر کی شاہراہوں پر سے لے جا سکتے ہیں (ان کی بستی میں بوقت معاہدہ مسجدیں کہاں اور شاہراہوں میں مسلمانوں کا اعتراض کہاں!) اور سب سے دلچسپ یہ کہ ان یہودیوں کو اسلام لانے پر اہل بیت نبوی کا فرد قرار دے دیا گیا ہے۔ آخر میں ۵ھ ہے (مقنا ۹ھ میں مطیع ہوا، اور خیبر ۷ھ میں!)

۹ھ کا معاہدہ مقنا کم و بیش اسی نہج کا ہونا چاہیئے جیسا جرباء و اذرح کا جو بغیر لڑے بھڑے خوشی سے مطیع ہوئے تھے۔ قصہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ مامون وغیرہ کی آزاد خیالی اور بے راہ روی کا جب ردعمل ہوا اور خلیفہ متوکل ۲۳۲ تا ۲۴۷ھ وغیرہ نے غیر مسلم رعایا پر کچھ سختیاں کیں تو ان سے بچنے کے لیے وہ دستاویز تیار ہوئی جو ابن سعد اور بلاذری کے زمانے میں ملتی ہے۔ اس میں کپڑوں اور ہتھیار کی حوالگی کا جو ذکر ہے وہ جیسا کہ یاد ہو گا۔ خیبر کے معاہدے میں درج تھا۔ اب اس جعل سازی کے وقت خیبر اور مقنا کے پرانے روایات و الفاظ کو بھی لے لیا گیا اور کچھ رعائتیں بھی اپنے لیے لکھ لیں تاکہ خلیفہ متوکل کو اس سے متاثر کیا جائے کہ یہ رسول اللہ کا حکم ہے۔ پھر جب مصر میں فاطمی خلافت آئی (جس کا مقنا پر قبضہ تھا) اور خاص کر الحاکم بامر اللہ نے اپنے ایک جنون کے زمانے میں یہودیوں وغیرہ پر بے پناہ مظالم ڈھانے شروع کئے تو وہ دوسری دستاویز گھڑی گئی

جو[1] اب مصر کے یہودی گنیزے سے برآمد ہوئی ہے اور سابق دستاویز میں فاطمی رجحانات کے لحاظ سے نمک مرچ لگا کر بہت سے ایسے حقوق حاصل کئے گئے جو عہد نبوی میں تو ہر کسی یہودی کو حاصل تھے لیکن فاطمی دور میں نہ تھے۔ ہرشفیلڈ[2] لیشسکی[3] اور اشپر[4] بر تین یہودی فضلا نے حالیہ زمانے میں اس پر مضمون لکھے ہیں۔ اور اس دستاویز کو اصلی قرار دینے میں پورا زور ذہانت خرچ کیا ہے۔ لیکن مذکورۂ بالا وجوہ سے ہم اس دستاویز کے جملہ متنوں کو جعلی سمجھنے پر مجبور ہیں۔

قران مجید میں مفتوح اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم غالباً اسی زمانہ ۹ھ میں نازل ہوا تھا۔

بحرین کا ایرانی گورنر منذر بن ساوی غالباً ۶ھ میں مسلمان ہوا تھا آنحضرتؐ نے اسے اس کے عہدے پر برقرار رکھا۔

رسول کریمؐ کا منذر کے نام خط ایک ابن طولون وغیرہ کے ہاں ملتا ہے اس میں یہ ہے کہ "جب تک تو کام اچھا کرتا رہے گا تجھے خدمت سے معزول نہیں کیا جائے گا اور جو لوگ مجوسیت اور یہودیت چھوڑنا نہ چاہیں ان پر جزیہ لگایا جائے گا۔" خوش قسمتی سے یہ اصل خط اب دستیاب ہوگیا ہے۔ اس خط کے آنے پر منذر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ بحرین کے یہودیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے (مکتوب ابن سعد میں ہے) آپ کا جواب امام ابو یوسف وغیرہ کے ہاں محفوظ ہے کہ جو لوگ تبلیغ اسلام پر بھی مسلمان ہونا قبول نہ کریں ان سے سالانہ ایک دینار جزیہ لیا جائے۔ غالباً یہ پوری خط و کتابت بھی ۹ھ کی ہے اور شاید غزوہ تبوک سے کچھ پہلے کی۔ کیوں کہ چند دن بعد ابو ہریرہؓ وغیرہ کو بحرین بھیجا جاتا ہے اور منذر کے پاس جمع شدہ جزیہ سپرد کرنے کی ہدایت ہوتی ہے نیز ایک اور مسلمان حاکم کو لکھا جاتا ہے

۱۔ اس کا ذکر یاقوت اور ابن القیم بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے دور سے پہلے کی جعل ہے۔ صدی نے وافی بالوفیات ۳۴۴ تا ۳۴۵/۱۵ میں اس کا کچھ ذکر کیا ہے۔ ابن کثیر نے بھی اس پر ایک رسالہ لکھا ہے۔

۲۔ ہرشفلڈ کی جرمن کتاب "یہودی عرب میں" صفحہ ۱۱۰۷ اور مابعد۔

۳۔ انگلستان کے رسالہ جوئش کوارٹرلی ریویو ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۱۷ تا ۳۳۷ میں اس کا مضمون۔

۴۔ اس کا مضمون جرمن رسالہ ایم ایس او ایس ۱۹۱۶ء صفحہ ۴۸ تا ۵۱ میں۔

کہ مقامی مسلمانوں سے وصول شدہ محاصل (خاص کر زکوٰۃ) بھی ان ہی کے ہاتھ مدینہ روانہ کر دے۔ یہ ساری رقمیں غزوۂ تبوک کی تیاری میں خرچ ہوئیں۔

اسی کے لگ بھگ زمانے میں یمن کے گورنروں کے نام جو نامہ ہائے مبارک گئے ہیں ان میں بھی مقامی یہودیوں پر جزیہ لگانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ایک خط میں جو ابن ہشام وغیرہ میں ہے یہ الفاظ ہیں "جو یہودی اپنی یہودیت نہ چھوڑنا چاہے اس پر جبر نہ کیا جائے البتہ اس پر جزیہ لگایا جائے گا۔"

متفرقات

عہد نبوی میں قرآنی احکام کے مطابق یہودی رعایا کو عدالتی و قانونی خود مختاری حاصل تھی ان ہی کے فریقین مقدمہ ان ہی کے حکام عدالت اور ان ہی کا قانون۔ البتہ انہیں اجازت تھی کہ اپنی خوشی سے چاہیں تو مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش کریں اس قسم کے بعض مقدمات کی سماعت خود جناب رسالتؐ نے فرمائی اور قانون شخصی یعنی توریت کے مطابق حکم دیا مثلاً لکھا ہے کہ ایک زنا کا مقدمہ پیش ہوا۔ اور چار یہودیوں نے شہادت دی۔ آنحضرت نے یہودیوں ہی سے پوچھا کہ اس بارے میں تمہارا قانون کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ منہ کالا کر کے تشہیر آپ کا اطمینان نہ ہوا۔ توریت منگوائی اور پڑھوا کر معلوم کیا کہ سزا میں سنگسار کرنا چاہیئے۔ حب سزا نافذ کی گی (بخاری ابن ہشام وغیرہ)۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ آج کل جو توریت ملتی ہے اس میں ایسی سزا کا ذکر نہیں ہے لیکن انجیل میں یہ قصہ اب بھی ملتا ہے کہ ایک عورت کو زنا کے باعث پکڑ کر حضرت عیسیٰؑ کے پاس لایا گیا اور کہا گیا کہ "توریت میں اس کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ استاد اب آپ کیا حکم دیتے ہیں" وغیرہ اس سے سیرت نگاران عہد نبوی کے بیان کی توثیق ہوتی ہے اور قرآنی دعوائے تحریف توریت کی تائید۔

مدینہ منورہ میں ایک یہودی نے نہایت بے رحمی سے ایک عورت کا سر پتھروں سے کچل کچل کر مارا تھا۔ آنحضرتؐ نے اس کو بھی توریتی قصاص کے انداز میں اسی طرح قتل کرنے کا حکم دیا۔ (بخاری تفسیر طبری وغیرہ)

عربی ادبیات میں یہودی قدیم سے مختلف قسم کی شہرتیں رکھتے آئے ہیں ان میں

سموال بن عادیا جیسے عہد کو وفا کرنے اور بات کا پاس کرنے میں جان پر آن نہ جانے کو کر دکھانے والے بھی گزرے ہیں۔ عرقوب[1] جیسے ضرب المثل جھوٹے اور بدعہد بھی۔ قرآن میں بھی ان کے متعلق ذکر ہے کہ "ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ایک خزانہ امانت رکھاؤ تو واپس کر دیں لیکن دوسرے ایسے ہیں کہ ایک دینار بھی امانت رکھاؤ تو واپس نہ کریں جب تک کہ سر پر نہ کھڑے رہو۔" اور ان میں تصور یہاں تک ہو گیا تھا۔ کہ "غیر یہودیوں کے متعلق کوئی حق، کوئی ذمہ داری اور پابندی ہے ہی نہیں" ۳/۷۵ روپے کی پرستش کے ساتھ موت کا ڈر یا بزدلی بھی بار بار قرآن میں بیان ہوتی ہے۔ (۲/۹۴، ۲/۹۶، ۶۲/۷) بزدلی اور بے رحمی عموماً توأم ہوتے ہیں۔ ان کی قساوت قلبی کی بھی قرآن کو شکایت ہے۔ (۲/۷۴) ان کی بدکاری اور فحش پسندی کا بھی بار بار گلہ ہے۔

یہودی تاریخ کا ایک قرآنی تذکرہ کافی قانونی اہمیت رکھتا ہے پارۂ سیقول کے اواخر (۲/۲۴۳ و مابعد) میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد یہودیوں میں ایک نبی آئے۔ یہ بظاہر ان میں فوجی اور انتظامی صلاحیت زیادہ نہ تھی۔ یہود نے ان سے آ کر خواہش کی کہ وہ ایک بادشاہ مامور کریں جس کے ساتھ جا کر وہ جہاد فی سبیل اللہ کر سکیں۔ انہوں نے سمجھایا کہ جنگ کا نام نہ لو ایک مرتبہ وہ خدا کی طرف سے فرض ہو جائے اور تم جی چراؤ تو اچھا نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا۔ ہم کیوں جی چرائیں ہمیں اپنے گھر بار اور آل و اولاد سے نکالا گیا ہے۔ پھر ان پر ساول نامی شخص کو طالوت یعنی بادشاہ مقرر کیا گیا اور بتایا گیا کہ وہ خدا کا انتخاب ہے۔ یہودیوں نے اعتراض کیا کہ وہ مفلس ہے مگر پیغمبر نے بتایا کہ اسے خدا نے علم و جسم کا وافر حصہ عطا کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قصے میں عبادت و سیاست میں تفریق کا ذکر ہے اور تقسیم اختیارات کر کے نبی کا شعبہ کار الگ اور بادشاہ کا شعبہ عمل الگ مقرر کیا گیا اگرچہ دونوں ہی احکام الٰہی کے تابع رہے۔ اور اخلاق سوزی نہ مذہب میں روا رکھی گئی نہ سیاست میں۔ غالباً یہی روایات ہیں جو بعد میں یورپ میں پھیلیں۔ اگرچہ سیاست کو احکام الٰہی کی جگہ مصلحت ملکی یعنی ہوا و ہوس کے تابع کرنے سے دودھ میں مینگنی پڑ گئی لیکن اصول اپنی جگہ قائم ہے کہ اگر جملہ فرائض سرکاری کی انجام دہی ایک فرد کی صلاحیتوں سے بالا ہو تو تقسیم کار کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ یہ مولانا مناظر احسن کی تحقیق ہے ورنہ عرقوب عموماً عمالقہ کا سمجھا جاتا ہے۔

یہودیوں پر عیسائی دو ہزار برس سے "خدا کشی" کے الزام میں مظالم ڈھاتے چلے آ رہے ہیں اور عیسائیوں کے ہر جوش جنون کے وقت گزشتہ چودہ سو سال سے اسلامی ممالک یہودیوں کو پناہ دیتے آ رہے ہیں لیکن حیرت ہے کہ یہودی پھر بھی عیسائیوں ہی کے گرویدہ ہیں اور اسلام کے خلاف انہیں سے حلیفی کرتے ہیں۔ یہ آج نہیں عہد نزول وحی میں بھی ایسا ہی تھا۔ چنانچہ یہودیوں کی طرف سے تجربوں کی تلخی اور اس عجیب و غریب مشاہدے پر مسلمانوں کی جو نفسیاتی کیفیت ہوگی اس کے مطابق قرآن مجید میں ایک حکم نازل ہوا۔ یہ بہ لحاظ نزول تقریباً آخری یعنی ایک سو بارھواں (۱۱۲) سورہ ہے (یعنی سورۂ مائدہ) جس میں (۵/۵۱) ارشاد ہوا۔

> اے ایمان لانے والو۔ یہود اور انصاریٰ کو دوست نہ قرار دو۔ یہ ایک دوسرے کے ہی دوست ہیں اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائے تو وہ ان ہی میں کا ہے یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس کے کچھ دن بعد سورۂ برأت نازل ہوئی جس میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ برتاؤ کا عام اصول یعنی جزیہ لگانے کا حکم نازل ہوا۔

یہ ہے کہ ابتدائی خاکہ جو عہد نبوی کے اسلامی یہودی تعلقات کے متعلق مرتب ہو سکا ہے۔ اس کی تحریر کے زمانے میں علمی نقطۂ نظر سے ایک صحرا میں ہوں جہاں پانی نہ ملنے کی وجہ سے وضو کی جگہ تیمم کرنی پڑی ہے۔

تتمہ

تاریخ ابن کثیر (۳/۲۱۵) میں مسجد نبوی کی تعمیر میں مٹی ڈھوتے وقت صحابہ جو گیت گاتے تھے اس میں یہ شعر خیبر والوں کی طرف چوٹ کرتے ہوئے ہے کہ:

ھذا الحمال لا حمال خیبر ھذا ابر ربنا واطھر

خیبری حمالوں کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں کیا ہے۔

پکھتالؒ نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے دیباچے میں یہ قابل غور نظریہ پیش کیا ہے آخری نبی آنے کے سلسلے میں یہودی تصور یہ تھا کہ اس کے باعث یہودی قوم دنیا میں ایک حکمران ذات بن جائے گی۔ لیکن جب وہاں شعوب و قبائل کی مساوات اور صرف اکرمکم عند اللہ اتقاکم کا اصول قائم ہوا تو وہ مایوس اور برگشتہ ہو گئے۔

عام قبائل عرب سے تعلقات

ایک حدیث میں ایک بڑے اہم سماجی مشاہدے کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ کہ ''جب خدا کو کسی قوم کی بھلائی منظور ہوتی ہے تو اس کے حکمران اور وزیر اچھے لوگوں کو بناتا ہے اور جب برائی مطلوب ہوتی ہے تو حکمرانی وزارت پر بُرے لوگ فائز کیے جاتے ہیں۔'' اسی کو بعض وقت ''الناس علی دین ملوکھم'' کی ضرب المثل میں بیان کیا جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بہت اچھے اور بہت بُرے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں اور باقی لوگ محض اقتداء کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہوتے تو یہ آرام پسند ہیں لیکن نگرانی رہے تو گزرائی کی حد تک نیک بھی رہتے ہیں دیگر مذاہب کی تعلیم پر نظر ڈالو تو وہ اوسط انسانوں کی جگہ فرشتہ خصلت انتہا پسندوں کے لیے قابل عمل معلوم ہوتی ہے۔ اسلام اس کے برخلاف اوسط انسانوں کے لیے آیا اور رہبانیت و ترک دنیا اور طیبات و زینت ہائے دنیا کی اپنے آپ پر تحریم کی علانیہ حوصلہ شکنی کی۔

کچھ تو اس بنا پر اور شاید کچھ اس بنا پر بھی کہ عرب میں ابھی تک زیادہ تر قبائلی دور دورہ اور انفرادی بے لگام آزادی ہی کی روایتیں چلی آرہی تھیں۔ اور تجربہ و مشاہدہ ہے کہ راسخ عادتیں چاہے بُری ہی کیوں نہ ہوں، بغیر کسی نہ کسی طرح کے جبر کے مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ [1]

1۔ اسلام میں غلامی کی اجازت بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ سابقہ تمدنوں میں چاہے وہ سزا اور مال غنیمت کی حیثیت کیوں نہ رکھتا ہو کہ اس کی خدمات سے مفت فائدہ اُٹھایا جائے، اسلام میں غلامی کی اجازت صرف اصلاح ذہنی کے لیے ہے اور جیسے ہی مردم خوار یا چھوت چھات کو ضروری سمجھنے والے یا اور اسی طرح کی برائیوں میں مبتلا انسان چند روز نگرانی کے بعد دماغی تربیت و اصلاح پا جائیں تو ان کو بطریق مکاتبت آزاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے جیسا کہ ''کاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا'' کی تفسیر حضرت عمرؓ سے مروی ہے اور اس آزادی میں حکومت کے خزانے سے بھی مدد قرآن نے لازمی قرار دی ہے۔

غرض مختلف وجوہ اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی اصلاحی کوشش اور تبلیغی نتائج کے تجربے کی روشنی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی مناسب نظر آیا کہ دین و دنیا، عبادت و سیاست، معاد و معاش سب میں باہم ربط پیدا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں ذہنی و سماجی اصلاح کی تحریک حکومت کی جانب سے عمل میں لائی جائے تاکہ اس کی کامیابی تیز تر بھی ہو اور حکومت جیسے طاقتور و باوسائل ادارے کے تصادم کے بڑے نتائج اور حصول مقصد میں تعویق سے بچ جائیں۔ چنانچہ ہجرت مدینہ میں بھی پہلے کے زمانے میں آپ تبلیغ کرتے ہوئے اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ میری مدد کرو تو خدا قیصر و کسریٰ کے تاج تمہارے قدموں میں لالڑھکائے گا۔ منا، مجنہ، ذوالمجاز اور عکاظ کے میلوں میں بھی آپ یہی فرماتے رہے اور طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے قبائلی سرداروں سے بھی یہی کہا۔

اور جیسے ہی اوس وخزرج کے اولین قبائل نے اس دعوت پر لبیک کہا تو آنحضرتؐ نے ان کی سیاسی تنظیم اور مرکزیت کا سامان کر دیا۔ ہجرت سے کوئی دو سال پہلے بیعت عقبہ ثانیہ میں ہر ایک سے علاوہ اور اقراروں کے یہ اقرار لیا کہ ''سننا اور اطاعت کرنا ہمارا شیوہ رہے گا چاہے حکم ہمیں پسند ہو یا نہ پسند آپ ہمارے سردار رہیں گے اور جس عہدے پر مامور کیا جائے ہم اس سے اختلاف نہیں کریں گے۔ اور ہم جہاں بھی رہیں حق کا بول بالا کریں گے اور خدا کے حکم کے سامنے ہم کسی لومۃ لائم کی پروا نہیں کریں گے اور کسی نیک کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کرینگے۔ اس کے ایک سال بعد بیعت عقبہ ثالثہ ہوئی تو جہاں ان لوگوں نے صراحت سے اقرار کیا کہ ''اگر آپ اور آپ کے مکی ساتھی ترک وطن کر کے مدینہ چلے آئیں تو ہم آپ سب کی ویسی ہی مدد و حفاظت کریں گے جیسی اپنے بیوی بچوں رشتہ داروں کی کرتے ہیں، چاہے اس میں سرخ و سیاہ (یعنی ساری دنیا) ہی سے جنگ کرنی کیوں نہ پڑے۔'' وہیں جن بارہ قبائل مدینہ نے نمائندے بھیج کر اپنے اسلام کی آپ کو اطلاع دی تو ان ہی کے حسب انتخاب ہر ایک کا ایک ایک نقیب (بطور اپنے نائب کے) مقرر کر دیا۔ یہ لوگ تاریخ میں انصار کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ معاہدہ معاشری کا ایک حقیقی واقعہ تھا جس میں چند لوگوں نے راضی خوشی ایک شخص کو اپنا سردار اور حکمران مقرر کیا۔ اگرچہ انصار کے تعلقات میں اس کے بعد بھی دو ایک امور سیاسی

تاریخ میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً مدینہ ہجرت کرانے پر چند درجن مکی خاندانوں کا اہل مدینہ میں سے اتنے ہی کھاتے پیتے گھرانوں کے ساتھ مواخات یعنی بھائی چارہ کرا دینا اور اس سلسلے میں ایک طرح کا مشترکہ ذمدان اور مشترکہ جائیداد عارضی ضرورتوں کے لیے عارضی طور پر مسلمانوں میں نافذ کرنا! اسی طرح شہر مدینہ کو ایک شہری مملکت قرار دے کر اس کے حدود نصب کرانا، اس کے لیے ایک دستور مرتب کر کے نافذ کرنا اور اس شہری مملکت کو ایک وفاقی نظام دے کر اس میں آس پاس کی یہودی بستیوں کو بھی شرکت کا موقع دینا وغیرہ۔ لیکن یہ سیاسی ''تعلقات'' نہیں۔ اندرونی سیاسی ''انتظامات'' ہیں ان کو یہاں حذف کیا جا سکتا ہے۔ دستور مدینہ کے لیے البتہ کتاب ''عہد نبوی کا نظام حکمرانی'' جلد اول ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا سیاسی انتظاموں میں چند ہفتے ضرور لگے ہوں گے۔ اس کے بعد حدود مملکت کی حفاظت کے مسائل کو حل کرنا تھا۔ قریش کی سازشیں رہی تھیں اُنہوں نے اپنے معاشی اثر سے کام لے کر اہل مدینہ کو دھمکانا شروع کیا کہ رسول کریمؐ اور آپ کے ساتھیوں کو مدینے سے نکال دیں اسی طرح مدینے کی تجارت درآمد و برآمد پر بھی قریشی کاروانوں کا اثر پڑتا ہر آئین لازمی تھا۔

جہینہ اور ضمرہ کے قبائل

اس کا پتہ تو نہیں چلتا لیکن امکان ہے کہ مدینے کے قبائل انصار نے آس پاس کے بعض قبائل سے دوستی اور حلیفی زمانہ جاہلیت میں بھی رکھی ہو (جس ہمسایہ یہودی قبائل سے کی تھی اور ان یہودی قبائل نے غطفان وغیرہ شمالی عرب کے قبائل سے دوستی رکھی تھی) اگر ایسا رہا ہے تو یقیناً وہ معاہدے اسلامی مملکت کو ''وراثت'' میں ملے ہوں گے۔ رمضان ۱ھ میں ہجرت کے چھے ہی ماہ بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے متعلق اپنی سیاست متعین کر لی تھی کہ ان پر معاشی دباؤ ڈالا جائے (اور مسلمان مہاجرین کی مکے میں ضبط شدہ جائیداد کا گویا انتقام لیا جائے) اور اس سلسلے میں ایک فوجی دستہ قبائل جہینہ کے علاقے میں بمقام عیص بھیجا تو وہاں کا سردار مسلمانوں کا حلیف تھا۔ اس فوجی دستے میں کوئی انصاری نہ تھا۔ سب مہاجرین ہی تھے۔ اسلیے مجدی بن عمرو الجہنی سے یا تو آنحضرتؐ نے ہجرت کے بعد خود کوئی معاہدہ حلیفی کیا

تھا یا کم از کم انصار کی پرانی حلیفی کی تجدید کر کے اب اسے سارے مسلمانانِ مدینہ کے لیے (جن کے سیاسی سردار خود رسول اللہؐ بن گئے تھے) عام کر دیا تھا۔ ابن سعد ابن ہشام وغیرہ اس حلیفی کا ذکر تو کرتے ہیں مگر نہ تو معاہدہ حلیفی درج کرتے ہیں اور نہ کوئی مزید تفصیل کہ وہ کب اور کہاں طے ہوا تھا بجز اس ایک اہم اطلاع کے کہ مجدی بن عمرو مسلمانوں اور قریشیوں ہر دو کا حلیف تھا۔ اسی لیے اس نے قریش کے قافلے میں (جو تین سو اونٹوں پر مشتمل اور ابوجہل کی سرکردگی میں غالباً تجارتی کارواں کے طور پر گزر رہا تھا) اور مسلمانوں کے فوجی دستے میں (جو حضرت حمزہؓ کی سرکردگی میں ان کو ناکہ بندی کے توڑنے کی سزا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا) مڈ بھیڑ نہ ہونے دی بلکہ بیچ میں پڑ کر کارواں کو امن سے مکے کی طرف گزرنے دیا اور اسلامی دستہ واپس مدینہ چلا آیا۔ ایک ماہ بعد شوال میں ایک دستہ ابوسفیان کے کارواں کو روکنے کی غرض سے رابغ کی سمت بھیجا گیا اور ذیقعدہ میں خرار میں بھی اسی غرض کے لیے ایک دستہ بھیجا گیا۔

عیص، رابغ اور خرار سب پاس پاس مدینے کے جنوب مغرب میں ساحل کے قریب واقع ہیں اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں سے قریش کے تجارتی کاروانوں کو شام و مصر وغیرہ آنے جانے کے لیے گزرنا پڑتا تھا۔ قریشی کاروانوں کا راستہ بند کرنے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ اس علاقے کے قبائل سے دوستی کی طرح ڈالی جائے۔ ورنہ نہ تو بروقت اطلاعیں مل سکتیں اور نہ یہ خطرہ دور ہو سکتا کہ یہ قبائل اسلامی فوجی دستوں کو مدد دینے کی جگہ اس کے کام ہی میں آڑے آئیں اور دشمن یعنی قریش ہی کو مدد دیں۔

غالباً مذکورہ بالا تینوں مہموں میں ناکامی کے باعث حلیفوں کو توسیع کے مسئلے پر توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ ۲ھ کے آغاز پر صفر کے مہینے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک جمعیت کے ہمراہ مدینے کے جنوب مغرب میں کاروانی اسٹیشن ابواء تشریف لے گئے۔ قریشی کارواں اس مرتبہ بھی مسلمانوں کے بعد از وقت آنے کے باعث جا چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب خالی ہاتھ واپس جانے کی جگہ آس پاس کی آبادیوں سے تماس پیدا کیا اور بنی ضمرہ کے ایک سردار مخشی بن عمرو سے دائمی حلیفی کا ایک معاہدہ کیا۔ بظاہر یہ لوگ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے کیونکہ دینی جنگ صراحت سے مستثنیٰ کی گئی ہے۔ یہ اہم معاہدہ جو غالباً اولین بھی ہے یہاں درج کیا جاتا ہے

۱۔ مہربان۔ رحم والے خدا کے نام سے۔

۲۔ یہ ایک تحریر ہے اللہ کے رسول محمد کی طرف سے[1] بنی ضمرہ کے لیے۔

۳۔ اس بات پر کہ انہیں ان کے مال اور ان کی جان پر امن ہے۔

۴۔ اور یہ کہ انہیں ہر ایسے کے خلاف مدد دی جائے گی جو ظلم سے ان پر اچانک ٹوٹ پڑے۔

۵۔ اور ان پر واجب ہے کہ نبی کی مدد اس وقت تک کرتے رہیں جب تک کہ سمندر کسی سیپ کو گیلا کرتا رہے بجز اس کے کہ اللہ کے دین کے بارے میں وہ جنگ کریں؟
اس سے جنگ کی جائے

۶۔ ان پر اس بارے میں اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے۔

۷۔ اور انہیں مدد اس شرط پر دی جائے گی کہ وہ وعدہ وفائی کرتے رہیں اور (بُری باتوں، عہد شکنی وغیرہ سے) بچتے رہیں۔ (ابن سعد ۱/۲ ۲۷)

مورخ سہیلی کی روایت میں دفعہ ۴۔۵ ذرا مختلف ہیں۔

۴۔ اور یہ کہ انہیں ہر ایسے کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان کا قصد کرے بجز اس کے کہ دین کے بارے میں وہ جنگ کریں؟
ان سے جنگ کی جائے
اور یہ اس وقت تک جب تک کہ سمندر کسی سیپ کو گیلا کرتا رہے۔

۵۔ اور یہ کہ نبی جب ان کو اپنی مدد کے لیے بلائیں تو یہ آپ کو لبیک کہیں گے۔

سہیلی بڑے پائے کے محقق ہیں لیکن ابن سعد علاوہ محقق ہونے کے قدیم تر بھی ہیں۔ البتہ کئی امور قابل غور ہیں۔ آیا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا رواج ۲ھ میں ہو چکا تھا یا آنحضرتؐ کچھ اور لکھا کرتے تھے، دریافت طلب ہے۔ ابن سعد کی صفحہ ۴ کے الفاظ دستور مدینہ میں مستعملہ محاورے "دھم" پر مشتمل ہیں جو اس معاہدے کے لگ بھگ زمانے ہی میں نافذ ہوا تھا۔ دینی جنگ کا استثناء کس کے حق میں ہے، یہ بھی واضح نہیں۔ ابن سعد کی روایت کو لینے اور "یحارِبوا" (بصیغہ معروف) پڑھنے پر یہ معنے نکلتے ہیں کہ مدینے کی دفاعی جنگ میں مدد دینے

۱۔ ان قوسوں ( ) میں کی اتنی عبارت ابن سعد میں نہیں ہے۔ وہ سہیلی کی الروض الانف کی مدد سے بڑھائی گئی ہے۔

کی بنی ضمرہ پر پابندی عائد کی گئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر مذہبی ضروریات سے پیش قدم کر کے کہیں جائیں تو یہ قبیلہ غیر جانب دار و ناطرفدار رہے گا۔ اس پر شریک جنگ ہونے کی پابندی نہ ہوگی۔ سہیلی کی روایت لیں اور "یحارَبوا" (بصیغہ مجہول) پڑھیں تو یہ معنے نکلتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مدد دیں گے بجز اس کے کہ یہ قبیلہ خود شرارت کرے اور اسلام کے خلاف حرکتیں کرے تو یہ معاہدہ دوستی ختم ہو جائے گا۔ ابن سعد کے مطابق ان کے مسلمان ہو چکے ہونے کا امکان کم ہوتا ہے۔ سہیلی کے مطابق اس وقت ان کو مسلمان ہو چکا ہونا چاہیے۔ ابھی بدر کی دھاک بٹھانے والی جنگ بھی نہیں ہوئی تھی اور مسلمانوں کی مہمیں مسلسل ناکام ہی ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں بنی ضمرہ کے مسلمان ہو چکنے کا میری دانست میں کم امکان ہے جبکہ ان میں تبلیغ بھی نہیں ہوئی تھی۔ رسول اللہؐ ایک مہم میں آ کر ان سے ملے اور مختصر قیام کیا تھا۔ انہیں وجوہ سے میں ابن سعد کی روایت کو زیادہ صحیح سمجھتا ہوں جس کے مطابق وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے ہوں گے خاص کر اس لیے بھی کہ اس کے کچھ عرصہ بعد ان ہی کے ہمسایوں بنی مدلج سے جو معاہدہ ہوا۔ اس کے متعلق ابوعبید نے کتاب الاموال صفحہ ۲۲۸ میں صراحت کی ہے کہ وہ ۹ھ تک بھی مسلمان نہیں ہوئے اور ۹ھ میں سورۂ براۃ کے نزول پر ان کو بھی ایک نہائیہ (الٹی میٹم) دیا گیا کہ ان کا معاہدہ دوستی چار ماہ بعد ختم سمجھا جائے بجز اس کے کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔

ابن سعد نے بنی ضمرہ کے ایک اور معاہدے کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اسی معاہدے کی تحلیل ان الفاظ میں کی ہے۔

نہ آنحضرتؐ بنی ضمرہ سے جنگ کریں گے اور نہ یہ آپؐ سے اور یہ آپ کے خلاف جتھا بندی میں کسی کے ساتھ شریک نہ ہوں گے اور آپؐ کے خلاف کسی دشمن کو مدد نہ دیں گے۔

اس میں صاف طور پر دوستی اور ناطرفداری کا معاہدہ نظر آتا ہے اور اسلام لانے کا کوئی تصور بھی نہیں ہے۔

اوپر اولین مہم کے سلسلے میں قبیلہ جہینہ کا ذکر آیا اس کے ایک سردار مجدی بن عمرو کی مسلمانوں اور قریش دونوں کے ساتھ بیک وقت دوستی کا ذکر ہوا۔ اس قبیلے کی دو شاخوں سے

کئے ہوئے معاہدے کا متن ابن سعد نے محفوظ کیا ہے۔ اس کے شرائط کم وبیش وہی ہیں جو بنی ضمرہ کے معاہدے کے الفاظ تک مماثل ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی زمانے کا معاہدہ ہے اور سفر واپسی میں یا اس کے بین بعد آنحضرتؐ نے ان کی ان شاخوں کو اپنی مدد کا یقین دلا کر قریش سے توڑ لینے کی کوشش فرمائی وہ معاہدہ بھی درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ انہیں ان کی جان و مال پر امان ہے۔

۲۔ ان کو ہر ایسے کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان پر ظلم کرے یا ان سے جنگ کرے بجز دین اور اہل وعیال کے

۳۔ اور ان کے خانہ بدوشوں کو بھی جو معاہدے کی تعمیل اور (عہد شکنی سے) اجتناب کریں وہی حقوق ہوں گے جو ان کے بستیوں میں رہنے والوں کو ہیں۔

۴۔ اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے

اس کے صفحہ ۲ کے الفاظ "والاھل" (جن کا ترجمہ ہم نے "اور اہل وعیال" کیا ہے) کچھ واضح نہیں نہ بجرتی کے معلوم ہوتے ہیں۔ یا تو اس سے مراد خود قبیلے کی خانہ جنگی ہے یا یہ کہ اس کے بعد ہی کا لفظ "والاھل" کو کاتب نے سہواً مکرر لکھ دیا اور ناشر نے اس کو نباہا۔ میری ذاتی رائے یہی ہے۔ مجدی بن عمرو کے برخلاف ان کو جب تک مدد کا یقین نہ دلایا جاتا۔ بے سود ہوتا۔ ان کو قریش کے علاوہ مجدی کے حملے سے بھی بچانا ضروری تھا۔ اور غالباً مجدی سے انکے تعلقات کشیدہ ہونے کے باعث ہی انہوں نے مسلمانوں کی حمایت میں آنا قبول کیا تھا۔

جہینہ سے مسلمانوں کے تعلقات روز بروز بہتر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ عوسجہ بن حرملۃ الجہنی کو جو ذوالمروۃ میں رہتا تھا آنحضرتؐ نے ایک وسیع جاگیر کا پروانہ عطا کیا (ابن سعد وغیرہ) یہ مقام (ذوالمروۃ) ساحل کے قریب تھا۔ قریشی کارواں یہیں سے گزرتے تھے اور غالباً پہاڑی دشوار گزار علاقہ اور بہترین کمین گاہ تھا۔ صلح حدیبیہ کے شرائط کے تحت جب مکی مسلمان مذہبی ایذایابی کے باوجود مدینے میں آ پناہ گزیں نہیں ہو سکتے تھے تو ایسے چند مظلوم مسلمانوں نے حضرت ابوبصیر کی سرکردگی میں ذوالمروہ ہی میں اپنی جتھا بندی کی اور قریشی قافلوں کو ہراساں کرنا شروع کیا تھا۔ (ابن ہشام ص ۷۵۲ تا ۷۵۳) یقیناً عوسجہ بن حرملہ جاگیردار ہی نے انہیں اس کی سہولتیں مہیا کی ہوں گی۔ اسی طرح بنی شمخ (یا بنی شخ) کو بھی جو

جہینہ کی شاخ تھے، منہ مانگے علاقے کی جاگیر عطا ہوئی (ابن سعد دیبلی وغیرہ اس طرح قریش کا تجارتی راستہ بند کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔)

یہ ابتدائی زمانے کی چیزیں ہیں۔ جہینہ کے بنی الجرمز کو ایک امن نامہ اور ان کے علاقے کی سالمیت کی ضمانت ایک اور مکتوب نبوی میں (بحوالہ ابن سعد (دیبلی) اس وضاحت سے دی گئی ہے کہ اسلام لاتے وقت ان کے قبضے میں جو علاقہ تھا وہ انہیں کا سمجھا جائے گا۔ ممکن ہے یہ رقبہ کچھ نزاعی ہو اور خانہ جنگیوں میں اس کے ہاتھ سے نکلنے کا خوف اس قبیلے کے لیے اولاً اسلام لانے کی ترغیب کا باعث بنا ہو۔ یہ ممکن ہے بدر کے بعد کی چیز ہو۔

عہد نبوی کے آخری زمانے کی چیز یہ ہے کہ عمرو بن معبد الجہنی اور بنی الحرقہ و بنی الجرمز کو ایک خصوصی پروانے میں اس شرط پر امن دیا گیا ہے کہ وہ اسلام لائیں۔ نماز پڑھیں۔ زکوٰۃ اور مالگذاری بھی دیں۔ جنگوں میں مال غنیمت کا خمس[1] بھی مرکز کو دیا کریں اپنے غیر مسلم رشتہ داروں سے تعلق بالکل منقطع کر لیں اور صرف راس المال لے کر اپنے قرضوں کے سود سے دستبردار ہو جائیں اور یہ بھی صراحت ہے کہ جو اجنبی اس قبیلے سے بھائی چارہ کر کے اس میں ضم ہو جائیں ان کو بھی یہی حق یعنی امان حاصل رہے گا۔ (اس آخر الذکر شرط سے اس قبیلے کی غیر مسلم شاخوں کے سمجھدار افراد کو امن حاصل کرنے کا ایک آسان ذریعہ حاصل ہو گیا ہوگا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے "ایک یا دو مہینے پہلے" اس قبیلے کو ایک ہدایت نامہ بھیجا گیا تھا کہ جو جانور طبعی موت مر جائیں ان کے لاشے سے (چمڑوں پٹھوں کی حد تک بھی) استفادہ نہ کیا جائے، وہ نجس اور مردار ہیں (ابن طولون، ترمذی، طیالسی وغیرہ)

بنو ضمرہ سے دوستی اور حلیفی کا ابھی اوپر ذکر ہوا۔ یہ بھی بہت بڑا قبیلہ تھا اس کی ایک شاخ بنی عبد بن عدی تو مکے کے حدود حرم میں جا بسی گئی تھی۔ قریش کے اتنے قریب رہ کر ان کی

۱۔ زمانہ جاہلیت میں عرب قبائل اپنے سردار کو مال غنیمت کا مرباع یعنی چوتھائی حصہ دیدیا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اس میں تخفیف کر کے صرف پانچواں حصہ مرکز کے لیے رکھا اور باقی ۴/۵ غنائم سپاہیوں ہی کے لیے اس سے بھی بہت سے قبائل کو قریش وغیرہ کی جگہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کی ترغیب ہوئی ہوگی۔

مخالفت آسان نہ تھی تاہم ان کے رشتہ داروں کے دباؤ کا نتیجہ ہوگا کہ انہوں نے ایک وفد بھیج کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پیش کش کی کہ قریش کے ساتھ مصالحانہ تعلقات رکھتے ہوئے بھی یہ مسلمانوں کے دوست رہنا چاہتے ہیں اور قریش سے جنگ کی ایک چیز کو مستثنیٰ کرتے ہوئے باقی ہر طرح مسلمانوں کے حلیف بنا چاہتے ہیں۔ (ابن سعد ۲/۱_۳۸) قریش کو دوستوں سے بچھڑانے اور مسلمانوں کے دوست قبیلوں سے گھیر لینے کی پالیسی کو اس سے بہر حال مد ملتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیش کش کو قبول کر کے اپنی طرف سے امن کا اطمینان دلایا۔ اسی کی ایک اور شاخ بنو غفار کہلاتی تھی۔ حضرت ابوذر غفاری اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قبیلے کا معاہدہ الفاظ اور شرائط مندرجہ کے باعث جنگ بدر کے لگ بھگ زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ بنو غفار کے لیے

۲۔ یہ کہ وہ مسلمانوں میں سے (سمجھے جائیں گے) انہیں وہی حقوق ہوں جو مسلمانوں کے اور ان پر وہی واجبات جو مسلمانوں پر

۳۔ اور یہ کہ نبیؐ نے ان کے مالوں اور ان کی جانوں کے متعلق اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ داری کا معاہدہ کیا ہے۔

۴۔ اور انہیں ایسے (دشمن) کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان پر ظلم کے ساتھ پیش قدمی کرے۔

۵۔ اور یہ کہ نبیؐ جب ان کو اپنی مدد کے لیے بلائیں تو یہ آپؐ کو لبیک کہیں گے اور ان پر آپؐ کی مدد واجب ہوگی۔ بجز اس کے جو دین کے بارے میں جنگ کرے جب تک کہ سمندر کسی سیپ کو گیلا کرتا رہے۔

۶۔ اور یہ تحریر کسی گناہ کے مواخذے میں آڑے نہ آئے گی۔ (ابن سعد)

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری پہلے عیسائی تھے یا کم از کم عیسائیت سے سخت متاثر تھے۔ کیا بنو غفار کا یہ معاہدہ عیسائی ذمیوں سے ہو رہا ہے؟ معاہدے کی شق ۲ کا اگر دستور مدینہ کی شق ۲۵ سے مقابلہ کریں (جہاں ابو عبید کی روایت میں مدینے کے یہودیوں کو بھی امۃ ''من المسلمین'' کہا گیا اور مذکورہ روایت صحیح ہو تو پھر یہاں بھی یہی اقرار دینے میں کوئی دشواری نہ ہو

گی۔ اصل میں اس قبیلے کو اس معاہدے کے وقت مسلمان تصور کرنے میں شق ۵ مانع سی ہے، جس میں دینی جنگوں میں ناطرفدار رہنے کی اجازت دی گئی ہے یہی مشتنا دستور مدینہ کی شق ۲۵ میں مدینے کے یہودیوں کو بھی عطا کیا گیا ہے۔ کہ ''الامن حارب فی الدین'' اس قبیلے کے کچھ لوگ نور ایمانی سے فوراً منور ہو گئے ہوں گے باقی اگر نصرانی یا بت پرست ہی رہتے ہوئے مسلمانوں سے حلیفی کرتے ہوں تو کوئی مانع نہیں رفتہ رفتہ اسلام ان میں پھیلتا گیا ہوگا۔

بنو ضمرہ کے کچھ رشتہ دار بنو بکر تھے یہ بھی مکے کے مضافات میں رہتے تھے اور مسلمانوں کے دوست خزاعیوں کے حریف و رقیب ہونے کے باعث صلح حدیبیہ کے بعد تک بھی مسلمانوں سے ان کی چشمک ہی رہی ان ہی کی حرکت کے خمیازے میں قریش نے مکہ کھویا تھا۔

مزینہ

یہ لوگ مدینے سے صرف بیس میل کے فاصلے پر رہتے تھے جیسا کہ ابن سعد (۱/۲ ۳۷) نے لکھا ہے۔ لیکن رخ نہیں بتایا۔ گمان ہوتا ہے کہ یہ بھی مدینے کے مغرب میں ینبوع وغیرہ ساحل کے قریب رہتے تھے۔ کیوں کہ اس قبیلہ کے ایک سردار کو قبیلہ کی کانیں جاگیر میں عطا ہوئیں حال میں ایک امریکی کمپنی قبیل نامی گاؤں میں ایک پرانی افتادہ کان میں جدید کھدائی کر کے دو سال تک سونا نکالتی رہی (جیسا کہ اس کے ایک کار پرداز نے ۱۳۶۵ھ میں مدینہ منورہ میں بیان کیا) اب سونا ختم ہو جانے کے باعث قبیل کی کان کو دوبارہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کان کے قریب ایک پرانے قبرستان میں ایک کتبہ بھی کار پرداز مذکورہ کو ملا ہے جس میں بلال بن حارث مزنی کی کان کی اس جاگیر کا پراونہ نبوی کندہ تھا۔ ابو یوسف نے قبیلہ کو فرع کی سمت میں لکھا ہے جو مدینے کے شمال مغرب میں ہے اگر جدید قبیل ہی قبیلہ ہے اور ابو یوسف کا بیان بھی اس سے متعلق ہے تو پھر جہت اور مقام کا تعین ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ نظر آئے گا۔ یہ اسی اہم تجارتی شاہراہ سے متعلق ہے جو قریش کے مواصلات کی شہ رگ تھی۔ گویا آنحضرتؐ نے اس علاقے کے ایک سردار کو ایک قیمتی جاگیر دے کر اس کا پابند کیا کہ قریش کہ ''اس کان سے آج تک بھی کوئی زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔'' حکومت نے گویا جاگیر بمعہ حقوق عطا کر دی تھی۔ اس

سردار بلال بن حارث کو کان کی جاگیر دیتے ہوئے پروانے میں یہ لکھا کہ "آپؐ نے اسے کسی مسلمان کا کوئی حق نہیں دیا۔" گویا یہ اراضی یا تو لاوارث افتادہ تھی یا مسلمانوں کے دشمن وغیرہ مسلم مزینوں کی تھی جس کا پروانہ آنحضرتؐ نے بلال کو دے دیا۔ ابن سعد کے مطابق یہ لوگ ۵ھ میں مسلمان ہوئے اور ان کے کئی سوادی مدینہ آئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے وطن ہی میں جا رہیں تا کہ اس اہم علاقے پر کوئی غیر مسلم قبیلہ قبضہ نہ کر لے۔ اسی سردار کو آنحضرتؐ نے کچھ زرعی اراضی کی جاگیر کا بھی پروانہ عطا فرمایا جو ابن سعد وغیرہ میں ہے۔ ابو یوسف وغیرہ لکھتے ہیں کہ اس پر کاشت نہ کرنے اور افتادہ ڈال رکھنے کے باعث اس کا کچھ حصہ بعد میں حضرت عمرؓ نے بحق حکومت واپس لے کر نو آبادکاری کے خواہشمندوں کو دے دیا۔ اس پروانے پر کاتب کا نام معاویہ لکھا ہے گویا فتح مکہ کے بعد یہ دوسرا پروانہ عطا ہوا۔

اشجع اور عامر بن عکرمہ

اشجع بظاہر قبیلہ غطفان کی ایک شاخ ہے یعنی یہ قریش کے کاروانی راستے پر مدینہ کے شمال میں بستے تھے۔ جب دو تین سال کی جدوجہد کے بعد مسلمان اس تجارتی شاہراہ پر موثر نگرانی قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ تمام قبائل جو کارواں سرائے کا پیشہ کر کے پلتے تھے بے روزگار ہو گئے۔ چنانچہ ابن سعد نے (۴۹ $\frac{1}{2}$) صراحت سے لکھا ہے قبیلہ اشجع اسی معاشی کساد بازاری کے باعث اپنا وفد مدینہ بھیجتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حلیفی کرتا ہے۔ نعیم بن مسعود سے کیا ہوا معاہدہ بھی کافی ابتدائی زمانے کا ہے اور مورخ بھی صراحت کرتے ہیں کہ انہوں نے جنگ خندق ۵ھ سے قبل اسلام قبول کیا تھا۔ اس کا متن بھی درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ مہربان رحم والے اللہ کے نام سے۔
۲۔ نعیم بن مسعود بن رخیلہ اشجعی نے اس بات پر حلیفی کی۔
۳۔ اس نے مدد اور بہی خواہی کے لیے آپؐ سے حلیفی کی جب تک کہ احد پہاڑ اپنی جگہ رہے اور جب تک سمندر کسی سیپ کو گیلا کرتا رہے۔
۴۔ اور (اس کو) علی نے لکھا۔ (ابن سعد)

قبیلہ عامر بن عکرمہ بھی اشجعیوں کے رشتہ دار تھے۔ آنحضرت نے ان کو کارواں سرائیگی کے حق کی توثیق کا پروانہ عطا فرمایا (ابن سعد) اور ان کے ایک سردار کو ایک جاگیر بھی عطا فرمائی (ابن سعد دیبلی وغیرہ) ترمذی میں ایک دستاویز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جاگیر دار عداء بن خالد کے ہاتھ ایک غلام یا لونڈی فروخت کی جس میں فروخت شدہ شئے کے بے عیب ہونے کا اطمینان دلاتے ہوئے "ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان کے ہاتھ بیع" کا اصول تحریر فرمایا ہے۔

یہ قبل خندق کی سیاست تھی کہ قریش کا تجارتی مراستہ بند کر دیا جائے۔

(۲)

غزوہ خندق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ قریش کے اقدام کا مد ختم ہو گیا اب جزا شروع ہو گا۔ اور یہ کہ اب مسلمان ہی جوابی اقدام کریں گے۔ حسبہ سیاست میں منفی و تخریبی پہلو کی جگہ اب مثبت اور تعمیری پہلو شروع ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے قبائلی معاہدات میں یہ امر ملحوظ رہنا صاف نمایاں ہے کہ مکے کے اطراف اسلام کے دوست قبائل کا گھیرا ڈالا جائے۔ قریش کے دشمن تو آسانی سے دوست بن سکتے تھے کوشش کی گئی کہ قریش کے دوست بھی ان کو چھوڑ کر مسلمانوں کے دوست نہیں یا کم از کم ناظر فدار رہیں جیسا کہ قریشی تعلقات کے باب میں تذکرہ ملے گا۔

خزاعہ

خزاعہ تھا تو قحطانی یعنی یمنی قبیلہ لیکن عہد نبوی میں مکے کے قرب و جوار میں رہتا تھا اور اس قبیلے کا پڑاؤ اتنا بڑا ہوتا تھا جتنا حج کے زمانے میں پورے منا کی آبادی اس کی بہت سی شاخیں تھیں اور ۷ھ میں بنی المصطلق کے سوا باقی اوروں سے عموماً مسلمانوں کے تعلقات ہمیشہ بہت اچھے رہے[1]۔ اس کے کچھ تاریخی اسباب بھی تھے۔ زمانہ جاہلیت میں عبدالمطلب نے اس قبیلے سے نسلاً بعد نسل دوامی حلیفی کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان نے اس

۱۔ محاصرۂ خندق کی قریشی تیاریوں کی اطلاع انہوں نے مکے سے بجلت صرف چار دن میں آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی تھی۔ (شامی)

حلیفی کو نباہا بھی۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ۶ھ میں جب یہ تجویز تھی کہ نہ صرف مسلمانان مدینہ اور قریش مکہ ہی بلکہ اور بھی جو جو قبائل جس فریق کی طرف سے معاہدے کے ساتھ اپنی وابستگی ظاہر کریں۔ انہیں بھی صلح حدیبیہ سے استفادے کا حق ہوگا تو خزاعہ نے فوراً اعلان کیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شمار کیے جائیں۔ اسی موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالمطلب کے پرانے حلف نامے کی تجدید بھی منظور فرمائی اور ارشاد ہوا کہ "زمانۂ جاہلیت کی ہر حلیفی کو اسلام مضبوط تر ہی کرتا ہے۔" اور جیسا کہ اوپر بھی ارشادہ ہوا کہ قریش کے حلیف بنوبکر نے جب خزاعہ سے کسی بات پر ناراض ہوکر شب خون مارا اور قریش بھی اس میں حصہ دار بنے تو صلح حدیبیہ ٹوٹ گئی اور مسلمانوں نے مکے پر حملہ کر کے انتقاماً شہر پر قبضہ کرلیا۔ اس واقعے کی زیادہ تفصیلیں نہیں ملتیں کہ ہنگامہ کس بات پر ہوا۔ بجز اس کے کہ ان کا ایک وفد دوڑا دوڑا فریاد کے لے مدینہ منورہ آیا اور ایک منظوم معروضہ کیا جس کے اہم ابیات یہ ہیں۔

اے اللہ میں محمدؐ کو یاد دلاتا ہوں وہ موروثی حلف جو ہمارے باپ اور
اس کے باپ میں ہوا تھا۔

کہ قریش نے تجھ سے وعدہ خلافی کی اور تیرے پختہ عہد کو توڑا۔

انہوں نے ہم کو وتیر کی سفید زمین میں سوئے ہوئے آدبوچا اور ہمیں
رکوع وسجود کی حالت میں قتل کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اطمینان دلایا کہ تمہاری مدد کی جائے گی۔

ابن سعد وغیرہ نے بدیل وغیرہ خزاعی سرداروں کے (جو صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے) نام ایک مکتوب نبوی نقل کیا ہے۔ بظاہر یہ صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل کے زمانے کا ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دوستی اور عظیم محبت کا انہیں یقین دلایا ہے اور کہا ہے کہ انہیں بھی مکے میں اتنے ہی حقوق حاصل ہیں جتنے مسلمانان مدینہ کو یعنی وہ حج وعمرے کے لیے تو وہاں جاسکتے ہیں لیکن سکونت وتوطن کے لیے نہیں یہ بھی یاد دلایا کہ خود آپ کی طرف سے خزاعیوں کو کوئی گزند صلح حدیبیہ کے بعد سے نہیں پہنچا اور نہ آئندہ انہیں ڈرنے کی کوئی وجہ ہے۔ پھر اطلاع دی ہے کہ کلاب وہوازن کے فلاں فلاں سرداروں نے بھی

مع اپنے قبیلوں کے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اور انہیں مکرر یقین دلایا ہے مسلمانوں اور خزاعیوں میں مساوات ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد خزاعیوں کو مکے میں کوئی تکلیف ہوئی اور ممکن ہے یہ تکلیف اس بنا پر ہوئی ہو کہ وہ صلح حدیبیہ میں مندرجہ حقوق سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھنے لگے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چھیڑ چھاڑ کا آغاز اسی سے ہوا ہو جس کا نتیجہ مندرجۂ بالا خونریزی کی صورت میں نکلا۔

خزاعہ کی ایک شاخ قبیلہ اسلم تھی۔ ابن سعد نے ان کے نام ایک پروانہ نبوی درج کیا ہے۔

۱۔ اسلم کے لیے جو خزاعہ کی شاخ ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو ان میں سے ایمان لاتے ہیں نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے دین کے بارے میں بھی بہی خواہی دکھاتے ہیں۔
۲۔ انہیں ایسوں کے خلاف مدد دی جائے گی جو ظلم سے ان پر اچانک دھاوا بول دیں۔
۳۔ اور ان پر نبی کی مدد واجب ہوگی جبکہ آپؐ ان کو بلائیں۔
۴۔ اور ان کے خانہ بدوش بدویوں کے لیے بھی وہی (حقوق وواجبات) ہیں جو ان کی بستی میں رہنے والوں کے لیے۔
۵۔ اور وہ مہاجر ہی ہیں جہاں بھی وہ رہیں۔
۶۔ اور العلاء بن الحضرمی نے لکھا اور گواہی ثبت کی۔

اس دستاویز کی پہلی سطر ہی میں "اسلم من خزاعہ" کے قطعی الفاظ ہیں لیکن ابن سعد کے اُستاذ واقدی نے اپنی کتاب المغازی میں یہ دستاویز کسی قدر طویل تر الفاظ میں دیتے ہوئے اسلم کے لام کو پیش کے ساتھ "اسلُم" لکھا ہے۔ من خزاعہ کے الفاظ وہاں نہیں ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غدیر الاشطاط نامی تالاب پر خیمہ زن تھے جب وہاں کا سردار بریدہ بن الخصیب حاضر ہوا اور اپنی قوم کا اسلام پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ ہماری بستی اور جانور ہیں۔ کچھ لوگ ہجرت کر کے مدینہ جا چکے ہیں باقی یہیں ہیں اب آپکا جو حکم ہو۔ آپؐ نے انہیں وہیں رہنے کی ہدایت فرماتے ہوئے ایک پروانہ عطا فرمایا۔ اسلُم (لام کے پیش سے) قبیلہ خزاعہ نہیں بلکہ قضاعہ کی شاخ تھی اور مکے کے قریب نہیں بلکہ مدینے کے بھی شمال میں

قضاعیوں کے ساتھ بستی ہوگی۔ غدیر الاشطاط اب لاپتہ ہے۔[1] یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ دونوں میں سے کس کے بیان کو ترجیح دی جائے۔ ابن سعد میں خزاعہ کی صراحت ہے واقدی میں نام پر صرف پیش کا پڑ جانا کاتب کا سہو بھی ہو سکتا ہے۔

اس دستاویز میں ہجرت کے حکم سے استثنار کا ذکر ہے۔ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نو مسلم افراد کو ہجرت کر کے اسلامی سرزمین میں آبسنے کا حکم دیتے تھے اور فتح مکہ کے بعد اس کو منسوخ فرما دیا۔ اس حکم سے کبھی کبھی استثناء بھی ہوتا رہا اور ظاہر ہے کہ استثناء ۸ھ سے قبل ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے اس پروانے کی تاریخ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ابن سعد کے متن میں زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ باقاعدہ محکمہ زکوٰۃ تو عہد نبوی میں ۹ھ میں قائم ہوا۔ لیکن غیر معین رضا کارانہ زکوٰۃ کا ابتدائے اسلام ہی سے ملتا ہے۔ حضرت جعفر طیار حبش ہجرت کر گئے تھے تو وہاں نجاشی کی دریافت پر علاوہ اور باتوں کے بیان کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو زکوٰۃ کی بھی تاکید فرماتے ہیں۔ قرآن مجید میں مکی سورتوں میں تو بنی اسرائیل کے متعلق بھی زکوٰۃ کا کئی بار ذکر ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ابتداء اسلام ہی سے اس کی مسلمانوں کو ترغیب دی جاتی رہی ہوگی۔

بعض اور قبائل کی طرح اسلم بھی کم از کم ایک سردار الحصین بن اوس کو جاگیر عطا ہوئی اور جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا تحریری پروانہ عطا فرمایا جو ابن سعد نے نقل کیا ہے متعدد اسلمی سرداروں کے نام مکاتب نبوی کا ابن الاثیر وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ مگر ان کی عبارت درج نہیں کی ہے جس کے باعث یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں کیا امور درج تھے۔

جذام، قضاعہ، عذرہ

عرب کے شمال میں تبوک کے قرب وجوار میں ان قبائل کا پتہ چلتا ہے اور بظاہر ۷ھ کی فتح خیبر کے بعد ان لوگوں سے تعلقات پیدا ہوئے۔

اس زمانے میں سلاطین اطراف کے نام جو تبلیغی خطوط روانہ ہوئے ان کے سلسلے میں ابن ہشام وغیرہ نے لکھا ہے کہ ایک سفیر کا مال واسباب قبیلۂ جذام کے علاقے میں بعض

1۔ کیا یہی غدیر خم ہے جو رابغ کے پاس ہے؟

ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ اس پر اطراف کے بعض نو مسلم جذامی خاندان مدد کو دوڑے اور لٹا ہوا مال واسباب واپس دلایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے ایک تادیبی مہم روانہ فرمائی مگر غلط فہمی سے بعض بے قصور بھی اس کی زد میں آ گئے انہوں نے مدینہ آ کر فریاد کی تو آپؐ نے ان کی تلافی کا انتظام فرمایا۔

ایک مکتوب نبوی رفاعہ بن زید جذامی کے نام اکثر مؤرخوں نے درج کیا ہے کہ "میں نے اس کو اس کی تمام قوم کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجا ہے جو قبول کرے تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پارٹی میں شامل ہوگا جو روگردانی کرے تو اسے دو مہینے تک امان ہے۔" یہ معلوم نہیں کہ کب کا واقعہ ہے۔

ابن الاثیر کے مطابق تبوک سے ۹ھ واپسی پر مالک بن احمر الجذامی نے آنحضرت سے مدینہ منورہ میں ملاقات کی۔ اس کے پروانے میں لکھا ہے کہ "جب تک وہ اور اس کے ساتھی، نماز پڑھتے زکوٰۃ دیتے، مسلمانوں کی اتباع کرتے، مشرکوں سے کنارہ کشی کرتے، مال غنیمت سے خمس ادا کرتے اور قبائلی بیمۂ ہرجانہ کا حصہ (سہم الغارمین) ادا کرتے، نیز فلاں فلاں حصہ ادا کرتے رہیں تو انہیں اللہ اور محمدؐ کا امان حاصل رہے گا۔"

اس میں "سہم الغارمین" عجیب سی چیز ہے۔ عہد نبوی میں مدینہ منورہ میں قبیلہ وار سماج کا ایک نظام پایا جاتا تھا جس کے تحت اگر کوئی فرد قبیلہ کبھی مالی ہرجانہ ادا کرنے کا پابند بنتا مثلاً خوں بہا وغیرہ تو پورا قبیلہ مل کر وہ ہرجانہ ادا کرتا۔ اور اگر ایک قبیلہ اپنے وسائل سے اس سے عہدہ برآنہ ہو سکتا تو دوسرے قبائل اس کی مدد کرتے۔ معلوم نہیں اسی طرح کی کوئی چیز مراد ہے یا کچھ اور۔

دُومۃ الجندل

"دومۃ الجندل......... زمانہ قدیم سے شمال اور جنوب کے درمیان یعنی ایک طرف آرام اور بابل دوسری طرف ہند اور مصر کے سلسلہ تجارت کو جاری رکھنے کے لیے شاہراہ کا کام دیتا تھا۔ بلیکس بائبل ہسٹری باب ۴ فصل ۲ ص ۴ بحوالہ ماہنامہ دبدبہ آصفی، شعبان ۱۳۲۳ھ

قلقشندی نے صبح الاعشیٰ (۴/۲۹۲) میں لکھا ہے کہ" یہ شام وعراق کے درمیان ایک حد فاصل

تھا۔" گویا عرب سے شمال کو جانے والے تجارتی کارواں سب یہیں پہنچتے پھر شام یا عراق جہاں جانا ہوا لگ الگ رُخ میں مُڑتے تھے۔ یہاں زمانہ جاہلیت میں ایک عظیم الشان سالانہ میلہ (سوق) بھی لگتا اور اس کی اہمیت کے مدنظر اس کی ملکیت کے لیے آئے دن جنگیں ہوا کرتیں (تفصیل کے لیے دیکھو ابن حبیب کے المحبر اور المرزوقی کی الازمنہ والامکنہ میں باب اسواق العرب نیز کتاب "عہد نبوی کا نظام حکمرانی میں متعلقہ باب) اکید عبادیوں کے غلبے کی صورت میں اور قاقہ کلبیوں کی صورت میں یہاں کا حکمران بنتے۔

بظاہر خیبری یہودیوں اور مکی قریشیوں کی سازش سے ۵ھ میں اُکیدر نے مدینہ آنے والے غلے کے کاروانوں کو یہاں ستانا اور ہراساں کرنا شروع کیا جیسا کہ مسعودی نے لکھا ہے۔ یہ بڑا خطرناک ہوتا چنانچہ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبر لینے کے لیے بہ نفس نفیس روانہ ہوئے اطراف کے کچھ مفسدوں کی کان گوشی بھی فرمائی (وابن سعد) نے اتنے میں احزاب نے خندق کے محاصرے کی ٹھان لی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آدھے راستے سے مدینہ واپس ہو گئے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس کی روایت ہے کہ کتب الی اکیدر دومۃ یدعوہم الی الاسلام" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تبلیغی خط کا بظاہر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب مناسب یہ معلوم ہوا کہ اکیدر کے حریفوں سے جو اس زمانے میں مغلوب تھے) دوستی پیدا کی جائے۔ چنانچہ چند ماہ بعد ۶ھ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی سرکردگی میں ایک مہم بھیجی گئی۔ جو فوجی سے زیادہ سیاسی تھی۔ انہوں نے قبیلہ کلب میں تبلیغ اسلام کی اور جب نتیجہ اچھا نکلا تو اس کے ایک سردار الاصبغ کی لڑکی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب الحکم خود نکاح بھی کر لیا (ابن سعد ۲/۱ ۳۳) اور اس طرح دومۃ الجندل کو مفسدوں سے پاک کرنے کا وسیع اور دوررس انتظام شروع کیا گیا حدیبیہ وخیبر کے بعد تجارتی شاہراہ خود ہی پُرامن ہو گئی ہوگی۔ لیکن اکیدر جو نصرانی تھا ایک خطرناک ہمسایہ ہی تھا آخر ۹ھ میں جب تبوک کی مہم اختیار فرمائی گئی تو حضرت خالد بن الولید کے تحت بھیجے ہوئے فوجی دستے نے اکیدر کو زندہ گرفتار کر کے آستانہ نبوی کی خدمت کے لیے لا حاضر کیا۔

اس کے بعد کے حالات میں اُلجھن ہے ایک طرف تو ہمارے مؤلف (ابن سعد وغیرہ) بیان کرتے ہیں کہ اکیدر نے اسلام قبول نہیں کیا۔ بلکہ جزیہ دینے پر رضامندی ظاہر کی

اپنا قلعہ ہتھیار اور اپنے علاقے کی غیر مزروعہ زمین سپرد کر دینی منظور کر لی۔ لیکن یہی مؤلف دوسری طرف اس معاہدے کی جو نقل درج کرتے ہیں اس میں جزیے کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اکیدر کے اسلام لانے، جھوٹے خداؤں اور بتوں کو چھوڑنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کے اقرار پر مشتمل ہے۔ شاید بلاذری (فتوح ص۶۲) کی روایت ہی صحیح ہو کہ اس نے اسلام قبول کر لیا مگر جلد ہی مرتد بھی ہو گیا اور خالد بن الولید کے ہاتھوں مارا گیا۔ ارتداد پر جزیے کی شرط اور صلح پھر بھی ناقابل فہم ہے۔ واحد حل جو سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ معاہدے کی جو نقل ہمارے مؤلفوں کو ملی وہ اصل نہیں ہے۔ بلکہ بعد کے زمانے میں جب یہ علاقہ پوری طرح مسلمان ہو گیا تو ان لوگوں نے ایک جعلی عہد نامہ تیار کیا (تاکہ اپنے جد اعلیٰ اکیدر کو بھی ایک صحابی ظاہر کرنے کا موقع اور فخر حاصل کر سکیں، اس جعل میں ان کو اپنے ہمسایہ قبیلہ کلب کے معاہدے سے مدد ملی ہوگی۔ یہ حارثہ بن قطن کلبی کے نام مکتوب نبوی ہے اور اس میں افتادہ زمینوں، نماز اور زکوٰۃ کی صراحت کم و بیش ان ہی الفاظ میں ہے جو اکیدر کی طرف منسوب معاہدے میں ہے اور سب سے عجیب یہ کہ حارثہ کلبی کا یہ پروانہ دومۃ الجندل والوں اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کلبیوں کے لیے ہے۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ اکیدر کی گرفتاری اور رہائی کے بعد اس سے قلعہ اور افتادہ زمینیں جو لے لی گئی تھیں۔ وہ تو مسلم کلبی سردار حارثہ کو جو قرب و جوار میں رہتا تھا، دیدی گئیں اور حسب قاعدہ پروانہ لکھ دیا گیا۔ واللہ علم قطن بن حارثہ کے نام بھی ایک مکتوب نبوی ملتا ہے۔ اس میں انہیں نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی گئی ہے۔ معلوم نہیں یہ مذکورہ صدر حارثہ کا بیٹا ہے یا کوئی اور۔

اکیدر کے معاہدے کی ایک ذیلی تفصیل بھی دلچسپ ہے ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس معاہدے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُہر کی جگہ ناخن کا نشان ثبت فرمایا (ختم بظفرہ) اکیدر عبادی یعنی حیرہ کا رہنے والا تھا حیرہ کی جگہ آج کل کوفہ آباد ہے۔ یہ بابلی سرزمین ہے اور عہد نبوی سے پہلے یہاں بڑا پرانا رواج تھا کہ معاہدہ کنندہ اپنے انگوٹھے کے ناخن سے ہلال کی شکل معاہدے پر ثبت کرے۔ پرانے بابلی معاہدے جو اینٹوں وغیرہ پر دستیاب ہو رہے ہیں ان میں اس کی بہ کثرت مثالیں اور صراحت ملتی ہے۔

بعض حالیہ مؤلفوں نے "بظفرہ" کو سہو بطنیہ پڑھ کر خیال کیا ہے کہ چڑی مٹی سے

لاکھ کی طرح مہر کی ہوگی۔ گر مذکورہ بالا توضیح اور قدیم رواج کے مدنظر یہ خیال کرنا چاہیے کہ اکیدر کے اصرار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ملک کے رواج کے مطابق "مہر" کی اور ناخن کا نشان معاہدے پر بنایا۔

(۳) فتح مکہ کے بعد عرب قبائل سے تعلقات میں مساوات کی جگہ اسلامی برتری اور صاف نمایاں ہے۔

حنین، ہوازن، ثقیف، طائف

مکے پر جب مسلمانوں نے اچانک حملہ کر کے بے لڑے بھڑے آسانی سے قبضہ کر لیا اور آنحضرت کی بے نظیر فراخ دلی اور عفو منشی سے متاثر ہو کر وہاں کے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تو ہوازن اور ثقیف کا پریشان ہونا سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ہوا۔ مسلمان ملک گیری کے لیے کبھی اقدام نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ولادت پر ہوازن ہی میں دودھ پیا اور پرورش پائی اور کئی سال ان میں گزارے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی پاس داری میں بھی یقیناً اقدام نہ فرماتے۔ بہر حال بعض باتوں سے کچھ استنباط شاید کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مکے والوں کی بہت سی جائیداد طائف اور اس کے اطراف کے زرخیز علاقے میں تھی۔ روایت ہے کہ اس جائیداد پر مال لاوارث سمجھ کر طائف والوں نے قبضہ کر لیا اور اس ڈر سے کہ کہیں مکے والوں کی استدعا پر اس غصب کی تلافی کی کوشش نہ کریں، فوجی جتھا بندی شروع کی۔

۲۔ آنحضرتؐ چاہے بھول گئے ہوں کہ ہجرت سے قبل یہاں آپؐ کے ساتھ کیا جاہلانہ اور بے دردانہ سلوک کیا گیا تھا، لیکن دل کا چور خود طائف والوں کو نہ بھولا ہوگا، اور اس خوف سے کہ کہیں عام دنیا داروں کی طرح اب قوت، طاقت ہونے پر اس شخصی بدسلوکی کا بدلہ لینے کے لیے رحمت اللعالمین طائف کا رخ نہ کریں، دفاعی تیاریاں شروع کی گئیں۔

۳۔ عام دنیا دار فاتحوں کی طرح اب فاتح مکہ کہیں طائف کے زرخیز علاقے کی طرف بھی للچائی ہوئی نظر نہ ڈالے، اس کے لیے احتیاطاً فوجی اجتماع ہونے لگا۔

۴۔ مکے نے اچانک دھاوے پر ہتھیار ڈالے تھے اسے لڑائی میں شکست نہیں ہوئی تھی۔ طائف میں مقیم مکیوں نیز مکے کے تاحال غیر مسلم باشندوں کی ریشہ دوانیوں کا بھی امکان ہے اور طائف والوں نے یہ سوچ کر کہ عین وقت پر غیر مسلم یا نیم مسلم اہل مکہ طائفوں کے حملے کو نجات دہندہ سمجھ کر مدد دیں گے اور پانچویں کالم کا کام دیں گے۔ جنگ کی تیاری کی۔

یہ یا کوئی اور ایسے اسباب تھے جن کو تاریخ نے اب بھلا دیا ہے کہ ہوازن اور ثقیف کے قبائل جمع ہونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جاسوس دریافت حال کے لیے بھیجا جو کئی دن ان کے اندر رہ کر تفصیلی اطلاعات ان کی قوت اور ان کے ارادوں کے متعلق لے آیا۔ دفاع کے لیے انسدادی مہم بہتر سمجھی گئی اور اسلامی لشکر مکے کا مناسب انتظام کر کے خود مکے سے حاصل ہونے والی کمک لے کر جس میں آدمی بھی تھے ہتھیار بھی روانہ ہوا اور دشمن سے پہلے پہل حنین میں مڈبھیڑ ہوئی مکے سے آنحضرتؐ یہاں چار دن میں پہنچے تھے۔

(امتاع مقریزی)

یہ اس وقت بھی ایک غیر آباد مقام ہوگا اور خلاف توقع دشمن سے مقابلے کے باعث اسے شہرت حاصل ہوگئی اور قرآن میں بھی اس کا ذکر آ گیا اور آج بھی یہ حنین لاپتہ ہے۔ گزشتہ ہزار سوا ہزار برس سے جو مفسر مورخ جغرافیہ نویس اور دیگر مؤلف اس کا ذکر کرتے آئے ہیں ان میں اس بارے میں باہم اختلاف ہے۔ کوئی اُسے مکے سے ایک کی مسافت پر بتاتا ہے تو کوئی چار دن کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسی مہموں میں عادۃً "توریہ" دکھاوا کر کے چکر دار راستے سے دشمن پر جا پڑتے تھے۔ اسی لیے عہد نبوی کے میدانِ جنگ میں پیش کیا ہوا نظریہ ہی مکرر دہرانا پڑتا ہے کہ یہ حنین غالباً مکے سے طائف جانے کے راستے پر سیدھے راستے کی جگہ نیم دائرہ چکر بنانے پر پڑتا ہوگا۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ مکے سے صرف ایک دن کے فاصلے تک دشمن کا لشکر آ گیا ہو اور آنحضرت بے خبر رہے ہوں۔ یقیناً چار دن کی مسافت یعنی چالیس پچاس، میل یا اس سے بھی کوئی زائد مسافت پر یہ معرکہ ہوا ہوگا۔

مسلمان لشکر جو دشمن کی کمین سے "بے خبر" پیچ دار وادیوں اور دشوار گزار تنگ دروں میں سے گزر رہا تھا، یکا یک عرب کے بہترین تیر اندازوں کی زد میں آ گیا اور تتر بتر ہو گیا۔ سپ

سالارِ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی انفرادی جانبازی اور استقلال پر جلد ہی مسلمان سنبھل گئے اور دشمن کو مار بھگایا۔ دشمن اپنے ساتھ نہ صرف اپنے تمام بیوی بچوں کو بھی لو لایا تھا بلکہ اپنی پوری کائنات یعنی اونٹ بکری بھی۔ انہیں سوائے طائف کے فصیل دار شہر کے کہیں امن کی توقع نہ تھی۔ یہ ایرانی انجینئروں کا بنایا ہوا مضبوط قلعہ تھا۔

مسلمان بھی چلتے چلاتے طائف پہنچ گئے۔ معرکے کی تفصیل عہد نبوی کے میدان جنگ میں مل جائے گی۔ چند دن محاصرہ کر کے فتح کئے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس مکہ روانہ ہو گئے۔ شہر دس بارہ میل رہ گیا تو جعرانہ میں حنین کا مال غنیمت منگایا اور حسب قاعدہ تقسیم کر دیا۔ ہوزان کو اب ہوش آیا، شرماتے اور روتے چلاتے آنحضرتؐ کے پاس پہنچے اور رشتہ رضاعت کا واسطہ دے کر رحم کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے کہا تم دیر کر کے آئے۔ فتح کے بعد سے اب تک اسی خیال سے انتظار کیا گیا کہ مسلمان ہو جاؤ تو سب مال و انسان واپس کر دیئے جائیں۔ اب مال اور بیوی بچوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرو۔ لازماً انہوں نے بیوی بچوں کا کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں اپنے خاندان والوں کا حصہ تو فوراً واپس کرتا ہوں۔ باقی کے لیے نماز کے وقت پبلک کے سامنے استدعا کرو۔ ان نومسلموں نے ایسا ہی کیا۔ آنحضرت نے اپنا پیش کش دُہرایا۔ فوراً صحابہ یکے بعد دیگرے اُٹھتے اور اپنے قبیلوں کی طرف سے بھی مال غنیمت کے عورتوں بچوں کو واپس کرتے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عریف مقرر کئے اور تفصیل سے فرداً فرداً ہر ہر سپاہی کا عندیہ معلوم کریں اکثر نے مفت رہائی منظور کر لی۔ چند نے انکار کیا تو انہیں کہا گیا کہ ان کے حصہ کی مالیت سرکاری خزانے سے ادا کی جائے گی۔ مگر وہ لازماً رہائی منظور کریں۔ اس کا امکان ہے کہ چند ایک نوعمر غیر شادی شدہ لڑکیوں نے فاتحوں ہی کے پاس رہنا اور ان کے حبالۂ نکاح میں آجانا منظور کر لیا ہو۔ باقی سب عورتیں بچے ہوزان کے وفد کے ساتھ مسرت سے آنسو بہاتے اپنی بستی کو روانہ ہو گئے پھر آنحضرت بھی مدینہ سدھارے۔

غالباً مسلمانانِ مکہ نے طائف سے معاشی و اخلاقی قطع تعلق کر لیا ہو گا۔ اُس معاشی دباؤ کو طائف کتنے دن سہار سکتا جب کہ اس کے چوطرف اسلام تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا چند ماہ بعد آخر انہوں نے بھی آنحضرتؐ سے دوستی کے حصول کے لیے ایک وفد مدینہ بھیجا۔ ان

کے ذہن میں اسلام صرف سیاسی سر تسلیم خم کرنا تھا۔ اسی لیے ان کے وفد نے ایک غیر مفتوح ملک کے نمائندے کی حیثیت سے ایسی شرطیں پیش کیں جو یقیناً خود اس کے اپنے ذہن میں بھی بھاؤ بڑھانے اور بھاؤ چکانے کے سوا کچھ نہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ وہ مسلمان ہونے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ:

۱۔ نماز سے مستثنیٰ کئے جائیں۔
۲۔ طائف کو بھی مکے کی طرح ایک حرم قرار دیا جائے (شاید حج سے استثناء منشا ہو)
۳۔ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کئے جائیں۔
۴۔ جہاد سے مستثنیٰ کئے جائیں۔ (یعنی جبری فوجی خدمت اور آنحضرتؐ کی جنگوں میں رضا کار مہیا کرنے سے بری رہیں)
۵۔ ان کے شہر کا قدیم آبائی بت خانہ نہ توڑا جائے۔
۶۔ زنا کی انہیں ممانعت نہ رہے۔
۷۔ سُود کی انہیں ممانعت نہ رہے۔
۸۔ شراب کی انہیں ممانعت نہ رہے۔

اور کہتے ہیں کہ وہ معاہدہ مسودہ لکھ کر بھی لائے تھے کہ دستخط کی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مُہر لگا دیں۔ معاہدہ کیا ہے کہ پورے اسلام سے استثناء ہے معلوم نہیں روزے سے استثناء کا بھی مطالبہ کیا یا نہیں۔ بہر حال صاف نظر آئے گا کہ انہیں آنحضرتؐ کے مشن کی روح کو سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی تھی اور وہ اسے محض ایک ظاہر داری کا دھندا سمجھتے اور مفتوحوں پر عائد کی جانے والی شرطیں خیال کرتے ہوں گے۔ آنحضرت نے فوراً قوت لیکن محبت سے ان کے خیالات کی تصحیح کی اور اس طور پر دلداری کی کہ وہ بھی شرما گئے اور تمام لغو مطالبوں سے دستبردار ہو گئے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ نماز اور عبادت کے بغیر انسان انسان نہیں رہتا اور ایسا مذہب کسی کام کا نہیں جو صرف دنیاداری اور مادہ پرستی پر مشتمل ہو۔ زنا کاری ایک پلید بداخلاقی ہے اور بتایا ہو گا کہ جس طرح تم اپنی بیویوں بچیوں کا دوسرے ہاتھوں خراب ہونا پسند نہیں کرتے اسی طرح دوسرے بھی اپنی بیویوں بچیوں کا تمہارے ہاتھوں خراب ہونا گوارا نہیں کر سکتے۔ ان کی زکوٰۃ اور جہاد میں ان کی کمک اس

وقت کی بڑی اسلامی مملکت کے لیے چھوٹی سی چیز ہوگی۔ آنحضرتؐ نے ان کو بروایت ابوداؤد اس سے مستثنیٰ کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ نیز طائف کو حرم قرار دینے پر اور خاص اس بارے میں ایک اعلان بھی جاری کیا گیا اور خلاف ورزی پر سزا مقرر کی گئی۔ لیکن قوم کی تعلیم چوں کہ اب آنحضرت کے ہاتھ میں تھی اس لیے قرآن کے پڑھنے اور اس کے ماننے والے افراد کے لیے اس استثناء سے جلد ہی خود دستبردار ہونا ناگزیر تھا تاکہ مسلمانوں میں تکو نہ بنیں۔ بُت خانے کے متعلق آنحضرتؐ نے ایک لطیف مذاق کیا اور کہا کہ تم اسے نہ توڑو ہم اپنے آدمی بھجوا کر توڑ لیں گے۔ تمہارے اوہام کے مطابق کوئی بلا آئی ہے تو ہمارے آدمیوں پر آجائے گی۔ سود کے متعلق روایتوں میں کچھ ابہام سا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے عکاظ کے آئندہ میلے تک روا رکھ کر اس کے بعد منسوخ کیا گیا اور کہا گیا کہ قرضوں میں سے صرف اصل راس المال واپس لینے پر قناعت کی جائے۔ اُن کے معاہدے کا جو متن تاریخوں نے محفوظ کیا ہے وہ دلچسپی کے لیے نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ مہربان رحم والے خدا کے نام سے۔

۲۔ یہ ایک تحریر ہے اللہ کے رسول محمدؐ کی جو نبی ہیں، ثقیف کے لیے۔

۳۔ لکھا جاتا ہے کہ ان کو اس خدا کا ذمہ دیا جاتا ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور نبی بن عبداللہ کا ذمہ اس چیز کے متعلق جو اس دستاویز میں لکھا گیا ہے۔

۴۔ بے شک ان کی وادی حرام ہے اور سب کے سب خدا کے لیے حرام کی گئی ہے۔ وہاں کے جنگلی خاردار درخت، وہاں کا شکار، وہاں ظلم کرنا، وہاں چوری یا کوئی بُرائی کرنا۔ (سب حرام ہیں)

۵۔ اور (اس وادی) وج کا ثقیف ہی کو سب سے زیادہ استحقاق ہے ان کے طائف (قلعے) کو عبور نہیں کیا جا سکے گا۔ اور نہ کوئی مسلمان وہاں جا کر ان کو وہاں سے نکال سکے گا وہ اپنے طائف میں یا اس کے سوا اپنی وادی میں جو عمارت چاہیں بنا سکیں گے۔

۶۔ ان کو نہ تو فوجی خدمت کے لیے جمع کیا جائے گا اور نہ اُن سے عُشر زکوٰۃ لیا جائے گا اور نہ ہی مال یا ذات کے متعلق ان پر کوئی جبر کیا جا سکے گا۔

۷۔ یہ مسلمانوں ہی کا ایک گروہ ہے۔ جہاں چاہیں جا آ سکیں گے اور جہاں جانا آنا

چاہیں جا آ سکیں گے۔

۸۔ اور ان کے پاس جو اسیر ہو وہ ان ہی کا ہوگا اور انہیں کو سب لوگوں سے زیادہ اس پر استحقاق ہوگا تاکہ وہ اس کے متعلق جو چاہیں کریں۔

۹۔ ان کو رہن کی ضمانت پر جو قرض وصول طلب ہو اور اس کی ادائے کی مدت آجائے تو وہ سُود ہے اور اللہ سے برأت۔ اور جو قرض رہن کی ضمانت پر موسم عکاظ کے بعد تک کے لیے ہو تو اس کا اصل راس المال عکاظ کے وقت ادا کر دیا جائے۔ (ابن عبدالبر اور لسان العرب کی روایت میں۔" تو اس کا راس المال ادا کر دیا جائے اور عکاظ میں سود لیا جا سکے گا۔ اس کے بعد نہیں۔")

۱۰۔ اور ثقیف کو ان کے کھاتوں میں ان کے اسلام لانے کے دن لوگوں سے جو وصول طلب دیون ہیں، وہ ان کو ملیں گے۔

۱۱۔ اور ثقیف کو لوگوں سے جو امانت یا مال یا آدمی (یعنی لونڈی غلام) جسے امانت رکھانے والے نے مالِ غنیمت میں حاصل کیا تھا یا اسے کھویا تھا، وصول طلب ہو تو ضرور واپس کیے جائیں گے۔

۱۲۔ اگر ثقیف کے کوئی لوگ یا سامان (اب) غیر حاضر ہو تو اس کو بھی وہی امن حاصل ہوگا جو حاضر الوقت کو ہے اور ان کا جو مال لیّہ میں ہو تو اس کو بھی وہی امن حاصل ہوگا جو وج میں کے مال کو ہے۔

۱۳۔ اور ثقیف کا جو حلیف تجارتی معاملت دار ہو تو اس کو بھی ثقیف کے لیے طے شدہ امر ہی حاصل ہوگا۔

۱۴۔ اگر ثقیف پر کوئی الزام لگائے یا کوئی ظالم کرنے والے ان پر ظلم کرے تو ان کے متعلق اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ چاہے مال کے متعلق ہو یا جان کے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان ان (ثقیف) کی مدد اس شخص کے خلاف کریں گے جو ان پر ظلم کرے۔

۱۵۔ اور لوگوں میں سے جس کے متعلق انہیں ناپسند ہو کہ وہ ان کے ہاں آئے تو ایسا شخص ان کے ہاں نہ آ سکے گا۔

۱۶۔ اور بازار اور بیوپار گھروں کے صحنوں میں ہوگا۔

۱۷۔ اُن کا امیر ان ہی میں سے ہوا کرے گا کوئی دوسرا نہیں۔ چنانچہ بنی مالک پر ان کا امیر اور احلاف پر ان کا امیر ہوگا۔

۱۸۔ اور ثقیف والے قریش کے جن نخلستانوں کی آب رسانی کریں گے تو آب رسان کو اس کا آدھا ملے گا۔

۱۹۔ اور ان رہن کی ضمانت پر جو قرض وصول طلب ہو تو سود نہیں لیا جائے گا۔ اگر رہن کے مالک فوری ادائی کے قابل ہوں تو ادا کر دیں گے اور اگر فوری ادائی نہ کر سکتے ہوں تو آئندہ سال کے جمادی الاولی تک ہو سکے گا۔ اور جس کا وقت آ گیا اور ادا نہ کرے تو گویا اس نے سُود لیا۔

۲۰۔ اور ان لوگوں سے جو قرض وصول طلب ہو تو انھیں اصل راس المال کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

۲۱۔ اور ان کے پاس جو اسیر ہو جسے اس کے مالک نے بیچ دیا ہو تو اسی کو بیع کا حق ہوگا۔ اور بیچا نہ گیا ہو تو اس میں (فدیہ) چھ اونٹنیاں ہوں گی آدھوں آدھ تین سالہ اونٹنیاں اور دودھ پلائی (بنت لبون) عمدہ موٹی۔

۲۲۔ اور جس نے معاملہ بیع کر کے کچھ خرید ہو تو اس بیع کا اسی کا حق ہوگا۔

(ابوعبید کتاب الاموال ص ۵۰۶)

مؤطا امام مالک (۳۱/۸۳) میں زمانہ جاہلیت کے سود کی جو کیفیت لکھی ہے وہ غالبًا ثقیف پر بھی صادق آتی ہے کہ کچھ قرض دے کر مدت معین کی جاتی۔ اگر وقت پر ادا ہو تو فبہا ورنہ قرض کو دُگنا قرار دے کر مدت بڑھا دی جاتی۔ اس مہلت میں بھی ادائی نہ ہو تو قرض کی مقدار پھر دُگنی کر کے مزید مہلت دی جاتی۔

ابن سعد (۳۳۱/۲) نے ایک عجیب سی بات لکھی ہے کہ ثقیف کے وفد کے اصرار پر معاہدے کی دستاویز پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کی چونکہ نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے آپؐ کے) دونوں نواسوں کو بھی گواہی ثبت کی گئی۔ امام حسن کی عمر اس وقت چار سال کی تھی اور امام حسین کی تین ساڑھے تین سال کی۔ انگوٹھوں کا نشان لگایا گیا۔ (ابوعبید ص ۵۰۴) میں بھی اس

کا کچھ ذکر ہے۔ مگر محض قیاس آرائی۔

ایک مکتوب نبوی اور ملتا ہے جس میں اہل طائف کے نام ہدایت نامہ ہے کہ ''طائف کی شراب حرام ہے۔''

چند ماہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔ اور فتنہ ارتداد کے وقت حضرت ابوبکرؓ نے ان کے گورنر عثمان بن ابی العاص الثقفی کو حکم بھیجا کہ اپنے علاقے کے ہر تعلقے (مخلاف) سے فوجی رضا کار بھیجے۔ گورنر نے بروایت طبری ہر مخلاف کو بیس سپاہی مہیا کرنے کا پابند کیا اور اس کی بے چوں وچرا تعمیل ہوئی۔

طائف کے کچھ لوگ اس سے پہلے ہی اسلام لا چکے تھے ان کے وفد کی آمد کے وقت مغیرہ بن شعبہ الثقفی مدینے ہی میں تھے خیبر میں منجنیقوں وغیرہ سے سابقہ پڑا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں کو اس کے بنانے کی تعلیم پانے جرش بھیجا تھا۔ ان میں عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمہ ثقفی بھی تھے، اور اسی تعلیمی سفر کے باعث وہ حنین اور محاصرۂ طائف میں آنحضرت کے ساتھ نہ رہ سکے تھے اس تعلیم گاہ جرش کا کچھ بھی ذکر آتا ہے۔ ایک روایت میں تو طائف میں خود سلمان فارسیؓ نے اپنے ہاتھ سے ایک منجنیق تیار کر کے لگایا۔

جرش

طائف کے جنوب میں تبالہ اور جرش کافی اہم مقام تھے۔ فتح مکہ کے بعد لیکن غالبًا طائف کے اسلام لانے سے قبل ایک یمنی سردار صرد بن عبداللہ الازدی نے اسلام قبول کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کا مجاز کیا کہ اپنے آس پاس کے علاقے میں مناسب فوجی کارروائیاں کریں۔ ابن ہشام (ص ۹۵۴) نے لکھا ہے۔ کہ صرد بن عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک فوج لے کر چلے اور جرش میں اُترے جو اُن دنوں ایک فصیل دار بند شہر تھا۔ محاصرے کی تاب نہ لا کر اہل جرش مجبور ہوئے اور ایک معاہدہ کیا (جس کا خلاصہ بلاذری ص ۵۹ میں ہے) کہ ان کی جائیداد ان ہی کی رہے گی آئندہ مسلمان مسافروں کی گزرتے وقت یہ مفت مہمان نوازی کیا کریں گے۔ نیز یہاں کے اہل کتاب یہود وغیرہ پر جزیہ بھی لگایا گیا۔ نیز حضرت ابوسفیان کو یہاں کا گورنر مقرر کر کے بھیجا گیا۔

اس جرش میں اس زمانے میں حیرت ہوگی کہ اتنا بڑا متمدن ہوکر وہاں منجنیق دبابا ضبور وغیرہ قلعہ شکن اور دفاعی آلات بنتے ہوں۔ یہاں مدینہ مغلقہ ہونا بھی حیرت پر حیرت پیدا کرے گا۔

ایک اور شہر ہے جس کا نام جیم کے زیر کے ساتھ جرش ہے۔ یہ جنوبی فلسطین (عالیہ سرابق اردن میں ہے۔ یونانی دور میں یہ بڑا اہم مقام تھا۔ اب تک اس کے شاندار کھنڈر ایک عظمت ماضی کے گواہ ہیں۔ مورخ اور جغرافیہ نگار (مثلاً یاقوت) یہاں کی فصیلوں وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

گمان ہوتا ہے کہ منجنیق اور دبابہ بنانے کی صنعت سیکھنے کاریگر اسی شمالی جرش بھیجے گئے ہوں گے اور صرد بن عبداللہ کی مہم میں جرش کے ساتھ مدینہ مغلقہ کے الفاظ محض سہواً آگئے۔ راوی کو جرش کا شائد پتہ نہ تھا یا جرش سے وہ بے خبر تھا۔ دونوں کو ایک سمجھ لیا۔

اگر ایسا نہیں بلکہ طائف کے جنوب کی بستی جرش میں بھی فوجی کلیں بنتی تھیں، تو اس علاقے کو شاباش ہے کہ وہ مکے مدینے اور طائف سے بھی تمدن میں پار تھا حتیٰ کہ طائف کے کاریگر وہاں تعلیم پانے بھیجے گئے۔

حسب معمول نومسلم جرشیوں کے ساتھ مراعات کی گئیں۔ ان کے نام ایک مکتوب نبوی میں (جو دیبلی نے محفوظ کیا ہے) لکھا ہے کہ "اسلام لاتے وقت ان کے پاس جو قبائلی چراگاہ تھی وہ ان ہی کے لیے محفوظ رہے گی جس میں ان کی اجازت کے بغیر کوئی اور اپنے جانور نہ چرا سکے گا۔ جو نہ مانے تو اس کا مال بدر ہے جو چاہے چھین لے۔ زبیر بن حماط کے بیٹے کو جو قبیلہ خثعم میں ہے گرفتار کرو کیوں کہ اس پر ایک ضمانت کی ذمہ داری ہے۔" معلوم نہیں یہ کیا واقعہ تھا۔ ممکن ہے اسی کی بناء پر صرد بن عبداللہ کو تادیبی کارروائی کرنے پر مامور کیا گیا ہو۔

متفرقات

۹ھ عام الوفود کہلاتا ہے۔ کیونکہ مکے کی فتح کے بعد سارے عرب کے درجنوں چھوٹے چھوٹے قبائل اسلام قبول کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد لے کر حاضر ہوتے اور اپنے علاقوں کی ملکیت وغیرہ کے پروانے حاصل کرتے جاتے تھے۔ اس سال کے اواخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ براۃ کے نازل ہونے پر حج کے زمانے میں اس کا

اعلان کرایا اور تمام عرب کو چار مہینے کی مہلت دی کہ اسلام کی اطاعت کریں ورنہ خدا رسول ان کی حفاظت کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ اس نہایجے کے ایک سال بعد جب رسول اکرمؐ نے ۱۰ھ میں خود حج فرمایا، تو کہتے ہیں کہ ڈیڑھ لاکھ مسلمان میدان عرفات میں جمع ہوئے تھے ان کو مخاطب ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی اور جبل الرحمہ پر چڑھ کر حجۃ الوداع کا جو مشہور خطبہ دیا وہ حقیقت میں حقوق انسانی کا ایک منشور اعظم ہے (اس کا ترجمہ آگے الگ درج ملے گا) اس کے تین ہی ماہ بعد آپؐ رفیق اعلیٰ جل شانہ سے جا ملے۔

جو قبائل مسلمان ہوتے جاتے وہاں دو گونہ سیاست کارفرما تھی۔ نہ صرف انہیں نماز پڑھا کرنے اور مرکز حکومت کو زکوٰۃ دیا کرنے کا پابند کیا گیا بلکہ اس کی تعمیل کرانے پر ہر چھوٹے بڑے مقام پر مسلمان عامل (گورنر) مرکز سے مامور کرکے بھیجے جانے لگے۔ ان کا فریضہ کئی قسم کا تھا۔ مقامی لوگوں کو اسلامیات کی تعلیم دینا۔ اچھا کردار سکھانا۔ ان کے مقدموں میں انصاف کرنا اور ان سے زکوٰۃ وصول کرکے حسب قاعدہ خرچ کرنا اور گویا اس محصول کے معاوضے میں ان کی حفاظت کرنا اور ان کے علاقے میں سماجی بیمے کا نظام جاری کرکے زکوٰۃ کی رقم سے ہر محتاج مسکین کے لیے کھانا کپڑا بقدر ضرورت مہیا کرنا۔

اس سے چند لوگ جن کے پرانے حقوق مستقرہ متاثر ہوتے اور ان کی چودھریت ختم ہو رہی تھی یا ان کی لوٹ مار اور انسانیت سوزی کی آزادی میں دخل اندازی ہو رہی تھی، بپھر سکتے تھے اور بپھرے بھی۔ چنانچہ آنحضرت کی زندگی کا آخری زمانہ اور خلافت صدیقی کا ابتدائی زمانہ اسی کی تلخی میں گزرا جس کا مختصر تبصرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔ تفصیل تو ایک خصوصی کتاب کی محتاج ہے اور واقدی کی اس موضوع پر خصوصی تالیف (کتاب الردہ) جو دستیاب ہوگئی ہے اس قابل ہے کہ اسے شائع کیا جائے اور اس کی تفصیلی تحلیل کرکے دیگر کتب تاریخ کے مواد سے اس کی تفصیل و تکمیل کی جائے۔

ارتداد و بغاوت

کسی کی کامیابی دیکھ کر حسد کا ہونا فی الطبع انسانوں میں ایک عام فطری بات ہے اور کچھ نہیں تو سارے عرب سے زکوٰۃ کا وصول ہو کر مدینہ جانا رقابت و جذبات کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔ زر کے ساتھ زمین و زور یعنی اقتدار کے لیے بھی کشمکش ہو سکتی ہے۔

یمامہ و نجد

بنو حنیفہ کا ایک سردار ثمامہ بن اثال تھا ابن حجر (اصابہ ص ۹۶۱) نے لکھا ہے کہ قبل ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مکے میں تبلیغ کی تھی تو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکایا کہ مزید اصرار کیا تو جان سے مار ڈالوں گا۔ ۴ھ میں بر معونہ اس کے علاقے میں عامر بن الطفیل وغیرہ نے دھوکے سے اسلامی مہمانوں اور مبلغوں کا قتل عام کیا تھا۔ ۶ھ کے آغاز پر (خمیس ۲/۳) ثمامہ گرفتار کر کے مدینہ لایا گیا۔ آنحضرت کی عنایت اور جاں بخشی سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کیا اور یمامہ سے غلہ کی برآمد مکے کو بند کر دی جو ابھی تک مسلمانوں سے برسر جنگ تھا۔ ثمامہ کا اسلام سچا اور پختہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کے موقع پر بھی اس نے اسلام کی عظیم خدمت انجام دی (طبری)۔

یمامہ و نجد کا اعلیٰ حصہ جو خلیج فارس سے متصل ہے، کافی حد تک ایرانی اثرات میں تھا۔ بنو حنیفہ کے بڑے قبیلے کی ایک اور شاخ کا سردار ہوزہ بن علی تھا اشتقاق ابن درید (۲۰۹) میں لکھا ہے کہ کسرائے ایران نے اسے ایک ٹوپی عنایت کی تھی جس میں ایک جواہر

لگا ہوا تھا جسے وہ پہنا کرتا تھا۔ اس لیے ہوذہ کو ذوالتاج (تاج والا) کہا جاتا تھا۔" (نیز دیکھو عقد الفرید ۲/۲۷) یہ ایرانی کاروانوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور شاہ ایران کا حلیف تھا۔ جنگ ذی میں بزنطینی قیصر روم کے ہاتھوں ایران کو شکست ہوئی اور ملک میں شاہ گردی ہونے لگی تو مرکز کا اثر ان دور دراز و ماتحت علاقوں پر ڈھیلا ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں ہوذہ کو دعوت اسلام کا خط بھیجا تو اس نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اپنا شریک اقتدار بنائیں تو اسلام لانے پر آمادہ ہے۔ جلد ہی ہوذہ دنیا سے چل بسا اور اسلام کی بڑھتی ہوئی کامیابی دیکھ کر بنو حنیفہ کے بھی چند قبائل مسلمان ہوئے۔

(ابن ہشام ص ۹۴۵ وغیرہ)

اسی زمانے میں ایک اور قبیلے کا وفد مدینہ آیا۔ جس میں مسیلمہ بن حبیب بھی تھا۔ تاریخ اسی کو مسیلمہ کذاب کے نام سے یاد رکھتی ہے۔ مدینے میں اسلام قبول کرنے کے باوجود وطن واپس ہوتے ہی اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گستاخانہ خط لکھا اور ہوذہ بن علی کی طرح شرکت اقتدار کا دعویٰ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سفیروں سے معلوم کیا کہ یہ سب مرتد ہو گئے ہیں اور ایک سخت جواب دیا گیا۔ اب مسیلمہ نے کھلم کھلا نبوت کا دعویٰ شروع کیا۔ اس فتنے کے انسداد کو کئی سال لگے۔ آخر خلافت صدیقی میں خالد بن الولید کے ہاتھوں اللہ کی تلوار جب چلنے لگی تو مسیلمہ اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے اور اس فتنے کا خاتمہ ہوا۔ مسیلمہ ایک ادیب اور قابل شخص تھا۔ قرآن کی نقل میں اس نے بہت سی آیتیں اور چھوٹے سورے بھی بنائے تھے جن میں سے بعض تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ لیکن اس مصنوعی قرآن میں ادب و اخلاق کی جگہ صرف سطحی ترنم محض پیروڈی (Parody) یا منہ چڑانا نظر آتا ہے۔ مسیلمہ میں انتظامی قابلیت اور سیاسی کاربراری بھی کافی تھی۔ اس کی ہمسایہ سجاح تمیمیہ بھی نبوت کا دعویٰ کرنے لگی تو مسیلمہ نے آسانی سے اسے رام کر لیا اور وہ اپنی نبوت سے دستبردار ہو کر مسیلمہ کی حلیف بن گئی۔ مسیلمہ کا مصنوعی قرآن اس میں خوب کام آیا۔ سجاح کی جوانی کی راتیں مرادوں کے دن تھے۔ جب مسیلمہ سے تخلیے کی گفتگو سیاسی مسائل پر ہونے لگی تو مسیلمہ کے خود آگ لگا دینے والے انتہائی فحش جملے کافی تھے۔ بچاری عورت ذات کتنی دیر ضبط کرتی۔ جنس کے سیلاب میں ڈوب کر ختم ہو گئی۔ مسیلمہ

کے قتل کے بعد اس نے توبہ کر لی اور پھر کہتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے بہت دن تک زندہ رہی۔

حجۃ الوداع کے بعد یمن میں اسود العنسی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس سردار کا نام ذوالخمار عبہلہ بن کعب تھا۔ قبیلہ مذحج نے اس کا ساتھ دیا اور نجران کا رنگ بھی بدلنے لگا اس نے آنحضرت کے متعدد عاملوں کو اپنے اور قبیلہ مراد کے ہاں سے نکال باہر کیا۔ بعض عاملوں کو قتل بھی کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے افسروں کو اپنی قوت اکٹھی کرنے اور اس بغاوت کو فرو کرنے کی جدوجہد کا حکم دیا۔ اسود کا اثر ملک پر اس کے جادو منتر وغیرہ کے باعث نظر آتا ہے۔ اس نے ایک مسلمان ایرانی النسل عورت پر اس کے حسن کے باعث ریجھ کر اور اس کے شوہر کو قتل کر کے تصرف کر لیا تھا۔ وہ راسخ العقیدہ لڑکی تھی اور اسی کی امداد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک دو دن قبل اسود مارا گیا اور بے سری فوج پھر جلد بہ آسانی رام کر لی گئی اور اس فتنہ کا بھی خاتمہ خلافت صدیقی میں ہوا۔ اس نے حضر موت سے طائف تک اپنا اثر پھیلا لیا تھا۔

مسیلمہ، سجاح اور اسود عنسی کی دیکھا دیکھی طلیحہ بن خویلد اسدی نے بھی نبوت کا سوانگ رچایا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھ کر دوستی اور شرکت اقتدار کی خواہش کی۔ یہ مدینے کی شمال میں غطفان کا سردار تھا۔ خلافت صدیقی میں حضرت خالد بن ولید ادھر مامور ہوئے اور آسانی سے اس فتنے کا بھی انسداد ہو گیا۔

غالباً ہوذہ بن علی کے بعد ذوالتاج کا لقب اور عہدہ عمان کے لقیط بن مالک الازدی کو حاصل ہوا تھا۔ اس کو بھی نبوت کے دعوے کا شوق چرایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اُنیس خط فتنہ ارتداد و بغاوت کے انسداد کے لیے اپنے عاملوں اور راسخ العقیدہ قبائلی سرداروں کو تحریر فرمائے تھے۔ اتنے میں آپ کی وفات ہو گئی اور صورت حال میں بغاوت کے پھیلنے سے مزید نزاکت و انتشار پیدا ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مدینے کے اطراف کی ایک بڑی فوج اسامہ بن زید کی سرکردگی میں فلسطین بھی بھجوا دی۔ اس سے بھی کہتے ہیں کہ شروع میں بعض لُٹیروں کو سرزوری دکھانے کی حوصلہ افزائی ہوئی اور خود مرکز مدینہ ان کے نرغے سے گویا محاصرے میں آ گیا۔

بغاوت کے کئی اسباب تھے۔ بعض لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ بعض جگہ نئے مدعیان نبوت پیدا ہو گئے تھے۔ اور بعض جگہ محض مرکزیت پر اعتراض تھا۔ اور زکوٰۃ کی مرکز کو ادائی سے انکار کیا جا رہا تھا۔ یاد ہو گا کہ ۹ھ کے اواخر میں سارے عرب میں زکوٰۃ کے محصل مامور کیے گئے تھے اور ۱۱ھ کے آغاز پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ اس فتنے کا استیصال جس تیزی، خوبی اور قوت سے ہوا وہ اگرچہ تاریخ عالم کا ایک لافانی واقعہ ہے لیکن اس کے لیے ہم عہد نبوی سے باہر ہو جائیں گے۔ یہاں اس کی تفصیلیں زیادہ تر طبری سے لی گئی ہیں۔

عہدِ نبوی کی سیاسی دستاویزیں

مکتوبات نبوی کو جمع کرنے کا شوق عہد صحابہ ہی سے نظر آتا ہے۔ کسی دور کی سیاست کو سمجھنے کے لیے مورخوں کے عام تذکروں سے زیادہ اس دور کی سرکاری تجاویزوں پر اعتماد کرنا صحیح ہوتا ہے۔ اگرچہ عہد نبوی کی بہت سی دستاویزیں زمانے کی دستبرد سے اب ناپید ہوگئی ہیں، پھر بھی کسی اور قدیم نبی یا حکمران کے برخلاف رسول عربی کے سلسلے میں ایسا جتنا مواد محفوظ ہے وہ بے نظیر ہے۔

اپنے مطالعات سیرت کے سلسلے میں اس کی بھی کچھ خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۳۶۰ھ میں مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ کے نام سے ایک کتاب مصر میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں عہد نبوی کے کوئی پونے تین سو مکتوب یکجا ہوئے۔ پھر خلافت راشدہ کا کچھ ذخیرہ ہے اس کتاب کے چھپنے کے بعد سے کوئی ڈیڑھ دو درجن مزید مکتوبات نبوی کا پتہ چلا۔ طبع جدید کا موقع ملے تو ان کا بھی اضافہ ہو کر پبلک کے استفادے کی صورت ہو سکتی ہے۔

اس باب کا ذکر صرف یہاں اس غرض کے لیے ہے کہ یہاں اگلے اور پچھلے اوراق میں بیسیوں مکتوبات نبوی کا ذکر ہے۔ ان کے لیے مذکورہ مجموعہ الوثائق السیاسیہ سے بلکہ متن کے ساتھ جملہ اختلافاتِ روایات بھی جمع کئے گئے ہیں۔ نیز حل لغات وغیرہ دیگر فوائد بھی ہیں اپنے پیشروں کا بھی احترام کے ساتھ ذکر اور ان سے استفادے کا اعتراف ہے۔

جب ساری خلقت ازل سے ابد تک ایک واحد کل کی حیثیت رکھتی اور اگلی پچھلی چیزیں سب لازم وملزوم ہیں تو کوئی ایک کتاب اپنی جگہ کیسے دوسروں سے بے نیاز کر سکتی ہے۔ ممکن ہے اس کتاب میں بھی تشنگی رہے۔ کار دنیا کو کس نے تمام کیا ہے؟

اُمہات المومنین ازواجِ مطہرات نبویؐ اور عہد نبویؐ میں بین الاقوامی عصبیتوں کو دور کرنے کی بعض تدبیریں

پس منظر

اب سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب نہ تعلیم اتنی عام تھی نہ اجنبیوں کے میل ملاپ کے اتنے ذرائع یا مواقع تھے، نہ مختلف اقطاع عالم ایک دوسرے کے اتنے محتاج تھے جتنے آج ہیں تو یہ ناگزیر تھا کہ مذہب کے فرق وطن کے فرق، قوم ونسل کے فرق، قبیلے کے فرق، فرقے کے فرق بلکہ ہر لایعنی اور بے حقیقت فرق انسانوں میں خونریزی کا جائز سبب پیدا کر دیا کریں۔ الہامی یقین وبانی (یعنی مذہب) اور عقلی استقراء واستنباط (یعنی سائنس) اب اس پر متفق ہو چکے ہیں۔ کہ کرۂ زمین کی موجودہ انسانی آبادی ایک ہی باپ کی اولاد ہے۔ اولاد آدمؑ میں ذاتی حفاظت مرکز کشی پر مجبور کرتی رہی تو معاشی ضرورتیں مرکز گریزی پر آمادہ کرتی رہیں اور اس مرکز گریزی نے برادر کشی تک کو جائز بنا دیا۔ یونانی اور لاطینی جیسی قدیم متمدن زبانوں میں (اور غالباً سنسکرت میں بھی) دشمن کے لیے جو لفظ پایا جاتا ہے، اس کے اصلی معنے محض "اجنبی" کے ہیں اور یہ ان زبانوں کی بولنے والی قوموں کے تصورات کا آئینہ دار ہے۔ کم تمدن قوموں کا کیا طرز عمل ہوگا۔ اور وحشی قبائل کا کیا حال ہوگا، اس پر کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک عرب کے صحرائی براعظم کا تعلق ہے ہمیں وہاں بھی یہی صورت حال اپنی پوری شدتوں کے ساتھ......... بلکہ شاید سب سے زیادہ انتہائی صورت میں...... نظر آتی ہے۔ عرب اور عجم کا بنیادی اور ابتدائی فرق چھوڑ بھی دیا جائے تو عدنانی اور قحطانی قبائل کا باہمی تعصب کچھ اتنا شدید تھا کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بھی اس کے اثرات پڑے بغیر نہ رہے۔ پھر عدنانیوں میں بھی مضر اور ربیعہ کی کشمکش کچھ کم شدید نہ تھی اسی طرح نیچے اترتے ہوئے قریش وغیر قریش ایک مستقل مسئلہ تھا۔ اور خود قریش کے اندر بنی ہاشم و بنی اُمیہ کی رقابتوں سے قبل اسلام کی تاریخ میں کون واقف نہیں۔ ان سب کے علاوہ شہری اور خانہ بدوش یعنی حضری اور بدوی کا جھگڑا ابھی الگ تھا۔ اور باہم ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے تھے۔ آج بھی کوئی بدوی شتربان بڑی متانت اور استخفاف وحقارت کے ساتھ کہے گا کہ مُرغیاں اور کوئی بدوی پالے؟ وہ تو حضریوں کے پاس ہوتی ہیں۔" جیسا کہ خود میرے ایک سوال پر حجاز میں جواب ملا تھا۔

ان کی جہالت اور اُجڈپن کے باعث یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آج حالت امن میں کسی جرمن اور فرانسیسی میں یا کسی پولستانی اور روسی میں باہم جو طبعی نفرت ہوتی ہے۔ وہ اس تنفر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو قبل اسلام کے ہم جد عربی قبائل میں آپس میں پائی جاتی تھی۔ اس چیز نے ان میں انفرادیت پسندی اتنی بڑھا دی تھی کہ نکاح بیاہ عموماً قبیلے کے اندر ہی ہوتا تھا۔ قبائلی عصبیت ایک قبیلہ کے لیے دوسرے کو اپنا کفو یا ہمسر سمجھنے کی اجازت نہیں دیتی پھر رات دن کی بات بات پر خانہ جنگیاں الگ تھیں۔ آبادی کی روز افزوں کثرت اور وسائل معاش کی عرب میں قلت الگ مسائل پیدا کر رہی تھی۔

آغاز اسلام

ان حالات میں اسلام کا آغاز ہوتا ہے اور وہ ان تمام تنگ نظریوں اور عصبیتوں کے خلاف ایک دوسری انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔ اسلام کے نزدیک عرب کا خدا بھی ایک ہی تھا اور عجم کا بھی جو عدنانیوں کا خدا تھا۔ وہی قحطانیوں کا۔ تمام انسان ایک ہی باپ آدمؑ کی اولاد ہیں اور گورے کالے ہونے یا زبانوں اور وطنوں کا فرق رکھنے سے ان کی فطری مساوات میں کوئی

فرق نہیں آتا۔ اگر کوئی برتری وفروتری ان میں آپس میں ہے تو وہ صرف ہر ایک کے ذاتی اعمال واخلاق کے باعث ہے۔

یہ بظاہر خدا کی وحدانیت کا مسئلہ عقائد ودینیات سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کی عمرانی اہمیت بھی اسلامی سماج میں کچھ کم نہیں۔ جب تک سارے جہاں کے انسانوں کا خدا ایک نہ ہو، اس وقت تک نہ تو مساوات انسانی کی کوئی حقیقی اساس قائم ہو سکتی ہے اور نہ انسانوں کو طاقت کے باوجود بُرائیوں سے بچنے اور نیکیوں کے کرنے کی کوئی ترغیب میسر آسکتی ہے۔

اسلامی تعلیم عام عربوں کے رواجات اور تصورات کے عین برعکس اور مخالف تھی۔ جس طرح منصفانہ سے منصفانہ فیصلہ بیکار ہے جب عدالت اس کا نفاذ نہ کرا سکے۔ اسی طرح اچھی سے اچھی تعلیم اور اصول وعقائد فضول ہیں جب ان پر عمل نہ ہو۔

عہد نبوی کی ہمیں بڑی خصوصیت اور امتیاز یہی نظر آتا ہے کہ وہاں تعلیم اور تعمیل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ نظریات اور نظائر میں فرق نہیں ہوتا اور انسان کی فطرت کے اقتضاء اور عقل کے مطمع نظر میں اعتدال اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسلام راتوں رات نہیں پھیل گیا۔ عربوں کی پلک جھپکاتے کایا پلٹ نہیں ہوگئی۔ ان حالات میں اس امر کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں کہ اسلام نے انسانی سماج کو قدیم عصبیتوں سے نجات دلانے میں جو کامیابی حاصل کی اس کے وسائل اور مدارج اس عالم اسباب میں کیا رہے؟

آنحضرت ﷺ کا طریقہ کار

یوں تو اسلام کے بنیادی مقاصد اور وسائل "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مصداق ہیں یعنی جو مقصد ہے وہی آپ اپنا وسیلہ ہے۔ اسی لیے اوّلین وسیلہ بین الاقوامی عصبیتوں کو دور کرنے کے لیے توحید خداوندی ہی رہا۔ جب سب کا خدا ایک ہو اور وہ عادل اور سب پر یکساں مہربان ہو تو خود بخود انسان کے خود ساختہ مراتب اور درجات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سب انسانوں میں صحیح عبدیت اور اطاعت خداوندی پیدا کرنے کے لیے یہ حدیث ارشاد ہوئی کہ سب انسان آدمؑ سے پیدا ہوئے اور خود آدمؑ مٹی (جیسی حقیر چیز سے) بنے تھے۔

قرآن میں یہ اصول بتایا گیا کہ انسانوں کا قوموں اور قبیلوں میں بٹنا صرف پہچانت کے لیے ہے ورنہ امتیاز و اعزاز صرف تقویٰ اور برائیوں سے بچنے کے مدارج کے لحاظ سے ہے۔" ایک اور جگہ بتایا گیا کہ انسانوں کی بولیوں اور رنگوں کا اختلاف محض ان کے خلاق کی قدرت کی نشانی ہے۔ اور یہ بجائے خود مراتب کی درجہ بندی نہیں کرتا۔

عہد نبوی میں چونکہ نظریات اور نظائر میں فرق نہیں ہوتا تھا اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آقا و غلام، قریشی و غیر قریشی، عربی و عجمی، حبشی و رومی و ایرانی ایک ہی صف میں شانہ بہ شانہ رہتے اور ان میں ان قدیم جاہلی اختلافات کا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ پیغمبرؐ اسلام کی اس سیاست کو آپ کے جانشینوں نے بھی پوری وفاداری سے جاری رکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کی ذہنیت میں تواتر و توارث کے باعث اتنی رچ گئی کہ پھر اسلام اور مساوات لازم و ملزوم سمجھے جانے لگ گئے۔ مثال کے طور پر انسانوں کی مساوات کے بارے میں ہندوستان سب سے پسماندہ ملک ہے۔ اور جات پات کی کڑی قدامت پسندی کے لحاظ سے شاید ملیبار سب سے گیا گزرا علاقہ ہے، یہاں "اچھوت" کثیر تعداد میں بستے اور انسانیت سوز ذلتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ اس علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ نسبتاً بہت بہتر سلوک ہوتا ہے اور آج بھی کوئی اجنبی ناظر حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صبح کو کوئی اچھوت محض اپنی پیدائش کے باعث ذلت و خواری کا مستوجب ہے تو شام کو اسلام لانے کے بعد اسی گاؤں میں اور اسی مقام پر اس کے ساتھ وہ سلوک اعلیٰ جات کے ہندو خوشی سے کرنے لگتے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے کشمیر میں اب اچھوت باقی ہی نہیں ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی بیان کی جاتی ہے کہ وہاں عالم باعمل مسلمان پہنچے اور اعلیٰ جاتیوں کی تنگ نظری نے ان اچھوتوں کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب مسلمانوں کا قبلہ بھی ایک قرار دیا، قانون بھی ایک اور قیادت بھی ایک، یہ نہیں کہ اعلیٰ خاندانوں کے مندر الگ ہوں، نشست گاہیں، (Pews) الگ ہوں، اور ثواب الگ ہوں، انہیں پست طبقات کے مقابلے میں سزائیں ملیں ہی نہیں اور ملیں بھی تو برائے نام۔

قبلے کی یکسانی نے کرۂ ارض کے ہر حصے کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک خاص مرکز کا

تابع ہے اور اس کی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بن سکتی۔ قانون کی یکسانی نے وہ حیرت زا صورت نہیں پیدا ہونے دی کہ کشمیر کا برہمن مدارس یا بنگال کے برہمن کے ساتھ رشتہ ناتہ تو کیا، ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ قانون کی یکسانی سے زیادہ غالباً بنی نوع انسان کو پرانی وحدت طرف لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہوگی، اور قانون کے تفاوت سے زیادہ اپنوں کو بیگانہ بنانے والا امر کوئی اور نہ ہوگا۔ یہ سب بھی بیکار ثابت ہوتے اگر قیادت ایک نہ ہوتی۔ اگر دین اور دنیا کو ایک مرکز پر نہ لا کر جمع کیا جاتا۔ اگر تعلیم کی جبری تعمیل کا انتظام نہ ہوتا، اور اگر روحانی اور مادی مسائل کی اعتدال کے ساتھ باہم آمیزش نہ کر دی جاتی تو اسلام میں اور کسی فلسفی کی خیال آرائی یا مجذوب کی بڑ میں کوئی فرق نہ رہتا۔ اپنی تعلیم کی اولین تعمیل کے سلسلے میں پیغمبرؐ اسلام نے دولت مندوں کو سب سے پہلے دبوچا اور انہیں اس کا پابند کیا کہ اپنی زائد از ضرورت دولت کا ایک معینہ و معقول حصہ لازمی طور پر مرکز کو بطور ٹیکس ادا کیا کریں۔ اس کی ادائی میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی کی کمی بھی بغاوت سمجھی گئی اور ایسوں کے خلاف پیغمبرؐ اسلام کے سب سے پہلے جانشین صدیق اکبرؓ نے اعلان جنگ کر دیا اور جنگ کی ہولناکیوں نے وہ بات سمجھا دی جو ترغیب و تفہیم کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

مانع زکوٰۃ دولت مندوں کے خلاف ان جنگوں کی جیسی چاہیے اہمیت ابھی تک مورخوں نے نہیں سمجھی ہے ورنہ تاریخ معاشرہ انسانی میں وہ ایک نقطۂ انقلاب ہیں جہاں اس نے تقسیم و گردش دولت کی ضرورت کو محسوس کرایا وہیں رعایا کو اپنے رعایا ہونے کا احساس کرایا۔ ورنہ سابق میں کم از کم عرب کی حد تک، شیخ قبیلہ اور بزرگ خاندان کے سوا کسی اور انسان کی اطاعت نہ ضروری تھی اور نہ روا رکھی جاتی تھی۔

پورے عالم کے ہمہ گیر انسانی معاشرے کے ان اساسی انتظامات کے ساتھ پیغمبرؐ اسلام نے مقامی انتظامات کو بھی نظر انداز نہ فرمایا۔

عربوں کے متعلق

عربوں میں چوں کہ قبیلہ واری نظام ہی عام طور پر رائج تھا، اس لیے رشتہ داری سے زیادہ موثر کوئی اور وجہ دوستی و حلیفی کی نہیں ہو سکتی۔ چاہے خود یہ بھی کتنی ہی کمزور چیز کیوں نہ ہو،

لیکن اور اسباب کے مقابلے میں یہ بہر حال زیادہ مستحکم و مستقل امر تھا۔

ہجرت مدینہ کے بعد ایک اسلامی حکومت قائم ہو گئی جو ایک شہری مملکت سے آغاز پا کر دس ہی سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی عراق و فلسطین تک کے دس بارہ لاکھ مربع میل رقبے پر محیط ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں پیغمبر اسلامؐ نے جو عقد فرمائے وہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے دلچسپی رکھتے ہیں۔



تعداد ازدواج ہر صورت میں برا نہیں ہوتا۔ خاص کر جب ان کا مقصد بوالہواسی و عیاشی بالکل نہ ہو۔ بہر حال نقشہ ہمراہی سے ازدواج مطہراتؓ کی جغرافیائی تقسیم اور ملک گیر وسعت نظر آ جائے گی۔ قریب قریب ہر بڑے قبیلے کی اس میں نمائندگی ہے، اور چونکہ یہ عموماً نہایت ہی شریف خاندان اور بڑے رتبے کی ہوتی تھیں اس لیے اُن کے اثرات بھی دور رس ہوتے تھے۔

اہل مکہ سے باہر بی بی زینبؓ بنت خزیمہ اور بی بی میمونہ بنت حارث دونوں کا تعلق یمن کے زبردست قبیلہ عامر بن صعصعہ سے تھا۔ خاص کر بی بی میمونہؓ کی آٹھ تو بہنیں تھیں اور سب نہایت اچھے گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں اور مستند مؤلف محمد بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کو اپنی کلاسیکل کتاب میں تسلیم کرنا پڑا کہ:۔

> پورے عرب میں کوئی اور ایسی عورت معلوم نہیں جس کے داماد اُس سے زیادہ شریف ہوں جتنے ہند بنت عوف کے جو بی بی میمونہؓ اور ان کی بہنوں کی ماں تھی۔

بی بی جویریہؓ بنی المصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ یہ ایک نہایت ہی طاقتور وسیع قبیلہ تھا اور مکے اور مدینے کے مابین رہتا تھا۔ اس عقد کے ساتھ اسلامی مملکت کی سرحد مکے کی سمت کوئی سو میل آگے بڑھ گئی۔

کندہ جنوبی عرب میں ایک شاہی خاندان تھا۔ اسلام سے پہلے ان کی سلطنت جنوبی عراق تک عرب کے مشرقی حصہ میں پھیل گئی تھی۔ اس کے اثرات عہد اسلام میں بھی کافی تھے اس قبیلے سے بھی آں حضرتؐ نے ازدواجی تعلقات قائم فرمائے تھے۔ یہی حال قبائل کلاب و کلب و بنی سلیم وغیرہ کا تھا، جن کی تفصیلوں کی یہاں ضرورت نہیں۔ کتاب المحبر اور طبقات ابن سعد جلد (۸) میں اس کے جیتے جاگتے تذکرے ہیں۔

خود مکے میں بی بی خدیجہؓ کا تعلق قبیلہ بنی اسد بن عبدالعزیٰ سے تھا۔ بی بی سودہ کا بنی عامر بن لوی سے بی بی عائشہؓ کا بنی تیم سے بی بی حفصہؓ کا بنی عدی سے، بی بی ام سلمہؓ کا بنی مخزوم سے بی بی ام حبیبہ کا بنی امیہ[1] سے، بی بی زینبؓ بن جحش کا قبیلہ بنی اسد بن خزیمہؓ سے کے میں ان سے زیادہ بااثر کوئی خاندان نہ تھے۔ بی بی ماریہ قبطیہ مصر کی تھیں اور پہلے عیسائی رہ چکی تھی[2]۔ بی بی صفیہؓ کا تعلق خیبر کے یہودیوں سے تھا۔

اس مختصر مساحت کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ نکاحوں کے ذریعے سے مسلمانوں میں پرانی عصبیتوں کو دور کرنے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے کتنی وسیع کوششیں فرمائی اور نتائج بھی بتاتے ہیں کہ یہ کوشش بیکار نہ رہیں۔

غیر عربوں کے متعلق

آں حضرتؐ نے اس نفسیاتی حقیقت کا اپنے طرز عمل میں ہمیشہ بڑا لحاظ رکھا کہ کسی کو برا کہنے سے اس میں ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کے آغاز کی تعریف کر کے بعد میں

۱۔ ان دونوں کے شوہر ہجرت حبشہ پر وہاں کے ماحول کے باعث مرتد ہو کر عیسائی ہو گئے۔ لیکن بی بی سودہ اور بی بی ام حبیبہ اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ اس اخلاص کا پھل ملا کہ امہات المومنین بنیں۔

۲۔ ان کی بہن کا نام سیرین یا شیرین بیان کیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعی بہن تھیں تو پھر بظاہر یہ دونوں ایرانی الاصل اور پارسی ہوں گی۔ ایران کے حملہ مصر کے وقت آ گئیں۔ شکست کے وقت وہیں رہ گئیں اور

غلطی ہے اس کے طرزِ عمل میں برائیاں گھس آنے کا ذکر کرنا اس کو سنجیدگی سے غور کا موقع دے سکتا ہے۔ یہودیوں نے نصرانیوں اور خود مشرکین عرب کے متعلق اسلامی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ خدا کے سچے اور عالی رتبہ نبی تھے۔ مگر ان کے بعد کی نسلوں نے ان کی سچی تعلیم میں من گھڑت حذف اضافہ کر لیا ہے۔ یہ تعلیم کہ:

> ''اے الہامی کتابوں والو ایک بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر کی ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کا کچھ شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم اپنے ہی میں سے بعض کو خدا چھوڑ کر آقا بنا لیں۔'' (قرآن)

زیادہ تر یہود و انصاری کو تعاون و یکجہتی کی دعوت کی، پھر یہ کہا گیا:۔

> ''ہر قوم کا ایک ہادی ہوا ہے۔ ہر اُمت کے لیے ایک خدائی پیغام رساں ہوا ہے۔ اے محمد ہم نے اپنے بعض پیغمبروں کا تجھ سے ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں۔'' وغیرہ (قرآن)

یہ تمام ہی دنیا کے مقدس لوگوں کا احترام کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کا صریح فیصلہ تھا۔ اور آخر میں:۔

> ''وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ لوگ جو یہودی بنے اور نصرانی اور صابی، ان میں سے جو بھی خدا اور روزِ قیامت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو ایسے لوگوں کو ان کے رب کے پاس ان کا بڑا اجر ملے گا، اور انہیں خوف و رنج کی کوئی وجہ نہیں۔''

اسلام کا دعویٰ تھا کہ وہ ''بنیادی مذہب'' ہے۔ آدمؑ سے عیسیٰ تک سب اسی کے پرچار اور تبلیغ کے لیے آئے تھے۔ وہ ازلی صداقتوں پر مشتمل ہے جن کے مانے بغیر کسی معقولیت پسند کو چارہ نہیں اور بنیادی واجبات کے سوا باقی ہر چیز میں انسانوں کو کافی وسیع اباحت و صوابدید حاصل ہے کہ جو چاہے کرے۔

مذاہب کے مابہ الاشتراک امور اور بنیادی صداقتیں جو انسانی حقوق و واجبات کے

متعلق تھیں بیان کر کے اسلام نے ساتھ ہی مذہب کو ایک نہایت سہل و آسان چیز (الدین یُسر) بھی بنا دیا اور انسان اور خدا کے مابین راست رشتہ جوڑ دیا۔

دوسرے الفاظ میں تمام مذاہب کے پیروؤں میں باہمی احترام و رواداری کا جذبہ پیدا کرنا اور فروع کو چھوڑ کر معقول اصول پر سب کو ایک ہو جانے کی دعوت دینا ہی اسلامی پیغام تھا اور اسی ''بنیادی مذہب'' کے ذریعے سے دین و دنیا کی خوبیوں سے بیک وقت استفادہ ممکن تھا، اور خیر و شر کے آمیزے (یعنی انسان) کو اعتدال پر رکھنے اور شیطان اور فرشتہ ہر دو سے الگ بلکہ دونوں سے بہتر خدائی تخلیق کا ایک کامل ترین نمونہ بنانے کا طریقہ بتا دیا گیا۔

اس ہادیٔ اعظم کی یہ تعلیم شائد آج بھی عصبیتوں سے بھری دنیا کے لیے سنجیدہ غور و فکر اور انسانیت سوز برادر کشیوں کے انسداد کا سامان مہیا کرتی ہے۔

یہ ایک بے معنی چیز ہوگی کہ نبیؐ کے بتائے ہوئے راستے پر تو چلیں لیکن خود نبیؐ کو نہ مانیں یوں بھی راستے میں بھٹکیں اور ہادیٔ اعظم موجود نہ ہو تو کعبے کی جگہ ترکستان پہنچ جائیں گے اور اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہوگی۔

بعثت نبویؐ کے وقت کی چند عالمگیر گتھیاں

اور ان کا اِسلامی حل

تمہید

تمام نباتی اور حیوانی جانداروں میں انسان چاہے کتنا ہی بلند پایہ اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، اس "اشرف المخلوقات" میں بھی آغاز ترقی، کمال اور فنا کے بعد پھر کرّ اس کا سلسلہ لامتناہی طور پر جاری رہتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے، بڑا ہوتا ہے، بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ لیکن اس پر دنیا ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اسی اثناء میں کچھ بڑوں سے کچھ نئے بچے پیدا ہو جاتے ہیں اور فنا ہونے سے قبل پھر کچھ بڑھتے اور نسل پیدا کرنے کے قابل بچے چھوڑ جاتے ہیں۔

شائد اس مظاہرہ قدرت کا نتیجہ ہے کہ انسانوں میں ایک ہی چیز بار بار تازہ ہوتی ہے اور اپنا ردعمل پیدا کرتی نظر آتی ہے۔ انسان دیگر مخلوقات کے مقابلے میں اپنوں کے سابقہ تجربوں کو محفوظ رکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہے اور اسی لیے اس کا تمدن اور اس کی قوت مخلوق خدا میں روز افزوں سر بلندی حاصل کرتے جا رہے ہیں، لیکن اس میں جو بنیادی خصوصیت ہے کہ پیدائش، نشوونما اور فنا کا سلسلہ جاری رہے، اسی لیے ہزاروں چیزیں جو ہمارے بڑے اپنے تجربوں سے معلوم اور طے کر چکے تھے وہ ہمارے بچوں اور نوعمروں کو اس وقت تک پسند نہیں آتے۔ جب تک وہ خود بھی تقریباً اتنے ہی تجربوں اور تلخیوں سے خود بھی نہ گزر جائیں۔

اس طویل تمہید یا مشاہدے کا منشا یہ ہے کہ زمانہ قدیم کے تمام تجارب اور گتھیاں اور ان کے حل اب داستان پارینہ نہیں ہو گئے ہیں۔ شاید یہی کہنا صحیح تر ہے کہ وہ سب کی سب آج بھی باقی ہیں۔ ان کا حل اگر کبھی معلوم بھی کیا گیا تو اس حل پر عمل کرنے والوں کے زمانے ہی تک اس کا اثر بھی محدود تھا۔ جیسے ہی نئی نسل پھر سے سبق بھلا بیٹھی اور نئے سرے سے پرانی الجھنوں میں پڑی تو پھر سے وہی مسئلہ نمودار ہو گیا اور اس کے وہی اثرات ہویدا ہو گئے۔

عہد نبوی کے آغاز پر دنیا کی حالت

اب (۱۳۹۵ھ سے (۱۳۷۸ھ) سال قبل بعثت نبوی کے وقت دنیا کی حالت جو کچھ تھی وہ کافی مفصل اور صحیح طور پر معلوم ہے۔ انسانی دنیا کبھی شر محض نہیں بنتی۔ اس میں کچھ اچھے لوگ بھی باقی رہتے ہیں بلکہ خود بد سے بد آدمی میں زندگی کے کچھ لمحے ایسے آ ہی جاتے ہیں جب وہ کچھ نہ کچھ نیکی کر جاتا ہے۔ لیکن یہاں ہمیں ان رجحانوں، عادتوں یا خصلتوں سے بحث ہے جو اس زمانے میں براج رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کو ہم لیں گے۔ اور دیکھیں گے کہ فاران کی چوٹیوں سے اصلاح کی جو دعوت شروع ہوئی اس نے انسانی سماج پر کار فرما ان مختلف عادتوں کے متعلق کیا رائے قائم کی اور اپنے طاقتور ہاتھوں سے انسانی عادتوں کو کن سانچوں میں دبا کر کن شکلوں میں مبدل کیا۔ فطرت انسانی کے بدلنے کا سوال نہ تھا۔ صرف اس کے اظہار کے لیے راستے مقرر کرنے سے غرض تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان میں کم و بیش رحم بھی پایا جاتا ہے اور غضب بھی، برداشت بھی پائی جاتی ہے، آرام طلبی بھی اگر غفلت اور آرام طلبی کو فنا کر دیں تو پھر انسان، انسان ہی نہیں رہے گا چاہے وہ فرشتہ ہو جائے یا پتھر، سوال صرف یہ ہے کہ انسان کس وقت رحم کا اظہار کرے اور کس وقت غضب کا، کب ضبط سے کام لے اور کب ضبط کرنا نامناسب ہے۔

مصلح دراصل یہی ہدایت کرتا ہے کہ انسان اپنی کس خصلت یا قوت کو کس راہ پر لگائے اور اس کا کس حد تک مظاہرہ کرے۔

عہد نبوی کے آغاز پر دنیا میں بڑی بڑی متمدن سلطنتیں موجود تھیں۔ مدائن کے ایرانی، قسطنطنیہ کے بیزنطینی اور خانبالغ کے چینی دنیا کے تین بڑوں پر مشتمل تھے۔ انسانی دماغ اہرام مصر بھی بنا چکا تھا۔ ایلورہ اجنتہ بھی اور آیا صوفیہ بھی، تو ریت کی گرمی بھی دنیا میں آ چکی تھی۔

انجیل کی نرمی بھی، وید کی جات پات کی تقسیم اور کنفوشس تعلیم کے مطابق ایک سو ایک پشت تک کی رشتہ داری کو یاد رکھنے کی کوشش بھی کر چکا تھا۔ کاوٹیلیا کی ارتھ شاستر بھی لکھی جا چکی تھی اور ارسطو کی پالیٹکس بھی مہابھارت بھی الیڈ و اوڈیسے بھی۔ غرض مذہب، فنون لطیفہ، تعمیرات، ادبیات، سیاست، صناعی غرض ہر شعبے میں ان مدارج پر پہنچ چکا تھا کہ ان کی عظمت آج بھی کسی کے سامنے شرمندہ نہیں۔

لیکن ان ذہنی کمالات کے ساتھ روحانی زوالات بھی کم نہ تھے۔

قومیت

ایرانیوں کو اپنے گورے رنگ پر اتنا ناز تھا کہ حبشیوں اور ہندوؤں کو کوے کہا کرتے تھے۔ عربوں کو اپنی زبان کی ساخت اور مفہوم کی ادائی کی صلاحیت پر اتنا ناز تھا کہ اپنے سوا ساری دنیا کو گونگا سمجھتے تھے۔

ایرانی بیشک گورے تھے اور عربی زبان بے شک بڑی نایاب خصوصیتیں رکھتی تھیں لیکن اس واقعے کی صداقت کو اتنی ہی کم اہمیت تھی جتنا اس کو کہ انسان کے دانت منہ کے اندر ہوتے ہیں اس میں ناز کرنے اور اکڑنے کی کونسی بات تھی اور محض اختلاف رنگ و زبان کی بنا پر تعصب و عناد کیسے روا ہو سکتا تھا۔

اتنے میں یہ صدا بلند ہوئی کہ یعنی تمہارا زبانوں اور رنگوں میں آپس میں اختلاف رکھنا محض ایسی نشانیوں پر مشتمل ہے جن سے صاحب عقل و فکر خدائے خلاق کی کاریگری کو پہچان اور دیکھ سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی حکومت میں بلال حبشی اور صہیب رومی میں کوئی فرق بھی نہ رہا۔ نہ ترکوں نے حبشیوں کی کنجنگ کی اور نہ عربوں نے چینیوں کے پُر امن زندگی گزارنے میں کوئی دشواری محسوس کی۔

جات پات

سب ایک ہی آدمؑ و حواؑ کی اولاد ہونے کے باوجود بھائی چارہ اتنا بھلا دیا گیا تھا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کو چھونا تو کیا اس کا سایہ اپنے سایے پر پڑنے دینا بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ علم و عرفان کے متعلق اتنی بخالت اور خود غرضی تھی کہ اپنے کمالات ذہنی کے مجموعے کی

مقدس کتاب کو کوئی اجنبی چھو یا پڑھ تو کیا اگر محض سن بھی لیتا تو سزا میں پگھلتا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں ڈال کر اسے ہلاک کر دیا جاتا تھا اور کہیں چھوٹی بڑی سیاسی وحدتوں میں اپنے فطرتاً اچھے ہونے کا اتنا غرور ہو گیا تھا کہ باقی دنیا میں کوئی خوبی اور اپنے میں کوئی خامی نظر ہی نہیں آتی تھی۔

اس وقت یہ ربانی پیغام کی صدا بلند ہوئی کہ:۔ اے انسانو! ہم تمہیں ایک مرد ایک عورت سے پیدا کرتے ہیں اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں محض اس لیے بانٹتے ہیں کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ خدا کے نزدیک تم میں سب سے معزز تو وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور خدا ترس ہو۔

پھر کیا ہوا؟

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

خاندان غلاماں اور خانولاد ممالیک کی حکمرانی سے کسی کو اس لیے عار نہ ہوا کہ غلام زید اور غلام زادہ اسامہ کے تحت بھی صدیقؓ و فاروقؓ اور سیف اللہؓ و اسد اللہؓ اپنی ہتک نہ محسوس کرنے کی تعلیم مل چکی تھی۔ انسانوں کی اصولی و فطری مساوات اور پرہیز گاروں کی اکتسابی فضیلت و برتری کے لیے نظریے نے وہ تمام مصنوعی اور انسان سازیت ملیا میٹ کر دیے جو اب بھی غیر اسلامی سماجوں میں موجود اور انسانوں میں نہ ختم ہونے والی تلخی و فساد انگیزی پیدا کر رہے ہیں۔

ثار یا غیر مختتم انتقام در انتقام

عام انسان کی کچھ افتاد طبع ہی ایسی ہے کہ نہ دوسرے کا احسان یاد رکھتا ہے اور نہ دوسرے کی پہنچائی ہوئی تکلیف بھولتا ہے۔

پرانے ناموں کے محض دہرانے سے مفہوم کا سمجھنا بعض نو عمروں کے لیے دشوار ہوگا، اس لیے بطور تمہید ایک نئی مثال پیش کی جاتی ہے۔ آج جاپان میں امریکیوں کی اکڑفوں، اور زیادتیوں کو دیکھ کر ہمیں جاپان سے ہمدردی ہوتی ہے۔ لیکن دراصل دوران جنگ میں امریکیوں

سے جاپانیوں نے بدسلوکیاں اور انسانیت سوز برتاؤ کیا، اسے یاد کیا جائے تو امریکہ سے ہمدردی ہونے لگتی ہے اور اگر جنگ سے قبل امریکہ میں جاپان کے ساتھ جو تعصب برتا جاتا اور حقیر سمجھا جاتا تھا اسے دھیان میں رکھا جائے تو پھر دوران جنگ کے جاپانی طرز عمل سے ہمدردی ہوسکتی ہے۔ اگر امریکہ کے قوانین توطن سے قبل کی جاپانی نفرت کو سوچا جائے جو امریکہ سے تھی تو امریکہ سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ لیکن اگر جاپانی نفرت کے شروع ہونے سے قبل امریکہ کے جاپان پر حملہ کرنے اور جبراً تجارتی کوٹھیاں کھولنے کی اجازت حاصل کرنے پر غور کیا جائے تو جاپان سے ہمدردی ہونے لگتی ہے پھر اگر جاپان کے دنیا جہاں سے الگ تھلگ رہنے پر اصرار اور اپنے ہاں کی قدرتی پیداوار سے باقی انسانوں کو استفادہ کرنے دینے سے بے وجہ انکار پر غور کیا جائے تو امریکہ سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔

غرض انتقام در انتقام کے یہ طویل سلسلے کبھی ختم نہیں ہوسکتے۔ اگر آدمی میں مضی ما مضیٰ پر عمل کرنے اور عفو و درگزر سے کام لینے کا حوصلہ نہ ہو۔

عہد نبوی کے آغاز پر عرب کے قبائل کے اندر جاریا انتقام کا اس طرح کا سلسلہ غیر مختتم تھا۔ ایران (روم) کی ہزار سالہ کشمکش یہی بتا رہی تھی۔ ہندوستان میں برہمنی اور بدھ مت کی کشمکش بھی ایسی ہی تھی۔ خود پیغمبر اسلام کو مکے والوں نے بھی خواہانہ دعوت اصلاح پر جسمانی و روحانی تکلیف دی۔ جان لینے کا قصد کیا۔ جلاوطنی پر آپؐ کی اور آپ کے رفیقوں کی جائیداد اور گھر در ضبط کرلیا۔ جلاوطنی میں بھی چین نہ لینے دیا۔ بدر پھر اُحد پھر خندق میں روز افزوں شدت سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فنا کردینے کے لیے چڑھ دوڑے اکیس برس کی غیر منقطع کشاکش کے بعد مکے پر اچانک اسلامی فوج کا قبضہ ہوگیا اور یہ جوہری بم سے بھی زیادہ بے بس کردینے والا واقعہ تھا۔ کیا اس وقت مکہ میں قتل عام مناسب تھا؟ مکے والوں کی پوری جائیداد کی ضبطی ناجائز ہوتی! مکے والوں کو قیامت تک کے لیے غلام اور اچھوت قرار دینے میں زیادتی سمجھی جاتی؟ مگر سرور کائنات نے فتح مکہ پر اہل شہر کو جمع کرکے کیا کہا تھا؟

(حدیث: یعنی آج تم پر کوئی الزام باقی نہیں۔ جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا جاتا ہے)۔

انتقام لیتے تو جذبۂ درندگی کی بے شک تسکین ہوتی مگر تکلیفیں پہنچ چکی تھیں۔ لوگ مر چکے تھے۔ جو بات ہوچکی اسے پھر ان ہونی تو نہیں کہا جاسکتا۔ اس طرح مال لوٹ لیتے میں

تھوڑی سی غنیمت ہاتھ لگتی مگر مال ہاتھ کا میل ہے آیا اور چلا گیا۔ مدامی غلامی کا حکم تو دیا جاسکتا تھا لیکن کسے معلوم کتنے دن چل سکتا کے کو خاموش اور پردہ انتقامی تیاریوں میں کامیابی ہوجاتی تو اس کا ردعمل کتنا سخت نہ ہوتا۔ اس کے برخلاف لا تثریب علیکم الیوم کی صدائے بازگشت کا گونجنا ابھی بند بھی نہیں ہوا تھا کہ مکے والوں کے دل پگھل گئے۔ جسم شرم سے پسینہ پسینہ ہوگئے اور مکے کی ایسی کایاپلٹ ہوئی کہ پھر کبھی مکے پر اچانک قبضے اور شکست وہاں والوں کو نہ خیال آیا اور نہ رنج محسوس ہوا، بلکہ اپنے سابق دشمن کے سب سے تابعدار معاون بھی بن گئے، کاش کوئی آئزن ہاور کوئی اسٹالن، کوئی آرتھر محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کی توفیق پاتا اور محوریین کی آئندہ انتقامی جنگ کے امکان کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کرکے انسانوں کو امن چین عطا کرسکتا۔

تصور حیات

عہد نبوی کے آغاز پر دنیا میں جو بڑے بڑے مذہب اور تمدن باقی تھے، ان میں انسان کا مقصد زندگی اور تصور حیات مختلف تھا۔ بدھ مت نے روح اور نفس کے تزکیے پر انسان کی توجہ کو اتنا مرتکز کردیا تھا کہ ان کے نظام تصور میں خدا کی کوئی جگہ اور ضرورت ہی نہیں رہی تھی اور بظاہر بغیر کسی دوررس مقصد کے انسان کو اپنے قوائے فطری کے استعمال و استفادہ سے روک دیا گیا تھا عیسائیت کی عجیب حالت تھی۔ ایک طرف تو پہاڑی وعظ کی تعلیم تھی جو محبت سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی بلکہ ناقابل عمل اور غالیانہ انتہاپسندی کو پہنچی ہوئی تھی، لیکن ساتھ ہی اس کے بانی مذہب کی طرف یہ مقولہ بلکہ حکم بھی منسوب تھا کہ قیصر کی چیزیں قیصر کو اور خدا کی چیزیں خدا کو دے دو۔ اگر اس سے شرک لازم نہ بھی آئے تو مذہب سیاست میں ایک ایسی مدامی جدائی پیدا کردی گئی تھی کہ سیاست کو اخلاق سے کسی واسطے کی ضرورت ہی نہ تھی، اور منفعت اندوزی اور مصلحت بینی کے تحت بادشاہ انتہا درجہ مادیت پرست اور بے رحم بن سکتا تھا، اور دوسری طرف مذہب کو عوام کی زندگی کے نہایت محدود اور خالص عبادتی حصے کے سوا کبھی کسی اور شعبے میں دخل نہیں ہوسکتا تھا، اور بادشاہ کلیسا کے مفادات میں تصادم کی صورت میں راسخ العقیدہ اور ساتھ ہی بادشاہ سے بھی وفاداری رکھنے والا شخص عجیب گومگو کی حالت میں مبتلا ہوجاتا

ہے۔ مثلاً سپاہی پیشہ شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پہاڑی وعظ پر کس طرح عمل کرے؟ یا اگر ہر شخص راہب بنے تو نسل انسانی کیسے باقی رہے؟

غرض کوئی مذہب یہ حکم دیتا تھا کہ دنیا سے کنارا کش ہو جاؤ تو ہی تم انسان کہلا سکتے اور نجات ابدی کے مستحق ہو سکتے ہو اور کوئی کہتا تھا کہ کھاؤ پیو مزے اُڑاؤ کہ زندگی کا مقصد یہی ہے۔

ظاہر ہے کہ رہبانیت گنتی کے چند مستثنیٰ طبائع کے سوا انسانوں کی کثیر اکثریت کے لیے ناقابل عمل بھی ہے اور نامناسب بھی ہے، اور دوسری طرف مادہ پرستی کے تحت اگر انسان کا طرزِ عمل اخلاقی اساس پر مبنی نہ رہے تو پھر انسان اور کسی وحشی درندے میں کیا فرق باقی رہ سکتا ہے؟

ضرورت ایسے تصورِ حیات کی تھی جو ہر طبیعت کے انسان کے لیے قابل عمل بھی ہو اور نسل انسانی کے مفید و موافق بھی ہوں۔ اس کے متعلق قرآن مجید نے وہ انقلابی حکم دیا جو حسب ذیل آیتوں میں بیان ہوا ہے:۔

> یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں نواز دے۔ ایسے شخص کو آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا اور بعض ایسے لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو بھلائی دنیا میں بھی دے اور آخرت میں بھی ہم کو آتشِ دوزخ کے عذاب سے بچا۔ ایسوں کو اپنے کیے ہوئے اعمال کے متعلق حصہ ملے گا اور خدا جلد حساب لینے والا ہے۔

یہ اسلامی اور خالص اسلامی مطمحِ نظر اور مقصدِ حیات ہے کہ دنیا میں بھی بھلے رہیں، اور آخرت میں بھی بھلے رہیں۔ زمین و آسمان کی ہر خدائی مخلوق سے ہم استفادہ کریں لیکن خود ہم خدا کے لیے رہیں۔ لذت اندوزی مقصد زندگی نہ ہو بلکہ مقصد زندگی کی تکمیل کے لیے کسی کا حق مارے اور ظلم کیے بغیر جتنی لذت کی ضرورت یا خواہش ہے اس سے روکا نہیں جاتا۔

یقین و عمل

آغازِ اسلام کے وقت مذہبی تعصب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ہر اپنے سوا باقی تمام مذاہب کو جھوٹے اور نجات کے لیے قطعاً موافق نہیں سمجھتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ستم ظریفی یہ تھی کہ

اپنے مذہب کے اندر کسی اجنبی کو آنے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مذہب کو نسل اور پیدائش سے محدود کر دینے کی خود غرضی وہٹ دھرمی یہودیوں میں بھی تھی اور ہندوستان میں بھی بلکہ انجیل متی کی روایت پر اعتماد کیا جائے تو خود عیسیٰؑ فرما چکے ہیں میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے آیا ہوں۔ مجھے باقی دنیا سے تعلق نہیں اور اپنے حواریوں یعنی فرستادوں اور مذہبی مبلغوں کو بھی حکم دیا تھا کہ وہ تبلیغ عیسائیت صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں میں کریں۔

اس سب پر مستزاد یہ تصور تھا کہ عمل کو کوئی اہمیت نہیں۔ ہمارے ہم مذہبوں میں داخل رہنا ہی اتنا بڑا عمل ہے کہ وہ نجات ابدی کے لیے کافی ہے۔

قرآن نے اگر عمل پر زور نہیں دیا ہے تو پھر کسی چیز پر بھی زور نہیں دیا ہے۔

امنو، (ایمان لانے) کے ساتھ، وعملو الصالحات (نیک کام کیے) جتنی مرتبہ قرآن میں ملا کر دُہرایا گیا ہے کوئی اور حکم نہیں دہرایا گیا ہے۔ نسلی اور پیدائشی مذہبوں، کے متعلق یہ لرزہ خیز حکم دیا گیا کہ جب لوگ خدا کے پاس حاضر ہوں گے۔ یعنی اس دن نہ ان کے نسب کا لحاظ ہوگا اور نہ وہ ایک دوسرے سے جواب طلبی کر سکیں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال کا انفرادی طور پر ذمہ دار ہوگا یہ نہیں کہ ہمارے گناہوں کا کوئی اور ناکردہ گناہ ہی بھینٹ چڑھ جائے چاہے وہ۔ نعوذ باللہ خدا کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اور ہم زندگی بھر عمداً بدمعاشیاں کرتے رہنے کے باوجود رستگاری و رہائی پا جائیں۔

دیگر مذاہب کی تصدیق و تصحیح

اسی طرح رسول عربیؐ نے یہ کبھی نہیں کہا کہ دنیا کے دیگر مذاہب جھوٹے اور اُن کے ماننے والے جہنمی ہیں۔ لامذہبی اور خود پرستی کو چھوڑ کر (جس میں اپنی ہی دستکاری اور اپنے ہی مصنوعات کو اپنا خدا مان لینا شامل ہے) آنحضرت نے فرمایا کہ دنیا کا ہر مذہب سچا اور خدا کی طرف لے جانے والا ہے۔ بشرطیکہ اس مذہب کی ابتدائی اصلیت میں غلط رسم و رواج سے حذف و اضافے نہ ہو گئے ہوں اور یہ کہ دنیا کا کوئی ملک اور کوئی امت ایسی نہیں جہاں خدا کے پیغمبر نہ آئے ہوں اور سچا مذہب نہ پھیلا چکے ہوں۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا کہ "اے محمد ہم نے اپنے بعض پیغمبروں کا تجھ سے تذکرہ کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا ہے۔" نیز کوئی اُمت ایسی

نہیں جہاں کوئی خدا سے ڈرانے والا نہ آیا ہو۔"

۷ھ میں یعنی اپنی وفات سے صرف تین سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قسطنطنیہ، مصر اور حبش کے عیسائی حکمرانوں کے نام جو تبلیغی خط لکھے اس میں یہ درج تھا کہ عیسائیت جھوٹی ہے، اسے ترک کردو بلکہ قرآن مجید کی یہ خاص طور پر دلچسپ آیت درج تھی کہ:۔

یعنی......اے الہامی کتاب کو ماننے والو! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور اس کا کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم خدا کو چھوڑ کر اپنے ہی میں سے کسی کو رب نہ بنالیں۔ اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو اس پر سر تسلیم خم کرچکے۔"[1]

ایک اور آیت قرآن مجید میں دو جگہ بہت خفیف لفظی فرق سے دہرائی گئی ہے۔

یعنی جو لوگ ایمان لائے (پیغمبر اسلام پر) اور جو لوگ یہودی ہیں نیز عیسائی اور صابی مذہب والے غرض جو بھی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو ایسوں کو ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ملے گا اور نہ ان پر کوئی خوف کی وجہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

صُلح کل رواداری اور انتہائی وسعتِ قلبی کی اس عجیب وغریب تعلیم میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہودی عیسائی اور صابی اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کو ترک کر دیں بلکہ اپنے اپنے الہامی مذہب ہی کی تجدید کرتے ہوئے چند بنیادی امور پر عمل کریں، یعنی خدا و رسولؐ کو ماننا[2] مرنے کے بعد حساب کتاب کا یقین کرنا اور زندگی بھر نیک کام کرنا۔ یہ اجر ملنے اور خوف سے بچنے کے لیے کافی ہے۔ حقیقت میں یہ ایک طرح سے ایک بنیادی

۱۔ یہ ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمّاکم المسلمین من قبل کے بمصداق خاص کر یہودیوں، عیسائیوں، اور مشرک عربوں سب کے لیے نقطۂ اجتماع تھا اور کسی کو اپنی کوئی عزیز چیز چھوڑنی نہ تھی۔ ملت ابراہیمی سب ہی کی مشترکہ میراث تھی۔ بظاہر یہ اسلام کے اندر لانے کا پہلا قدم تھا۔

۲۔ قرآن مجید ۱۵۰/۵ کے مطابق ایمان میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق کی اجازت نہیں ہے۔

مذہب مرتب کرنا تھا اور اس بنیادی مذہب کو "ان الدین عنداللہ الاسلام" (قرآن) (یعنی حقیقی دین خدا کے نزدیک اس کی تابعداری کا نام ہے) اور (قرآن) یعنی جو خدا کی تابعداری کے سوا کسی اور کی اتباع کرے تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا) کہا گیا۔ ان آیات اسلام نے مذاہب عالم کو دعوت دی اور آج بھی وہ دعوت باقی ہے کہ اپنے ہاں کے اصلی مذہب پر رجوع کرو۔ بعد کے زمانے کے حذف واضافہ سے باز آؤ اور توحید قیامت اور عمل صالح کے سہ گانہ مابہ الاشتراک امر پر انضمام نہیں تو وفاق کرلو۔ ہر مذہب کی اصلی تعلیم کو مانیں تو پھر اصول کی حد تک اختلاف ہے نہیں اور چونکہ بلا استفادہ ہر جگہ اور ہر مذہب وملت میں ایک آخری تسکین دہندے کی بشارت وہی پیشین گوئی موجود ہے اس لیے اپنے مذہب کی تعمیل میں اس کی اطاعت بھی آجاتی ہے۔ یوں بھی نجات کے اس طریقے سے استدلال کے لیے ہی عربی کو گواہی میں پیش کرنا ان ہی کے لیے ضروری ہوگا۔

اس طرح مذہبی تعصب کی مصیبت سے انسان کو نجات مل جاتی ہے، اور:۔ لا اکراہ فی الدین (قرآن)......یعنی دین میں جبر نہیں ایک ایسا سنہری اصول تھا جو اس سے پہلے کہنا چاہیے کہ سُنا ہی نہیں گیا تھا۔

دولت وافلاس

اسلام سے پہلے سے مذہب نے خیرات کی ترغیب تو بہت دی لیکن اس کے لیے کوئی جبر اور لزوم عائد نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ دولت مندوں میں عموماً جو کنجوسی اور بے رحمی ہوتی ہے اس کا کوئی موثر علاج وجود میں نہ آسکا۔ افراد کی آزادی کے باعث حصول دولت پر عموماً کوئی روک نہیں رہی اور مال دار مال دار تر ہوتے چلے گئے اور مفلس، مفلس تر۔ قبل اسلام غالباً ایک مرتبہ مزدک نے اس کے خلاف ردِ عمل کیا اور اشتراکیت کی تعلیم دی۔ لیکن یہ تعلیم معقولیت پر نہیں۔ بلکہ نفرت اور رشک وحسد پر مبنی تھی پھر اس میں اخلاقی اساس اتنی پارہ پارہ کردی گئی کہ مال و جائیداد کے حدود میں عورت کو بھی شامل کرکے ازدواج کے تقدس اور خاندان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ زیادہ دن چل نہیں سکتا تھا۔ اگر اشتراکیت کے معنی ہیں کہ خدا نے جو بھی تھوڑا بہت ہمیں دیا اس میں ہم اپنے سے غریب تر ومحتاج تر بھائیوں کو بھی شریک کرنے کی

جانب ہمیشہ مائل و عامل رہیں تو ہر مسلمان پہلا اشتراکی ہے لیکن اگر اشتراکیت معنی اپنے سے بہتر اور مال دار تر لوگوں کی دولت پر للچائی ہوئی نظریں ڈالیں اور خود نکھٹو،سست ،کام چور، فرض ناشناس ہونے کے باوجود دوسروں کے گاڑھے پسینے کو ہتھیا لیں تو یہ انتہائی کمینگی ہے، اور کوئی مسلمان قیامت تک اسے قبول نہیں کر سکتا۔ خیرات کی ترغیب اور بھیک کی ممانعت ہر دور پر جب تک بیک وقت یہ گتھی حل نہیں ہوتی۔

اسلام نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ دولت کی گردش و تقسیم سے کس طرح ہر کوئی فائدہ اٹھاتا ہے بغیر اس کے کہ کسی پر ظلم ہو اور ایسا نہ ہونے سے دولت چند ہی لوگوں تک محدود ہو کر باقی ملک غلامی سے بھی بدتر احتیاج میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس لیے اجتماع دولت کی جڑوں کو کاٹا گیا، ہر قسم کے سود کی ممانعت کی گئی۔ وصیت پر پابندی عائد کی گئی کہ کوئی شخص اپنی پوری دولت کسی ایک شخص کو نہ دے دے بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی وصیت کی جا سکتی ہے پھر وراثت میں مردوں اور عورتوں دونوں کو حصہ دار رکھا گیا تا کہ ایک سے زیادہ خاندانوں میں دولت رہے، اور دس بارہ ایسے قریبی رشتہ نامزد کیے جو لازمی طور پر ترکے میں حصہ پائیں سود کی ممانعت کے ساتھ اسے حکومت کے فرائض میں داخل کیا گیا کہ ضرورت مندوں کے لیے بے سود قرض دینے کے لیے اپنے موازنے میں گنجائش رکھے۔ گویا قرض کاری کو قومیا دیا گیا اور آخر یہ کہ دولت پر ایک جبری محصول زکات کے نام سے عائد کر دیا گیا۔ اس کی شرح ڈھائی فی صد سالانہ ہے لیکن ہمارے فقہا نے تسلیم کیا ہے کہ کم سے کم شرح ہے ورنہ غیر معمولی حالات میں حکومت مال داروں سے محض سدرمق چھوڑ کر باقی پوری رقم محصول میں وصول کر سکتی ہے تا کہ دفاع یا باقی اہل ملک کی پرورش کر سکے۔ غرض حکومت کا یہ اولین فریضہ ہے کہ ہر شخص کو پیٹ بھر کھانا ملے اور مایحتاج زندگی پورا ہو۔ اگر (۲-۲/۱/۵/۵) کی عادتی محصول سے فقراء و مساکین کا کام چل جاتا ہے اور وہ اپنے پاؤں آپ کھڑے ہو جا سکتے تو فبہا ورنہ حسب ضرورت اس شرح میں حکومت اضافہ کر سکتی ہے اور اس محصول زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ حکومت کے اولین فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔

سود کی ممانعت اور ہر فرد رعیت کے ضروریات زندگی کی تکمیل وہ اصول ہیں جو اسلام ہی سے اشتراکیت نے لیے۔ لیکن سود کی ممانعت کو وہ نباہ نہ سکی اور دوبارہ جاری کر دیا۔ اسلام

نے مساوات کو بھی لازمی نہیں قرار دیا۔ صرف مال داروں پر محصول جائیداد عائد کر دیا لیکن اشتراکیت نے چند روز اس پر زور دے کر اُسے جب ناقابل عمل پایا تو چپکے سے اُسے بھی نظر انداز کر دیا اور آج روس میں مختلف طبقات کی تنخواہوں میں جو فرق ہے وہ کسی غیر اشتراکی ملک کے وزیر اعظم اور چپراسی کی تنخواہوں سے کچھ متفاوت نہیں ہے۔ رُوس میں تا حال سود کی ممانعت نہیں اور اس سے قومی دولت میں ازدیاد کی کوششوں کا قلع قمع ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح اسلام نے وراثت کو واحد فرد مثل فرزند اکبر کی جگہ کثیر رشتہ داروں میں پھیلا کر زیادہ موثر و معقول حل تجویز کیا ہے اور یہ اتنا معقول معلوم ہوا ہے کہ مصر و شام کے عیسائی مسلمانوں سے شدید مذہبی تعصب رکھنے کے باوجود خالص اسلامی قانون وراثت پر آج بھی عمل کرتے ہیں بیمے (معاقل) کو عہد نبوی میں امداد باہمی پر مبنی کیا گیا اور بیمہ سرمایا داروں کو بطور پیشہ چلانے کی ممانعت کی گئی، اب ۱۴سو سال بعد برطانیہ کو اس کا ہوش آیا اور ۱۹۵۰ء کے انتخابی مواعید میں مزدور جماعت صنعتی بیمے کو باہمی بنانے (Mutualize) کا وعدہ فردا کرنے لگی ہے۔

متفرقات

انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام نے انفرادی آزادی اور ذمہ داری کو خاص طور سے تسلیم کرتے ہوئے بھی اجتماعیت کا راستہ ڈال دیا۔ انتہائی انفرادی ذمہ داری یعنی خالق و معبود کی عبادت کے لیے بھی اسلام نے حکم دیا کہ ہر روز پانچ وقت جماعت سے نماز پڑھو، ہر ہفتہ شہر و مضافات کے تمام لوگ اور ہر سال دوبارہ دُور دُور کے لوگ یکجا ہوں اور عمر بھر میں کم از کم ایک بار ہر مسلمان حج کے سالانہ اجتماع میں شرکت کرے اور یہ ساری اجتماعیت پسندی بھی ایک خاص مرکز پر دائرہ بنا کے اور ناف زمین خدا کے گھر کی طرف چار دانگ عالم سے منہ پھیر جائے۔ عبادات بدنی کی طرح عبادات یعنی صدقات و زکوٰۃ کا بھی حکومت کی طرف سے حصول و خرج ضروری قرار دیا گیا تمام دنیا کے لیے قانون بھی ایک رکھا گیا۔ رنگ، زبان، نسل، وطن وغیرہ کے فرق کو نظر انداز کر کے جملہ انسانوں میں اصولی مساوات تسلیم کی گئی۔ اس سے اولاد آدم کی مرکز گریزیوں کا اتنا کچھ انسداد ہو چکا ہے کہ آج بھی بے شمار رشتہ داریوں اور خود مسلمانوں کی جہالت و بے عملی کے باوجود

مسلمانانِ عالم میں جو ہمدردی واخوت ہے وہ دنیا کے کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتی۔

اسلام نے فطرت کی تبدیلی کی کوشش کی جگہ نظری رجحان کو معینہ راہ پر لگانا بہت ضروری قرار دیا ہے۔ وحدتِ ازدواج اُصولاً سطحی چیز ہے لیکن جب تک لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش انسان کے قابو میں نہ ہونے سے باہمی مد و جزر ہوتا رہے اور جب تک جنگ و جدال وغیرہ کے نتائج سے عورتوں کی تقریباً ہر جگہ دنیا میں کثرت رہے، اُس وقت تک تعدد زوجات کی اجازت سے بہتر کوئی حل نہیں۔ کثرت زوجات لازمی نہیں بلکہ ضرورۃً روا ہے۔ اس سے بہت سے معاشی اور سماجی مسائل حل ہوتے ہیں۔ چار کی حد بھی اس لیے ضروری ہے کہ چند مال دار محض لذت نفسانی کے لیے بے شمار عورتوں کی اجارہ داری حاصل کر کے نہ خود فائدہ اٹھائیں نہ دوسروں کی ضرورتیں پوری ہونے دیں۔ طلاق وخلع وتفریق کی اجازتیں، نکاح بیوگان و بے شوہران کی ضرورت، عورت کی مکمل آزادی اور جائدادی خودمختاری وغیرہ بیسیوں مسائل میں اسلام ہی نے رہنمائی اور پیش قدمی کی ہے، اور اگر آج کل اُس میں کوئی دشواری محسوس ہو رہی ہے تو وہ یہ سماجی رسم و رواج کے باعث اسلامی آزادیوں پر عمل نہ کرنے سے ہے یا اسلامی احکام کی تعبیر کرنے والوں کے جمود سے۔ کسی نے عورت میں رُوح تک کے وجود سے انکار کیا تو اسلام نے جنت تک کو ماں کے قدموں تلے ہونا قرار دیا۔

اسلام نے ذہنی غلامی کو بُرا ٹھہرایا ہے اور مناظرِ قدرت پر غور و خوض، تدبر و تفکر، تخفل و تعلم پر قرآن نے بار بار زور دیا ہے۔ ستاروں کی گردش، چاند سورج کی روشنی وگرمی، بادلوں کی آمد، ہواؤں کی روانی سمندر، پہاڑ، نباتات، حیوانات غرض، ع

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ذہنی غلامی کے معنے صرف یہی نہیں کہ ہم غیر خاص کر مردہ شخص کی رائے کا اپنے ذہن کو غلام بنا دیں اور خود اپنی ذمہ دارانہ رائے قائم کرنے اور ایمان لانے سے باز رہیں۔ بلکہ ذہنی غلامی کے معنے میرے نزدیک یہ بھی ہیں کہ اپنے ذہن ہی کے غلام ہو جائیں اور جو چیز ہمارے ذہن میں نہ آئے خواہ وہ ہمارے فن کی ہو یا نہ ہو اس کے متعلقہ علم سے ہمیں واقفیت ہو یا نہ ہو اس سے انکار کریں سمجھنے کی کوشش کرنا بیشک ہمارا فریضہ ہے اور اس میں ہر شخص کے

حسبِ حوصلہ وکوشش کامیابی بھی ہوتی ہے۔

خدا کا وعدہ ہے کہ ”جو ہمارے تک پہنچنے کی کوشش کرے تو ہم اسے ضرور راستے سجھاتے ہیں۔“

صداقتِ مطلق تو خدا کی ذات ہی ہے اور اسی تک سب کو جانا ہے کچھ چیزیں تو انسان اب سمجھ چکا ہے اور اب بُت پرستی وشرک جس پر بعثت نبوی کے وقت دنیا کا اجتماع تھا، اور جس کے خلاف اسلام ہی نے علم بغاوت بلند کیا تھا، اب سنجیدہ دنیا کے نزدیک ختم ہو چکی ہے اور دیگر مذاہب کے پیرو چاہے اسلام یا اسلامی احسان کو نہ مانیں لیکن توحید کی تعلیم کو صحیح تسلیم کر چکے ہیں۔ رُوح، موت کے بعد کی زندگی، حساب وکتاب آخرت چند ایک امور اور باقی رہ گئے ہیں۔ اسلام نے اپنی تعلیم کو معجزوں کی جگہ دل و دماغ کے تدبر پر چھوڑا ہے۔ جبر کے تحت لائے ایمان کی طرح وہ ایمان بھی بیکار ہے جو بے سوچے سمجھے لایا جائے۔

یہی وہ چیز ہے جو میں اب تک سمجھ سکا اور رب زدنی علما، یعنی اے میرے رب مجھے علم میں بڑھا، کی دعا کرتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

انسانیت کا منشورِ اعظم

خطبۂ حجۃ الوداع

جمعہ ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ کو جبل الرحمۃ پر سے میدان عرفات کے ڈیڑھ لاکھ حاضرین کو حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطاب فرمایا تھا اسے تاریخ نے خوش قسمتی سے محفوظ رکھا ہے۔ اس خطاب کو انسانیت کا منشورِ اعظم کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔

۱۔ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی حمد کرتے ہیں۔ اسی سے مدد چاہتے ہیں اسی سے معافی مانگتے ہیں۔ اسی کے پاس توبہ کرتے ہیں اور ہم اللہ ہی کے ہاں اپنے نفسوں کی برائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے تو پھر کوئی اُسے بھٹکا نہیں سکتا، اور جسے اللہ ضلالت عطا کرے تو پھر کوئی اس کو ہدایت پر نہیں لگا سکتا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ایک ہے اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کا بندہ اور رسول ہے۔

۲۔ اللہ کے بندو! میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی تاکید اور اس کی اطاعت پر پُرزور طور پر آمادہ کرتا ہوں، اور میں اسی سے ابتدا کرنا چاہتا ہوں، جو بھلائی ہے۔

۳۔ اما بعد، لوگو! مجھ سے سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ کیونکہ میں نہیں جانتا شاید اس سال کے بعد میں اس جگہ تم سے پھر نہ مل سکوں۔

۴۔ لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تمہارے لیے (ایک دوسرے

پر) اپنے رب سے ملنے (قیامت) تک حرام ہیں۔ ایسے ہی حرام و محترم جیسے تمہارے آج کے دن، آج کے مہینے اور شہر کی حرمت ہے۔ ہاں کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

۵۔ جس کے پاس کوئی امانت ہو تو وہ اس کو ادا کر دے جس نے وہ اُس کے پاس امانت رکھائی۔

۶۔ خبردار! جاہلیت کا سود اگر دیا جاتا ہے۔ البتہ تمہارے لیے راس المال پر حق ہوگا۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم کیا جائے۔ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ کوئی سود نہ رہنے پائے، اور پہلا سود جس سے میں (اس کی) ابتدا کرتا ہوں وہ میرے اپنے چچا العباس بن عبدالمطلب کا ہے۔

۷۔ خبردار! جاہلیت کے خون گرا دیے جاتے ہیں اور پہلا خون جس سے میں (اس کی) ابتدا کرتا ہوں۔ وہ (میرے چچا زاد بھائی کے بیٹے) عامر بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کا ہے۔

۸۔ خبردار! جاہلیت کے آثار و عہدے گرا دیے جاتے ہیں۔ بجز (خانہ کعبہ کی) رکھوالی اور (حُجاج کو) پانی پلانے کے۔

۹۔ قتل عمد پر قصاص ہے۔ مشابہ عمد وہ ہے جس میں لٹھ اور پتھر سے موت واقع ہو۔ اس میں سو اُونٹ (خون بہا ہیں) جو اس میں زیادتی (کا مطالبہ) کرے تو وہ جاہلیت والا ہے۔ ہاں، کیا میں، میں نے پہنچا دیا۔ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

۱۰۔ اما بعد۔ لوگو! شیطان اس سے تو مایوس ہو گیا ہے کہ اب تمہاری اس سرزمین میں اُس کی پوجا ہو۔ لیکن وہ اس پر راضی ہے کہ اس کے سوا دیگر ایسی باتوں میں اس کی اطاعت کی جائے جن کو تم اپنے اعمال میں حقیر سمجھتے ہو اس لیے اپنے دین کے متعلق اس (شیطان) سے محتاط رہو۔

۱۱۔ لوگو! سال کی کبیسہ گری کفر میں ایک زیادتی ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اس کے باعث بہکائے جا رہے ہیں۔ وہ اسے ایک سال حلال کر لیتے ہیں اور اسے ایک سال حرام کر لیتے ہیں تاکہ اس تعداد کا تکملہ کر لیں، جو خدا نے حرام کر رکھی ہے اس

طرح وہ خدا کی حرام کردہ چیز کو حلال کر لیتے ہیں۔ اور خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام، حقیقت میں اب زمانہ چکر لگا کر پھر اسی شکل پر آ گیا ہے۔ جیسا کہ خدا کے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے کے دن تھا۔ بیشک مہینوں کی تعداد اللہ کے پاس اللہ کی کتاب میں اس کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے ہی کے دن بارہ مہینے لکھی ہے۔ ان میں سے چار حرام ہیں۔ تین پے در پے اور ایک انتہا، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور (قبائل) مضر کا رجب جو کہ جمادی (آلاخرہ) اور شعبان کے بیچ ہے۔ کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

۱۲۔ امابعد۔ لوگو! تمہاری عورتوں کے لیے تمہارے اوپر ایک حق ہے، اور تمہارے لیے ان کے اوپر یہ کہ تمہارے بستر کو تمہارے سوا کسی اور سے نہ روندائیں اور تمہارے گھروں میں تمہاری اجازت کے بغیر کسی ایسے کو داخل نہ ہونے دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو، اور کوئی بڑے فحش کام کا ارتکاب نہ کریں، اگر وہ ایسا کریں تو اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ تم ان پر سختی کرو۔ ان کے ساتھ سونا بند کرو۔ یا ان کو غیر شدید ضرب پہنچاؤ۔ اگر وہ باز آ جائیں اور تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو تم پر ان کا اچھے دستور سے کھلانا اور پہنانا لازم ہے۔ عورتوں کے متعلق بھلائی کی تمہیں تاکید ہے کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی کی سی ہوتی ہیں، اور اپنے لیے کسی چیز کی مالک نہیں ہوتیں اور تم ان کو اللہ امانت کے طور پر لیتے اور اللہ کے بول پر ان سے تمتع اپنے لیے حلال کرتے ہو اسی لیے عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ ان سے بھلائی کی تمہیں تاکید ہے۔ ہاں کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

۱۳۔ لوگو! تمام مومن بھائی بھائی ہیں۔ کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کا مال حلال نہیں، بجز اس کے کہ وہ اس کی طبعی خوشی سے ہو۔

۱۴۔ لہٰذا میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ میں نے تم میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ جب تم اسے تھامے رہو، میرے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ...... ہاں کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔

۱۵۔ لوگو تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک، تم سب آدم سے ہو۔ اور آدم مٹی سے، تم سے اللہ کے نزدیک سب سے مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے متقی ہو۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔ ہاں کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے اللہ تو گواہ رہنا۔ لوگوں نے کہا ہاں آپؐ نے فرمایا تو پھر حاضر کو چاہیے کہ غائب تک پہنچا دے۔

۱۶۔ لوگو! اللہ نے ہر وارث کے لیے ورثے میں سے اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔ اب وارث کے لیے کسی مزید وصیت کی اجازت نہیں، اور (کسی اور کے حق میں بھی) ایک تہائی (مال) سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔ بچہ بستر (کے مالک) کا ہوگا اور زانی کو پتھر ملیں گے۔ جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنے کو منسوب کرے یا اپنے مولا (معاہداتی بھائی) کے سوا کسی اور کو مولیٰ بنائے تو اللہ اور فرشتوں اور انسانوں سب کی لعنت ہے اس سے (تلافی کے لیے) کوئی خرچ اور کوئی بدلہ قبول نہیں ہوگا۔ والسلام علیکم۔

اس کے عربی متن کے لیے دیکھیے جاحظ کی البیان والتبیین ابن ہشام تاریخ الیعقوبی تاریخ طبری سنن دار قطنی کتاب الحج۔ حجۃ الوداع مؤلفہ محب الطبری برموقعہ۔ ٹکڑے اور اقتباس تو ہر حدیث کی کتاب میں ملتے ہیں بخاری کے مطابق اس کی نقل خود رسول اللہؐ کے حکم سے لکھ کر حضرت ابو شاہ کو دی گئی تھی۔

دو شاہاں در اقلیمے

تمہید

خلافت کے اولین انتخاب کے موقع پر کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں اجتماع اُمت کے ذریعے سے وقت واحد میں "دو شاہاں در اقلیمے نمی گنجد" کا قاعدہ طے ہو گیا۔ لیکن اس مسئلے پر تاریخ اسلام نے اس کے خلاف بھی کچھ دلچسپ مواد جمع کیا ہے۔ اسے یہاں اس لیے یکجا کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء غور فرمائیں۔ میری حیثیت رگی کی نہیں مستفسر کی ہے۔

خلافت صدیقی میں وحدت حکمران پر اجتماع

رہنمایانِ انسانی کی سب سے جامع شخصیت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے الیوم اکملت لکم دینکم کی ربانی بشارت بھی اُمت تک پہنچا دی اور قیامت تک کے لیے اپنی تعلیم وتعمیل یا قول و فعل وتقریر (یعنی برقراری) کے ذریعے سے اسوۂ حسنہ بھی مہیا فرما دیا تو ظاہر ہے کہ اس ذات قدسی صفات (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے مزید ایثار کر کے اس دنیائے دون وزبون میں رہنے کی ضرورت نہ تھی۔

جب پیغمبر اسلام اس دنیا سے سدھارے تو وحدت و اجتماعیت کی اسلامی تعلیم نے اُمت کو مجبور کیا کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن دفن سے بھی پہلے اُمت کی بھیڑوں کے لیے چرواہا گری کا فیصلہ کریں۔ اور ایک لمحے کے لیے بھی بے مرکزی یا نزاع روا نہ رکھیں۔ اُمت کے سب سے مستند سیرت نگار نے اس سلسلے میں جو حالات لکھے ہیں ان میں یہ جملے بھی ہیں کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں جب انصار اور مہاجرین دونوں کے ارباب حل وعقد جمع ہو گئے اور

انصار کے خطیب نے امیری کے لیے اپنے گروہ کے حقوق جتائے تو مہاجرین کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

> عمرؓ راوی ہیں...... تم نے اپنی جن خوبیوں کا ذکر فرمایا اس کے لیے بیشک تم حامل ہو لیکن عرب اس امیری کو سوائے اس قریشی قبیلے کے کسی کے لیے نہیں مانیں گے۔ وہ نسب اور گھرانے کے لحاظ سے عرب میں سب سے بلند ہیں۔ اور میں تمہارے لیے ان دونوں میں سے کسی کے لیے بھی راضی ہوں تم ان دونوں میں سے جس کے لیے چاہو بیعت کر لو۔ اور آپ (یعنی حضرت ابوبکرؓ) نے میرا اور حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کا جو ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ہاتھ پکڑ لیا اور انہوں نے جو کچھ کہا اس میں سے سوائے اس آخری چیز کے مجھے کوئی بات بھی ناگوار نہیں ہوئی تھی اور خدا کی قسم اگر کسی گناہ کے بغیر میری گردن اڑا دی جاتی تو مجھے زیادہ پسند تھا بہ نسبت اس کے کہ مجھے ایسے لوگوں کا امیر بنایا جائے جن میں ابوبکرؓ بھی موجود ہوں۔
>
> اور کہا کہ پھر ایک انصاری نے کہا کہ اس بارے میں آپ میری تجویز مان لیں گے اور میرا احترام کریں گے۔ ہم میں سے ایک امیر ہو اور تم میں سے ایک۔ اے قریش والو!
>
> اور کہا کہ اس پر بہت شور ہوا اور آوازیں بلند ہو گئیں۔ یہاں تک کہ مجھے اختلاف پیدا ہو جانے کا ڈر ہو گیا اس لیے میں نے کہا کہ اے ابوبکرؓ اپنا ہاتھ بڑھایئے انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان سے بیعت کر لی پھر مہاجرین نے آپ سے بیعت کی۔ پھر انصار نے آپ سے بیعت کی۔ (ابن ہشام)

اس تفصیل میں اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ تعدد حکمرانان کے خلاف مستقلاً کوئی اتفاق رائے قائم ہو گیا ہو۔ بلکہ صرف یہ نظر آتا ہے کہ دو امیروں کی تجویز پر صرف شور وشغب مچا بلکہ اختلاف پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ جس کے معنی یہ لیے جا سکتے ہیں کہ کثرت وتعدد حکمرانان کے مسئلے پر بہت سے لوگ متفق آنے لگے تھے۔ (صرف حضرت صدیق اکبرؓ کی ممتاز شخصیت

نے انصار کو اپنی تجویز پر اصرار کرنے سے باز رکھا)۔

صحیح مسلم (کتاب ص ۳۳، حدیث ۶۱) میں جو روایت ہے کہ:

> جب دو خلیفوں سے بیعت ہو جائے تو ان میں سے بعد والے کو قتل کر ڈالو۔

وہ یہاں قطعاً غیر متعلق ہے۔ یہ خانہ جنگی کا ذکر ہے، جہاں دو بیعت یافتہ افراد میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہو کہ وہی تنہا خلیفہ رہے۔ بحث اس امر میں ہے کہ دو یا زائد افراد مشترکہ طور پر خلیفہ یا حکمران رہ سکتے ہیں۔ لزوم بھی نہیں صرف جواز اور مباح ہونے یا نہ ہونے سے بحث ہے۔

مشترک حکمرانی کی اجازت

قرآن مجید میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت ملنے پر اس کے فرائض کی گرانباری معلوم کر کے یہ دعا کی تھی کہ:۔

> اور بنا میرا ایک شریک کار میرے قریبی لوگوں میں سے۔ ہارون میرے بھائی کو اس سے میری کمر کو مضبوط کر اور اس کو میری امیری میں شریک بنا۔

امیری میں شرکت کی یہ دعاء خدا نے قبول فرمائی اور نبوت و امارت میں حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ برابر کے حصہ دار اور شریک و سہیم بن گئے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہاں بھی امیری و سرداری کے لیے وہی لفظ "امر" استعمال ہوا ہے جو اوپر حضرت ابو بکرؓ کی تقریر میں تھا۔ بے شبہ یہ انبیاء سلف کا ذکر ہے لیکن اس کی ممانعت یا منسوخی کا قرآن یا حدیث میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف قرآن مجید میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا (دیگر سولہ پیغمبروں کے ساتھ) نام لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امامت کو حکم دیا گیا ہے کہ:

> یہی وہ لوگ ہیں جنھیں خدا نے سیدھا راستہ دکھایا ہے اس لیے ان کی رہنمائی کی اقتداء و پیروی کر۔

حدیث میں

کتب حدیث و سیرت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا مکتوب ملتا ہے، جو

عمان (جنوب مشرقی عرب) کے دو مشترک حکمرانوں کے نام روانہ کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اپنے باپ کی وفات پر یکجا اور مشترک حکمراں تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول اللہ کی طرف سے الجلندی کے دونوں بیٹوں جیفر اور عبد کے نام اس پر سلام جو ہدایت کی اتباع کرے۔ اس کے بعد میں تم دونوں کو اسلام کے بلاوے کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لاؤ تم دونوں سلامت رہو گے کیونکہ میں تمام لوگوں کی طرف خدا کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ ہر زندہ شخص کو ڈراؤں اور کافروں کے خلاف دھمکی کا بول پورا ہو کر رہے گا۔ اور اگر تم دونوں نے اسلام کا اقرار کیا تو میں تم دونوں کو والی رکھوں گا اور اگر تم اسلام کا اقرار کرنے سے انکار کرو تو تم دونوں کی بادشاہت زائل ہو جائے گی اور میرے سوار تم دونوں کے صحن میں پہنچ جائیں گے اور میری نبوت تم دونوں کی بادشاہت پر غالب آ جائے گی۔

ابی ابن کعب نے لکھا۔ علامت مہر (محمد رسول اللہؐ)

اس کا ذکر ابن طولون، قسطانی، ابن القیم، القلقشندی، الحلبی وغیرہ نے کیا ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے میری الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ دستاویز ۷۶)

سیرت نگار لکھتے ہیں کہ ان دونوں نے سعادت اسلام پائی اور حسب وعدہ ان کو ان کی بادشاہت پر باقی رکھا گیا اور حضرت عمرو بن العاص کو خاص فرائض کے لیے ان کے دربار میں بطور ریزیڈنٹ متعین رکھا گیا۔

تاریخ اسلام

ابوالفدا نے اپنی تاریخ میں ۵۸۸ھ کے واقعات میں شام کے حالات میں دو افراد کا حال لکھا ہے کہ مشترکہ حکمران بنے تھے اور:

وہ مدت مدید تک مل کر بادشاہت کرتے رہے۔

دوسرا واقعہ جو اس کا تقریباً ہمعصر ہے، دکن کے سب سے قدیم فارسی مورخ

عصامی نے اپنی منظوم تالیف فتوح السلاطین میں سلطان محمود غزنوی کے جانشینوں کے متعلق یوں بیان کیا ہے:۔

جب مودود نے ان کا قتل کیا۔ اور اپنے باپ کی جگہ نو سال حکومت کی تو پھر وہ مر گیا۔ اور حکومت دوسروں کے سپرد کر گیا اس کے بعد علی و محمد تخت پر بخت کے زور سے مشترکہ طور پر بیٹھے۔ علی مسعود کا بیٹا تھا۔ اور محمد مودود کا۔ علی و محمد اس تخت پر جب دو ماہ تک مشترکہ حکومت کر چکے تو میں نے سُنا کہ ایک دن فوجی افسروں نے ان کو بادشاہت سے معزول کر دیا۔

شائع کردہ ڈاکٹر مہدی حسین ۱۹۳۸ء

مطبوعہ آگرہ بیت نمبر ۱۲۲۰ تا ۲۵

نتیجہ

ان حالات میں یہ قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مشترکہ حکمرانی اسلام میں ممنوع ہے۔ ایک مماثل ہمعصر لیکن غیر مسلم نظیر پر اسے ختم کرتا ہوں۔

جمہوریہ سان ماری نو کا حالیہ دستور

سان مارینو دنیا کی سب سے دلچسپ جمہوریت ہے یہ چوتھی صدی عیسوی سے قائم ہے اس کا ایک چھوٹا سا رقبہ چاروں طرف ایک ہی مملکت یعنی اٹلی کے علاقے سے گھرا ہوا ہے اور اس کے باوجود خود اٹلی اس کی خود مختاری و آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ انگلستان، امریکہ وغیرہ سے اس کے سفارتی تعلقات موجود ہیں۔

سان مارینو کی جمہوریت کی صدارت مشترکہ طور پر دو افراد کے سپرد ہے۔ ان کا ہر ششماہی پر انتخاب ہوتا ہے اور ایک میقات میں اس کام کو انجام دینے کے بعد وہ مکرر تین سال تک اس انتخاب میں کھڑے ہونے کے مجاز نہیں ہوتے۔ نہ مفردانہ مشترکاً۔

تتمہ

یہاں تک لکھا گیا تھا کہ استاد محترم مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ

عثمانیہ سے اس نظریے پر گفتگو آئی، موصوف نے میری توجہ شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی طرف منعطف کرائی، جس میں وہ بھی اس کی طرف مائل نظر آتے ہیں کہ اگر مطلوبہ صفتیں اور اہلیتیں سب کی سب ایک ہی شخص میں کسی وقت نہ پائی جائیں تو ایک سے زائد افراد میں تقسیم کار کیا جا سکتا ہے تا کہ وہ بہم ایک دوسرے کے نقائص کی تلافی کر کے ضرورت ملک کی تکمیل کریں۔ گو شاہ ولی اللہؒ یہ بھی صاف کہتے ہیں کہ وحدت ہی قابل ترجیح ہی۔

چنانچہ کتاب مذکور کی ایک پوری فصل (مبحث الارتفاق الثالث وتفصیل اقسامہ) خاص اسی موضوع پر ہے کہ مملکت کسے کہتے ہیں اور یہ کہ وہ محض فصیلی اور قلعے اور بازار وغیرہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہاں کے بسنے والوں میں ایک ربط ہونا اور وہ سب مل کر اعضائے یکدیگر بننا ضروری ہے، اور یہ کہ ایسے معاشری نظام میں ایک غیر جانبدار اپنی مرضی منوا کر جھگڑے چکانے والے کی ضرورت ہے اور یہ کہ جب یہ بات صرف ایک شخص کے بس کی نہ ہو تو چند آدمیوں کی جماعت کے سپرد بھی کام کیا جا سکتا ہے۔

(ملاحظہ ہو البدور البازغہ صفحہ ۷۰ تا ۷۳)

خاتمہ

غرض مکرر یہ چیز دہرانی اور واضح کرنی ہے کہ دو شاہان در اقلیمے، کا اسلام نے نہ تو لزوم کیا ہے اور نہ ہی کوئی وہ عام رواج رہا ہے بلکہ یہ اور صرف یہ کہ اس کی بھی اجازت دی ہے اور یہ اجازت قرآن سے، حدیث سے، عہد نبویؐ کے عملی واقعات و نظائر سے، اور زمانہ مابعد کی تاریخ اسلام کے نظائر سے ثابت ہوتی ہے اور حسب ضرورت ایسا کیا جا سکتا ہے۔

جو کچھ ہے وہ دنیائے فانی کے لیے ہے ورنہ آخرت میں تو:۔

آج بادشاہت کس کے لیے ہے؟ صرف خدائے واحد وقہار کے لیے!